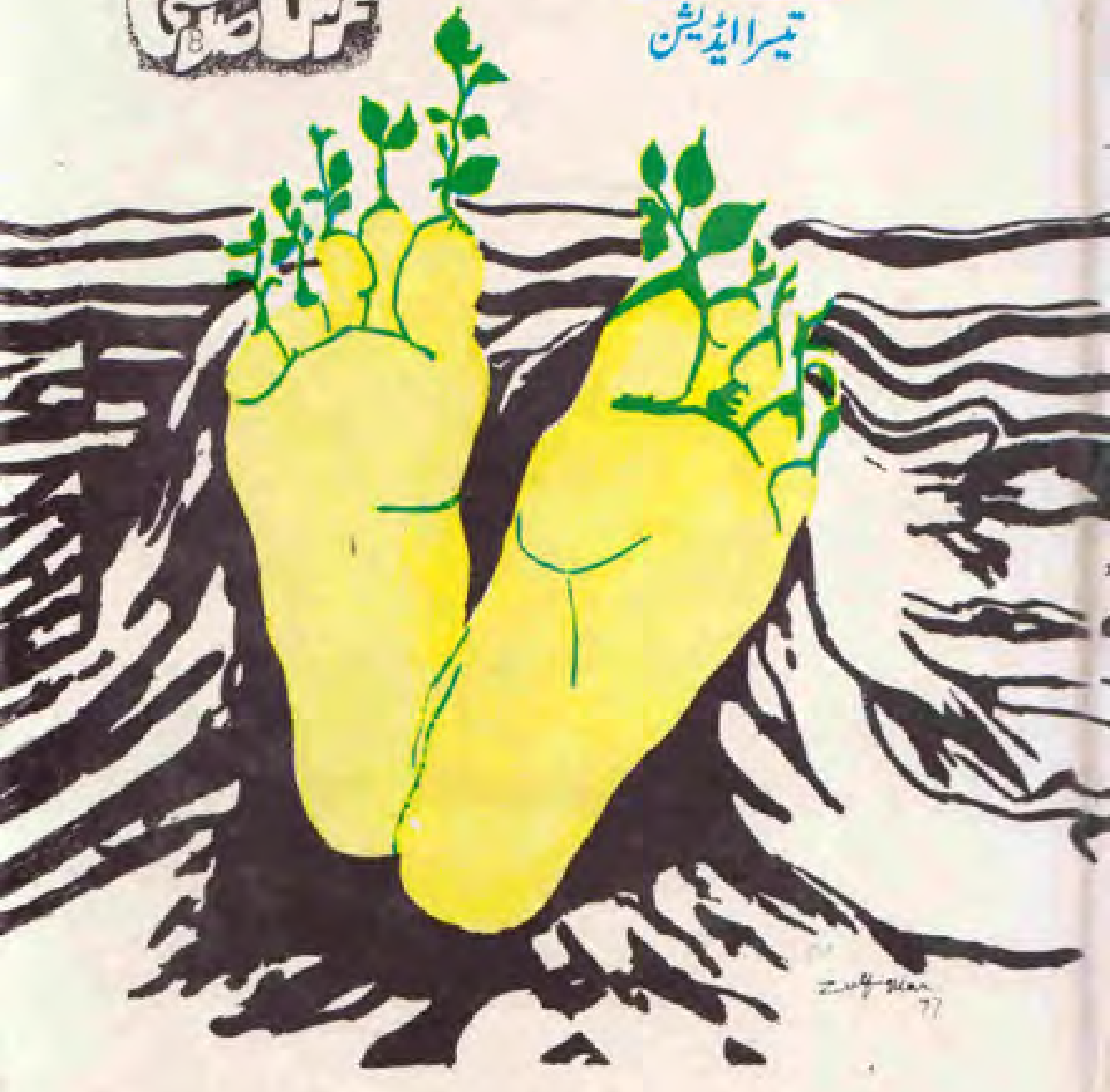
باہر کفن سے پاؤں

عرش صدیقی

آدم جی انعام یافتہ

تیسرا ایڈیشن



ضابطہ

حقوق — بحق مصنف محفوظ

سرورق و تصاویر — ذوالفقار بھٹی

کتابت — طالب حسین و خالد محمود وارثی

اشاعتِ اوّل — ۱۹۷۸ء

اشاعتِ دوئم — ۱۹۸۲ء

اشاعتِ سوئم — ۱۹۹۳ء

مطبع — شرکت پرنٹنگ پریس لاہور.

قیمت — ۱۵۰ روپے (ایک سو پچاس روپے)

انتساب

ماضی، حال اور مستقبل

یعنی

سعادت حسن منٹو

حسن عسکری

،

ڈاکٹر خیرات محمد ابن رسا

ڈاکٹر ایم الطاف علی قریشی

اور

فیاض تحسین

انوار احمد

فیض عابد عمیق

مبارک مجوکہ

اصغر ندیم سید

عبدالرشید — کے — نام

ذاتی معلومات

(ارشاد الرحمن) عرش صدیقی ۲۱ جنوری ۱۹۲۷ء کو گورداسپور، مشرقی پنجاب میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گورداسپور، دھرم سالہ اور جوگندر نگر (کانگڑہ) اور لدھیانہ میں حاصل کی۔ ایم۔ اے انگریزی گورنمنٹ کالج لاہور سے ۱۹۵۵ء میں کیا۔ دسمبر ۱۹۵۵ء سے اکتوبر ۱۹۷۵ء تک لیکچرار، پھر اسسٹنٹ پروفیسر اور پروفیسر رہے۔ اکتوبر ۱۹۷۵ء تا جون ۱۹۷۸ء بہاء الدین زکریا یونیورسٹی میں شعبہ انگریزی کے پہلے چیئرمین اور بعد ازاں جنوری ۱۹۹۰ء تک رجسٹرار رہے۔ ۱۹۹۱ء میں ورلڈ یونیورسٹی اری زونا امریکہ سے ادب میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔

تصنیفات

* دیدۂ یعقوب۔ اردو نظم و غزل
* باہر کفن سے پاؤں۔ اردو افسانے (آدم جی ایوارڈ یافتہ)
* عرش صدیقی کے سات مستر د افسانے مرتبہ۔ ڈاکٹر طاہر تونسوی
* محبت لفظ تھا میرا۔ اردو نظمیں
* ہر موجِ ہوا تیز۔ اُردو غزلیں
* کملی میں بارات۔ دوہے عادل فقیر اردو نعتیہ و اخلاقی دوہے
* کالی رات دے گھنگرو۔ پنجابی نظمیں اور گیت
* پاکستان میں اردو دوہے کا ارتقاء
* تکوین۔ تنقیدی و تحقیقی مقالات کا مجموعہ
* شعور، سائنسی شعور اور ہم
* دریا اور سمندر۔ تنقیدی مقالات (زیر طبع)

تالیفات

* میرزا ادیب کے بہترین افسانے
* سب رنگ۔ ملتان ڈویژن کے ادباء و شعراء کی منتخب تحریریں
* امیر علی کی سر گزشت
* شاخِ نہالِ غم۔ کلامِ انوار انجم

ترتیب

پس گفتار

چند افسانوں کے اس مجموعے کو اشاعت سے روکنے کے لئے جو کچھ میں کر سکتا تھا میں نے کیا۔ اس کے باوجود اگر یہ مجموعہ چھپ رہا ہے تو اس کی سزا یا جزا کے حقدار کاروانِ ادب ملتان کے محمد عمر خان ہیں، میں نہیں ہوں۔

کوئی تین برس اُدھر کی بات ہے۔ محمد عمر خان کی میرے لئے محبت نے کچھ ایسا جوش مارا اور بعض دوستوں نے بھی ان کی کچھ اس انداز سے تائید کی کہ انہوں نے میرے افسانوں کے مجموعے کی اشاعت کا مصمم ارادہ کر لیا۔ میں نے انہیں کہا کر چھاپنا ہے تو اس کتاب کو فوٹو آفسٹ پر چھاپیے۔ میں اس تجویز کی نامعقولیت سے پوری طرح واقف تھا۔ میں نے تو انہیں خرچ سے خوفزدہ کر کے اس ارادے سے باز رکھنے کی کوشش کی تھی لیکن انہوں نے بات گرہ میں باندھ لی اور کہا کہ ایسا ہی ہوگا، آپ افسانے میرے حوالے کر دیجیے۔ وہ افسانے مانگتے رہے میں ٹالتا رہا اور یوں کوئی آٹھ دس ماہ گذر گئے۔ آخر ان کے عزم اور اصرار کی وجہ سے میں نے افسانے انہیں دے دیئے لیکن میں پھر کتابت شدہ مسودہ دبا کر بیٹھ گیا اور ایک سال سے زیادہ عرصہ میں نے کتابت

شدہ مسودے کو پڑھا تک نہیں۔ اس عرصہ میں ان کے اَدبی پبلشر ہونے کی خبر ہر طرف پھیل چکی تھی اور لوگ اُن کی کشادہ دلی اور عالی ظرفی سے مستفیض ہونے لگے تھے۔ چنانچہ انہوں نے اس عرصہ میں کئی کتابیں چھاپ ڈالیں۔ میں نے انہیں ایک روز کہا کہ اب تو اپنی تمام جمع پونجی خرچ کر چکے ہوں گے، اس لئے میری کتاب کی اشاعت کا خیال ترک کر دیجئے۔ میں نے تجویز پیش کی کہ جو نقصان اس وقت تک انہیں ہو چکا تھا اسے آدھا آدھا بانٹ لیا جائے۔ انہوں نے کہا کہ آپ کی کتاب کے لئے اخراجات کی رقم محفوظ ہے۔ اس کے بعد میں نے مکمل طور پر ہتھیار ڈال دیئے۔

میں نے اپنے روپے کا مکمل تجزیہ کر رکھا ہے لیکن اس موقع پر میں اس کی تفصیلات میں نہیں جاؤں گا۔ میں صرف ایک بات کہنا ضروری سمجھتا ہوں اور وہ یہ کہ میں ہرگز نہیں چاہتا تھا کہ محض اپنی ایک غرض، ایک خواہش کو پورا کرنے کے لئے اپنے ایک بے حد مخلص دوست کے ہزاروں روپے کا نقصان کروں۔ مقتدرِ اُردو افسانے کی فروخت بہت محدود ہے۔ مجھے اپنے بارے میں کوئی خوش فہمی نہ جب تھی نہ اب ہے۔ میں جانتا تھا کہ کتاب کا بیچنا ناممکن ہوگا۔ عمر خان نفع نقصان سے بے نیاز ہو کر یہ کام کر رہے تھے۔ میں ان کے جذبۂ دوستی، ان کی انسانی عظمت اور ان کے کردار کے حسن کا معترف ہوں۔ انہوں نے میرے لئے جو کچھ کیا میں اس کے لیے ان کا شکریہ ادا کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا۔ اب اگر کتاب ان کے اصرار کی وجہ سے منظرِ عام پر آ گئی ہے تو اللہ تعالیٰ سے یہ دعا ضرور کرتا ہوں کہ وہ انہیں ان کی نیکیوں کا اجر عطا کرے اور انہیں خوش رکھے۔ اس اُمید پر کہ یہ دعا قبول ہوگی، ایک چھوٹی سی یہ دعا بھی اس دعا کے ساتھ منسلک کر رہا ہوں کہ خدا مجھے خونخوار نقادوں سے محفوظ رکھے۔

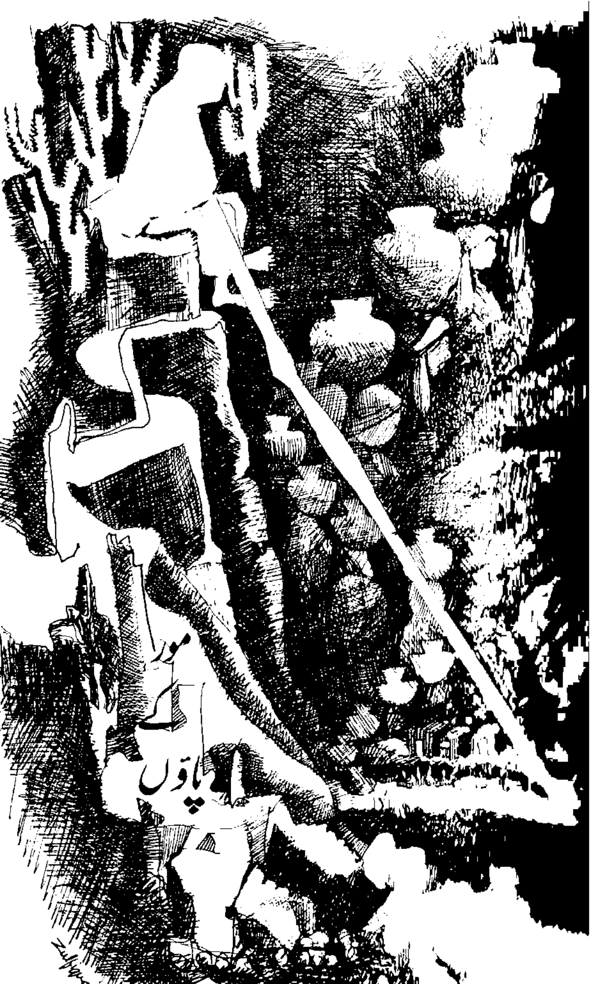
اس کتاب میں شامل ہر افسانے کے مرکزی خیال یا مرکزی کردار کو تصویر میں منتقل کرنے کا فریضہ میرے نوجوان دوست پاکستان آرٹس کونسل کے ہونہار اور ذہین مصور

ذوالفقار نے اپنے ذمہ لیا اور وہ اس سے عمدگی کے ساتھ عہدہ برآ ہوئے انہوں نے جو کچھ کیا اس کا محرک صرف اور صرف محبت کا جذبہ تھا۔ ان کا شکریہ ادا کرنا بھی میرے بس کی بات نہیں۔

کتاب کے اشاعت کے مرحلے میں داخل ہونے سے پہلے بھی میں اپنے کئی دوستوں کی عنایاتِ خاص سے فیض یاب ہوتا رہا ہوں۔ میرے ہم عمر اور ہم عصر دوستوں میں عارف عبدالمتین اور صلاح الدین ندیم میرے لئے حوصلے اور اُمید کا مستقل سرچشمہ ہیں، ڈاکٹر وزیر آغا اور انور سدید کے مشوروں سے بھی میں نے اکثر راہنمائی حاصل کی ہے ڈاکٹر وحید قریشی اور پروفیسر سلیم اختر کی قیمتی آراء نے بھی مجھے روشنی دی ہے۔ ابنِ حنیف، اقبال گیلانی اور پروفیسر اے، بی، اشرف کی نیک خواہشیں ہمیشہ میرا حوصلہ بڑھاتی رہی ہیں۔ پروفیسر اے، بی، اشرف کا میں اس لئے بھی ممنون ہوں کہ انہوں نے میرے افسانوں پر ایک تفصیلی مضمون تحریر فرمایا جو اس کتاب میں شامل ہے۔

میرے نوجوان دوست فیض عابد عمیق، اصغر ندیم سید، انوار احمد، فیاض تحسین، مبارک مجوکہ اور عبدالرشید بھی میرے شکریہ کے مستحق ہیں۔ ان دوستوں کی محبت سے میری عمر رسیدہ شخصیت توانائی حاصل کرتی رہی ہے۔ یہ ذہین، مخلص اور صحت مند نظریات کے شیدائی مجھے لکھنے کی تحریک دیتے رہے ہیں اور اس کتاب کی اشاعت میں ان کے اصرارِ پیہم کا بھی بہت حصہ ہے۔ فیض عابد عمیق کی ظالمانہ حد تک کڑوی لیکن سچی تنقید صحیح راہ تلاش کرنے میں ہمیشہ میری معاون ثابت ہوئی ہے۔

اردو اکادمی ملتان کے جلسوں میں شرکت کرنے والے سبھی احباب کا عمومی طور پر اور قدرت نقوی، جابر علی سید، ارشد ملتانی، شمیم ترمذی، ریاض زیدی اور صلاح الدین حیدر کا خصوصی طور پر ممنون ہوں کہ انہوں نے میری تحریروں کے حسن و قبح پر تفصیلی بحثیں کر کے مجھے فاش غلطیوں کے ارتکاب سے روکنے کی کوشش کی۔



نسیم درانی مدیر سیپ، اختر انصاری اکبرآبادی مدیر نئی قدریں اور وزیری پانی پتی کا محبت بھرا سلوک بھی میرے افسانوں کی تخلیق کے محرکات میں شامل ہے۔ محمد طفیل مدیر نقوش کا بھی میں احسان مند ہوں جنہوں نے نہ صرف میرے دو افسانے کتے اور فرشتہ اپنے مؤقر جریدے میں شائع کیئے بلکہ مجھے ایسے قیمتی مشوروں سے بھی نوازا جن سے میں نے بہت حوصلہ پایا۔

لطیف عارف کی تنقید اور تعریف، ان کے غصہ اور محبت کی ہمیشہ ایک منفرد شان رہی ہے اور مجھے ان کے تمام رویوں نے بہتری کی راہیں سجھائی ہیں۔ مسعود اشعر ایک طویل عرصہ میرے لئے حوصلہ کا سرچشمہ بنے رہے ہیں۔ ان کی قربت میسر نہ ہوتی تو جو کام میں نے اپنے قیام ملتان کے شروع کے کئی برسوں میں کیا یا تو نہ ہوتا یا پھر تاخیر سے ہوتا۔ اس قربت کی خوشبو کا تعاقب اب بھی میرے لئے باعثِ مسّرت ہے۔ احمد خان درانی کی صاف گوئی اور سچی دوستی سے بھی میں مسلسل راہ نمائی حاصل کرتا رہا ہوں۔

جب میں نے محمد عمر خاں کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے تھے تو میں نے سوچا تھا کہ میں مقدمے کے طور پر اردو افسانے اور اپنے افسانوں کے بارے میں ایک تفصیلی مضمون لکھوں گا۔ میں ایسا نہ کر سکا۔ اور اب جناب اے۔ بی۔ اشرف کے مضمون کی شمولیت نے میرے مضمون کی ضرورت کو بالکل ختم کر دیا ہے۔ میں یہ چند سطور صرف اپنے دوستوں کا شکریہ ادا کرنے کے لئے لکھ رہا ہوں۔

وہ ٹھیک کہتا تھا لیکن اُسے یہ کب معلوم تھا کہ یہ گھر میں نے نہیں بنایا اور اس جگہ کا انتخاب بھی میں نے نہیں کیا بہت سی اور چیزوں کی طرح یہ گھر بھی مجھے ورثے میں ملا تھا۔ آج یہ میرا کہلاتا ہے کیونکہ بابا مر چکے ہیں۔ ابھی چند سال پہلے جب بابا زندہ تھے تو لوگ اسے بابا فخر الزمان کا گھر کہتے تھے۔ گھر بنانے کے لئے جگہ کا انتخاب کس نے اور کب کیا تھا یہ تو یقیناً بابا کو بھی معلوم نہیں تھا۔ اگر انہیں معلوم ہوتا تو وہ مجھے اپنے اکلوتے بیٹے کو یہ اہم راز ضرور بتا جاتے۔ کیونکہ اس گھر کے بارے میں جو کچھ انہیں معلوم تھا وہ سب انہوں نے مجھے بتا دیا تھا چند موٹی موٹی باتیں تو ہر وقت یاد رہتی ہیں ایک کمرے کا اضافہ دادا جان نے کیا تھا اس کمرے کا فرش ہمیشہ سے کچا چلا آیا ہے کیونکہ دادا جان کو یوں پسند تھا اور بابا جان نے دادا جان کی موت کے بعد بھی ان کی پسند کا خیال رکھا تھا اور جب وہ زندہ تھے تو مجھے اکثر کہا کرتے تھے "دیکھو بیٹا۔ ہمارے بعد بھی اپنے دادا کی پسند کا خیال رکھنا" اور یہ فرش آج بھی کچا ہے ایک اور کمرے کا اضافہ آج سے پینتیس برس پہلے میری پیدائش پر خود بابا نے کیا تھا۔ مجھے یہ سب کچھ معلوم ہے لیکن گھر بنانے کیلئے اس جگہ کے انتخاب کا ذمہ دار کون تھا۔ یہ نہ بابا کو معلوم تھا نہ مجھے معلوم ہو سکا۔

اس نے کہا تھا بارش کی شکایت کیوں کرتے ہو۔ یہ کیوں نہیں سوچتے کہ تم نے ہی گڑھے میں گھر بنایا ہے۔ پانی، ارد گرد کی اونچائی کا پانی، مٹی اور کوڑا کرکٹ لے کر اس گڑھے ہی میں تو گرے گا.......

اس نے کہا تھا تم پڑھے لکھے آدمی ہو نشیب اور پستی کے نقصانات کا تمہیں اندازہ ہونا چاہیئے تھا۔ اس نے یہ بھی کہا تھا کہ حقیقت کو اس کے اصل رنگ میں دیکھنا چاہیئے۔

وہ بہت سمجھدار تھا ——— اس کے جانے کے بعد میں یہ سوچ کر دل ہی دل میں شرمندہ ہوتا رہا کہ اتنی چھوٹی سی بات بھی میرے ذہن میں نہ آسکی تھی کہ بارش کے گدلے پانی سے گھر کو بچانا مقصود ہو تو گھر بلندی پر بنانا چاہیئے۔

مجھے یاد ہے ——— اچھی طرح یاد ہے ——— ابھی کل کی تو بات ہے ——— بابا زندہ تھے۔ تب بھی برسات کا پانی گھر میں داخل ہو جاتا تھا۔ ہر سال ہو جاتا تھا۔ لیکن صرف اس وجہ سے میں نے کسی کو پریشان ہوتے نہیں دیکھا تھا۔ پانی داخل ہوتا تھا اور نکال دیا جاتا تھا۔ ان دنوں یہ کوئی تکلیف وہ مسئلہ نہیں تھا۔ لیکن اب یہ بہت بڑا مسئلہ بن گیا ہے۔ پہلے یہ مسئلہ کیوں نہیں تھا؟ لگتا ہے کوئی خاص قوت تھی جو بابا کو حاصل تھی اور بابا سے پہلے بزرگوں کو بھی حاصل تھی لیکن میں اس سے محروم ہوں یا شاید کوئی اور بات ہے! کچھ پتہ نہیں چلتا ——— !

وہ میرا دوست تھا۔ وہ ایک حقیقت پسند آدمی تھا۔ وہ بہت سمجھدار تھا۔ اس نے کہا تھا یہ گھر رہنے کے قابل نہیں ہے کیونکہ خطرناک گہرائی میں بنایا گیا ہے یہاں سے جتنی جلدی نکل آؤ بہتر ہے۔ میں نے پوچھا تھا کہاں جاؤں تو اس نے بازو پھیلا کر کہا تھا دُنیا بہت وسیع ہے ——— میں اُسے کچھ اہم باتیں بتانا چاہتا تھا لیکن نہیں بتا سکا تھا۔ میں بتانا چاہتا تھا کہ یہ گھر میں نے نہیں بنایا ——— میں اُسے یہ بھی بتانا چاہتا تھا کہ کئی نسلیں مجھ سے پہلے اسی گھر میں بڑے آرام سے رہ چکی ہیں۔ برسات پہلے بھی اسی طرح آتی تھی میں اسی گھر میں پیدا ہُوا تھا۔ مجھ سے پہلے نہ کوئی برسات سے پریشان ہُوا نہ کبھی کسی نے اس گھر یا اس جگہ کو چھوڑنے کے بارے میں سوچا۔ مجھے یہ بھی یاد ہے کہ برسات کا پانی سارے گھر میں اندر اور باہر بھرا ہوتا تھا اور سب لوگ گڑ کے پوڑے کھاتے اور آم چوستے اور خوش ہوتے تھے۔ میں اسے یہ بھی بتانا چاہتا تھا ——— اور یہ بھی کہ اس مکان اور اس جگہ سے محبت کرنا بھی مجھے ورثے میں ملا ہے۔ میں جب اعلیٰ تعلیم کیلئے کچھ عرصہ اس جگہ سے دُور رہا تو مجھے معلوم ہُوا کہ میرا تعلق اس گھر کے ساتھ کتنا مضبوط ہے۔ واپس آیا تو

مجھے یہ گھر چُپ چُپ سا ضرور لگا لیکن اس کی کشش پہلے سے زیادہ ہو گئی تھی اور اُس وقت مجھے یہ بھی معلوم ہُوا کہ یہ گھر میری ملکیت نہیں ہے۔ میں اس کی ملکیت ہوں!

وہ بہت دیر مجھ سے باتیں کرتا رہا۔ مجھے سمجھاتا رہا لیکن میں اُسے کچھ نہ بتا سکا۔ وہ عجیب وقت تھا مجھے اس کی باتیں درست معلوم ہو رہی تھیں۔ جو توقعات میں نے اس سے باندھی تھیں مجھے ان کے ٹوٹنے کا افسوس بھی تھا۔ مجھے امید تھی وہ کمروں سے پانی نکالنے میں میری مدد کرے گا۔ اس نے خود سے دستِ تعاون نہیں بڑھایا۔ میرا جی چاہا میں خود اسے کہوں کہ میری مدد کرے کیونکہ وہ میرا دوست تھا۔ لیکن میں ایسا کرنے کا حوصلہ نہ کر سکا۔ آخر وہ چلا گیا۔ پھر مجھے یہ امید بھی تھی کہ وہ چند قدم آگے جا کر رُک جائے گا۔ اور مڑ کر دیکھے گا۔ شاید وہ واپس آجائے۔ اگر وہ واپس آنے کا ارادہ نہ بھی رکھتا ہو تو میں اسے اشارے سے واپس بلاوں گا۔ میں بلاؤں گا تو وہ واپس آنے پر مجبور ہو گا۔ پھر ہم دونوں مل کر کمروں سے پانی نکال دیں گے۔ لیکن اس نے مڑ کر نہیں دیکھا۔ وہ ایک پل کو بھی نہیں رکا۔ وہ چلتا ہی گیا اور میری نظروں سے اوجھل ہو گیا اگر وہ چند لمحوں کے لئے رک کر اور مڑ کر میری طرف دیکھ لیتا تو اس کا کیا بگڑ جاتا اور وہ یہ تو ضرور جانتا ہو گا کہ وہ رُک کر اگر ایک گھنٹہ بھی مجھے کھڑا دیکھتا رہتا تو بھی میں اسے اشارہ کرنے یا آواز دینے کی جرأت نہ کر سکتا۔ پھر اسے کیا ڈر تھا۔ وہ کیوں نہیں رکا۔ اس نے کیوں مڑ کر نہیں دیکھا۔ اس نے کیوں یہ نہیں سوچا کہ میں تنہا اتنا بہت سا پانی کیسے نکال سکوں گا!

میں نے اسے بتایا تھا کہ میں صبح بڑی مشکل سے اپنے گھر سے باہر آسکا تھا اور واپسی کا حوصلہ نہیں رکھتا تھا۔ اُس نے کہا تھا کہ تم ایک تخیل پرست اور رومانی آدمی بن گئے ہو اور حقیقت سے آنکھیں نہیں ملا سکتے۔ حقیقت ہے کہ یہ جگہ ہرگز اس قابل نہیں کہ تم یہاں رہو۔ وادی گہری ہے اور گھر پستی میں بنا ہے ——— وہ کہتا تھا کہ ساری دنیا ہمارا گھر ہے اور دنیا بہت وسیع ہے ——— لیکن میں اسے یہ بھی نہیں بتا سکا کہ اس وسیع دنیا میں یہ وادی، ہماری یہ وادی جس کی مٹی سے میں بنا ہوں اور جس کے دیئے ہُوئے رزق سے میں زندہ ہوں اور جو ہمارے بزرگوں کی لاتعداد نسلوں کی پناہ گاہ رہی ہے۔ یہ وادی تو ساری وسیع دنیا میں صرف ایک ہے۔

وہ چلا گیا۔ میں اپنی جگہ بیٹھا رہا۔ تھکا ہارا۔ جیسے صبح سے پانی کی بالٹیاں بھر بھر کر اٹھاتا رہا ہوں۔ میں تو صبح سے اس بڑے پتھر پر بیٹھا تھا جو میرے گھر سے کچھ بلندی پر پہاڑی کی ڈھلان پر ہر بھاری چیز کی طرح سالہا سال سے مضبوطی کے ساتھ اپنی جگہ پر قائم تھا۔ صبح سے میں پانی میں گھرے ہوئے اپنے گھر کو دیکھ رہا تھا لیکن محسوس یوں کر رہا تھا جیسے سخت محنت کی وجہ سے سارا جسم ٹوٹ رہا ہو ـــــ میں اپنے گھر کو دیکھتا رہا ـــــ یہاں تک کہ میری آنکھیں دھندلا گئیں۔ شائد میں رو رہا تھا یا شائد کوئی اور بات تھی۔ اب تو یقین سے کچھ بھی یاد نہیں آتا کہ کیا ہوا تھا بس یوں لگا تھا جیسے ہوا اور پانی مل گئے ہیں اور مکان ان میں تحلیل ہو گیا ہے۔

میں نے پتھروں سے کہا۔ اب میں واپس کہاں جاؤں گا۔ واپسی کا راستہ معدوم ہو چکا ہے سامنے کچھ بھی تو نہیں سوائے گہرائی کے ایک احساس کے اور میں گہرائی میں اترنے کے حوصلے سے محروم ہو چکا تھا ـــــ وہ جس نے میری مدد نہیں کی تھی گھر کا بھیدی تھا۔ وہ مجھ سے میری سب سے بڑی متاع چھین کر لے گیا تھا۔ وہ مجھے حوصلے سے یکسر محروم کر گیا تھا ـــــ وہ واپسی کے راستے کا سب سے بڑا پتھر، سب سے بڑی رکاوٹ بن گیا تھا۔ وہ دھند بن کر مجھ پر اور میرے گھر پر چھا گیا تھا ـــــ پھر مجھے اس کی عظمت پر، اس کی دانشمندی پر یقین آ گیا۔ وہ ٹھیک کہتا تھا۔ میں وادی والے گھر کو، وادی کو چھوڑ دوں گا ـــــ اب میں بلندی پر ایک نیا گھر بناؤں گا جہاں برسات کا پانی میرے لئے مصیبت نہیں بنے گا۔

جب میں نے بلندی کی طرف سفر کا آغاز کیا تھا میں خود کو تر و تازہ محسوس کر رہا تھا اور اس تھکن کے آثار ختم ہو گئے تھے جو میں پتھر پر بیٹھا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ میرے قدم تیزی سے اٹھ رہے تھے پہاڑی کی چوٹی سامنے تھی۔ لگتا تھا جب چاہوں گا ہاتھ بڑھا کر اسے پکڑ لوں گا۔ لیکن میں نے اس احساس سے فائدہ نہیں اٹھایا۔

میں صدیوں سے گہری وادی کا مکین تھا۔ بلندیوں کے حسن نے مجھے مسحور تو کیا تھا لیکن میں ان کے سامنے بے دست و پا کبھی نہیں ہوا تھا کیونکہ میں گہری وادی میں بنے ہوئے ایک پرانے گھر کی ملکیت تھا اور ایک

نظر نہ آنے والی زنجیر سے اس کے ساتھ بندھا ہوا تھا۔ مجھے ان عزیزوں اور دوستوں کی بے بسی پر دکھ ہوتا تھا جو کبھی میرے پاس اس گہری وادی میں رہا کرتے تھے۔ لیکن پھر بلندیوں کے سحر نے انہیں مجھ سے چھین لیا تھا انہیں مجھ سے جدا ہوئے مدتیں گزر چکی ہیں۔ میں ان میں سے کسی کا نام بھول چکا ہوں تو کسی کے نقش۔ وہ سب اب کہاں ہیں، کچھ معلوم نہیں۔ کیونکہ اُدھر جانے والے واپس نہیں آتے ـــــ چند لاشیں ضرور واپس آئیں۔ جنہیں مرنے والوں کی وصیتوں کے مطابق ان کے آبائی قبرستانوں میں دفن کر دیا گیا۔ وہ یہ عجیب وصیت کرنے پر کیوں مجبور ہوئے یہ میں ان سے کیسے پوچھوں!

اس روز بارش نہیں ہوتی تھی اور دھوپ بھی خاصی تیز تھی لیکن ایک روز پہلے کی تیز بارش کے اثرات صاف نظر آ رہے تھے۔ بارش کے پانی نے پہاڑی پر لاتعداد لکیریں بنا دی تھیں۔ ہر لکیر ایک اشارہ تھی اور بتا رہی تھی کہ تمام راستوں کی منزل ایک ہے اور سب راہیں چوٹی کی طرف جاتی ہیں۔ کہیں کہیں مستقل پگڈنڈیاں بھی موجود تھیں جنہیں بارش نے باقی زمین کے ساتھ ملا دینے کی ناکام کوشش کی تھی میں ایک پگڈنڈی پر چلنے لگا۔ میں نے اس پگڈنڈی کو کیوں منتخب کیا اس کی صرف یہی وجہ تھی کہ یہ پگڈنڈی اتفاق سے میرے قریب اور سامنے تھی۔ نصف راستہ طے کرنے کے بعد میں نے دیکھا کہ بہت سی پگڈنڈیاں اور تنگ راستوں اور لکیروں نے مل کر ایک واضح بڑا سا راستہ بنا لیا تھا۔ اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑا تھا۔ بس یہ ہوا تھا کہ ذہن سے بوجھ سا اتر گیا تھا۔ جیسے میں کسی جنگل سے باہر آ گیا ہوں۔ اب سفر بہت آسان اور سیدھا معلوم ہونے لگا تھا۔ آسانی کا خیال آتے ہی بدن پر تھکن کا احساس غلبہ پانے لگا اور پیاس بھی ستانے لگی۔ میں رک گیا۔ سوچا کچھ دیر آرام کرنے کے بعد آگے بڑھوں گا۔ پانی کی تلاش میں میں نے ادھر اُدھر نظر دوڑائی لیکن مایوسی ہوئی۔ بارش اس روز ہوئی نہیں تھی اور پچھلے دنوں کی بارش کا سارا پانی بہہ کر نیچے چلا گیا تھا اور وادی میں اور میرے گھر میں جمع تھا اور چشمے بھی سب نیچے وادی میں پہاڑی کے دامن میں رہ گئے تھے۔ میں نے وادی کی طرف دیکھا۔ وادی بہت دور چلی گئی تھی۔ صاف صاف کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔

میں ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔ جلد ہی چند کمزور سے آدمی نظر آئے جو نیچے سے آئے تھے۔ وہ اوپر چوٹی

کی جانب جا رہے تھے۔ ان کے نظر آنے سے پہلے ان کی آوازیں مجھ تک پہنچ چکی تھیں۔ وہ سب مل کر ایک گیت گا رہے تھے ــــ

بوجھ اٹھا کر چلو رے بھیّا
تھام کے آس کی ڈور
اُس منزل کی اور
جس کی اور نہ چھور

ہم وادی کا میٹھا پانی
چوٹی پر لے جائیں
اور ساگر کے بادل برکھا
دھرتی پر برسائیں
مل جل کر سب مہامنی
یہ بات ہمیں سمجھائیں
سارا پانی بہہ جاتا ہے
کیوں ساگر کی اور
بوجھ اٹھا کر چلو رے بھیّا
تھام کے آس کی ڈور

انہوں نے سروں پر پانی سے بھرے ہوئے بڑے بڑے مٹکے اٹھا رکھے تھے۔ وہ گیت گاتے ایک ایک کرکے میرے قریب سے گزرتے چلے گئے لیکن مجھے حوصلہ نہ ہوا کہ کسی سے چُلّو بھر پانی مانگ لوں۔ آخری آدمی مجھے دیکھ کر ٹھٹھکا اور مجھے یوں لگا جیسے اُسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ ہو۔ میں نے بھی اسے پہچان لیا۔ وہ پہلے سے دبلا ہو رہا تھا۔ سخت محنت کے نشان اس کے چہرے سے

میاں تھے۔ وہ زرد اور سانولا ہو گیا تھا۔ تقریباً سبھی آدمیوں کا یہی حال تھا لیکن وہ کمزور اور دبلے نظر آنے کے باوجود بلند ہمّت تھے۔ بوجھ اٹھا کر سیدھی کمر کے ساتھ چلنا جانتے تھے اور یہ بڑی بات تھی۔

وہ آدمی جو مجھے حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ مجھے پہچان گیا۔

"مالک ؟ آپ ؟" اس نے میرے قریب آکر کہا۔ اس کے چہرے پر مسرت یا افسردگی کی کوئی علامت نہیں تھی۔ اس کے چہرے پر صرف حیرت تھی۔

"قادرا ؟ تم ہو ــــ ؟ قادرا تم کتنے کمزور ہو گئے ہو ــــ پہچانے بھی نہیں جاتے۔"

"اب محنت بہت کرنا پڑتی ہے مالک۔"

"محنت بہت کرنا پڑتی ہے ؟ آج کل کہاں ہو قادرا ؟"

"وہاں ــــ اُوپر۔" اس نے چوٹی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"اچھا تم بھی وہاں پہنچ گئے۔ یہ جگہ سب کو کھینچتی ہے۔ سب راستے وہیں جاتے ہیں۔"

"جی ــــ مالک ؟"

"قادرا تم نے وادی کو کیوں چھوڑ دیا ؟ کیا تم بھی بارش کے پانی سے ڈر گئے تھے ؟"

"بارش کا پانی تو مالک اللہ کی رحمت ہے ــــ یہ نہ ہو تو وادی میں یہ سبزی، یہ جان کہاں سے آئے اور ہمیں روزی کیسے ملے۔ بارش کے پانی سے تو ہمیں بہت پیار ہے۔"

"پھر تم وہاں سے اوپر کیسے پہنچ گئے ؟"

"مالک آپ چلے گئے تو گھر سُونا ہو گیا۔ آپ نے جن لوگوں کے سپرد اپنا گھر کیا تھا انہیں میری ضرورت نہیں تھی۔ میں نوکری کی تلاش میں نکلا اور وہاں پہنچ گیا ــــ تب سے وہاں ہوں۔"

"قادرا ــــ یہ تمہارے سر پر گھڑا کیسا ہے ؟ کیا ہے اس میں ؟ شاید پانی ہے ؟"

"ہاں مالک ــــ پانی ہے۔"

"پانی ہے ؟ میں نے ہونٹوں پر زبان پھیری" کہاں لئے جا رہے ہو ؟"

میں نے بہت چاہا کہ وہ میرا مدعا سمجھ جائے اور مجھے تھوڑا سا پانی پلا دے۔ لیکن ایسا نہ ہُوا۔

"مالک میرا کام نہیں بدلا۔ پہلے آپ کے گھر کا پانی باہر نکالتا تھا اور اب باہر سے گھر کے اندر لاتا ہوں۔"

"لیکن کیوں قادرا!"

"مالک وہاں چوٹی پر پانی کا کوئی چشمہ ہے نہ جھیل۔ بارش کا سارا پانی بہہ کر نیچے وادی میں چلا جاتا ہے اور بارش بھی کوئی ہر روز تو نہیں ہوتی۔ چشمے بھی سارے نیچے وادی میں ہیں۔ صاف پانی کی وہاں بڑی مشکل رہتی ہے۔"

میں نے ہونٹوں پر پھر زبان پھیری۔ خشک ہونٹوں پر نیم خشک زبان۔

قادرا کئی سال میرے پاس رہ چکا تھا۔ وہ اب بھی مجھے مالک کہہ رہا تھا حالانکہ میں اس کا مالک نہیں تھا ——— لیکن اس نے مجھے پانی کیوں نہیں پلایا۔ کیا وہ میرے چہرے سے میرا مدعا نہیں جان گیا تھا۔ اگر جان گیا تھا تو اس نے کیوں نہیں کہا "مالک آپ پیاسے لگتے ہیں پانی پی لیجئے۔"

وہ چلا گیا۔ وہ جو مجھے اچھی طرح جانتا تھا۔ جس کے سر پر تازہ شیریں پانی سے بھرا ہُوا مٹکا رکھا تھا۔ وہ جو میری وادی کے چشموں کا پانی اوپر چوٹی کی طرف لئے جا رہا تھا ——— وہ مجھے ایک گھونٹ بھی نہ پلا سکا اور میں پانی مانگنے کا حوصلہ نہ کر سکا۔

وہ چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی پیاس کا احساس شدید تر ہو گیا۔ پہاڑی پر ایک ارتعاش سا پیدا ہُوا اور چوٹی کوسوں دور چلی گئی۔ کچھ دیر پہلے کا احساس یاد آیا کہ جب چاہوں گا ہاتھ بڑھا کر چوٹی کو پکڑ لوں گا۔ اور افسوس ہونے لگا کہ اس موقعے کو ہاتھ سے گنوا دیا۔

میں نے کہا۔ اب میں کیا کروں۔ آگے بڑھنے کی ہمت نہیں رہی۔ ایک حد آ گئی ہے اور ایک پیچھے اور حدوں سے ادھر موت ہے، عدم ہے ——— میں معدوم نہیں ہونا چاہتا حدود کے درمیان ہی زندگی ہے میں اب آگے نہیں جاؤں گا۔ یہیں رہوں گا۔ یہاں ایک مختصر سا گھر بنا لوں گا۔ یہاں بہت سے پتھر ہیں۔ ایک ایک چھوٹا سا تالاب بنا کر ضرورت کا پانی بارش کے دوران جمع کر لیا کروں گا۔ پھر ذرا نیچے وادی کے چشمے

بھی ہیں۔ یہاں بارش کے پانی کے جمع ہو کر تکلیف کا سبب بننے کا کوئی خطرہ نہیں ——— ہاں مجھے یہیں رہنا چاہیئے یہ جگہ محفوظ ترین ہے!

میں نے نیچے کی طرف دیکھا۔ وادی تارا سی نظر آ رہی تھی۔ میں حیران تھا کہ میں نے بہت طویل سفر تو طے نہیں کیا وادی اتنی دور کیسے ہو گئی۔

چند آدمی جواب چوٹی کی طرف سے آئے تھے اور نیچے وادی کی طرف جا رہے تھے۔ مجھے حیرانی سے دیکھتے بہت نیچے اترتے چلے گئے۔ ان کے سروں پر خالی مٹکے رکھے تھے۔ قادرا ان میں نہیں تھا میرے پاس کوئی نہیں رکا۔ میں آخری آدمی کو حسرت سے دیکھتا رہا۔ وہ قادرا نہیں تھا لیکن مجھے یقین تھا کہ اگر وہ قادرا ہوتا بھی تو بھی میرے پاس نہ رکتا۔

تب ایک عجیب سا خوف مجھ پر سوار ہو گیا ——— یہاں تو کوئی بھی نہیں رکتا۔ بارش کا پانی نیچے بہہ جاتا ہے اوپر سے آنے والے نیچے اور نیچے سے آنے والے اوپر چلے جاتے ہیں۔ اس خوفناک تنہائی کو میں کیسے برداشت کرونگا۔ مجھے چلنا چاہیئے۔ آگے بڑھنا چاہیئے۔ حدوں سے ادھر بے یقینی ہے یقین صرف حدوں پر ملتا ہے۔ میں چوٹی پر جاؤنگا یہی مناسب ہے یہی ضروری ہے یہاں کوئی دمساز نہیں پتھر بھی ہاتھ سے چھوٹتا ہے تو دور نیچے جا کر رکتا ہے۔ میں چوٹی پر جاؤں گا۔ شاید وہاں میرا انتظار ہو رہا ہو ——— شاید ——— واقعہ بہت پرانا ہے لیکن ذہن پر نقش ہے ——— جدا ہونے سے پہلے اس نے کہا تھا۔ مجھے پستیوں اور گہرائیوں سے نفرت ہے مجھے چاہتے ہو تو میرے ساتھ اوپر اٹھو ——— بلندیوں کی طرف بڑھو۔ مجھے اس سے بہت محبت تھی۔ میں اس کے ساتھ رہنا چاہتا تھا لیکن وادی نے میرے پاؤں مضبوطی سے پکڑ رکھے تھے۔ میں اس کے ساتھ نہ جا سکا اور ہم جدا ہو گئے ——— وہ اسی طرف گئی تھی۔ یہی چوٹی اس کی منزل تھی۔ میں سوچتا رہا کہ اس نے جدائی کی صورت حال کو کیسے قبول کر لیا تھا۔ حالانکہ اس نے کہا تھا کہ میں بلندیوں پر تمہارا انتظار کروں گی۔ میری محبت سچی ہے تو ایک نہ ایک دن تم ضرور میرے پاس آؤ گے۔ اس نے سچ کہا تھا۔ آج میں وادی سے محبت کا رشتہ توڑ کر اس کے پاس جا رہا ہوں ——— اور جب وہ میرا استقبال کرے گی تو وہاں پانی پینے سے مجھے کون روک سکے گا ——— پھر میں وہیں رہوں گا ——— وہ ایک نئی اور مکمل دنیا ہو گی ——— مستقبل کتنا دلکش ہے ——— مستقبل کتنی بڑی حقیقت

ہے ـــــ حال کا کوئی وجود نہیں۔ لمحۂ رواں کی کوئی حیثیت نہیں۔ زمانے صرف دو ہیں میرا وادی والا گھر اور اوپر چوٹی پر بنا ہوا اس کا مکان!

عجیب پہاڑی تھی۔ سایہ دار درخت بہت کم تھے۔ چاروں طرف پتھریلی چٹانیں بکھری پڑی تھیں اور جہاں پتھر نہیں تھے وہاں گنجان گھاس اور گھنی جھاڑیاں اگی تھیں جن پر کوئی پھل نہیں تھا۔

چوٹی پر پہنچ کر میں نے فتح کے احساس کے ساتھ گھوم کر نیچے کی طرف دیکھا۔ ہوا کے جھونکے سے بال میرے ماتھے اور آنکھوں پر بکھر گئے۔ وادی صاف نظر نہیں آ رہی تھی اور مجھے اس کا افسوس بھی نہیں تھا میں خوش تھا کہ نئی منزل کو سر کر چکا تھا۔

اب صرف ایک پریشانی تھی ـــــ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ مجھے بھول گئی ہو۔ ایسا تو نہیں کہ وہ مجھے پہچان ہی نہ سکے۔ کیا اسے یاد رہا ہوگا کہ میں بھی کوئی تھا ـــ؟ لیکن اس نے دمِ رخصت کہا تھا کہ وہ میرا انتظار کرے گی ـــــ ہاں میں اُسے یاد دلاؤں گا، اس نے کیا کہا تھا۔

میں نے اسے پکارنا چاہا ـــــ لیکن میں اسے کس نام سے پکارتا۔ مجھے اس کا نام یاد نہیں آ رہا تھا اگرچہ اس کا ایک ایک نقش ذہن پر کندہ تھا ـــــ کتنا اچھا نام تھا۔ کتنا پیارا نام تھا ـــــ یہ نقصان ناقابلِ تلافی تھا میں یہ متاعِ گراں بہا کہاں گرا آیا تھا۔ میں نے پچھلے راستوں کی جانب دیکھا جو مجھے یہاں تک لائے تھے۔ وہاں کچھ بھی نہیں تھا ـــــ لیکن میں اب اس کے قریب تھا۔ مجھے یقین تھا وہ مجھے میری آواز سے پہچان لے گی ـــــ اور میں نے کئی بار صدا لگائی۔

"تم کہاں ہو۔؟"

"تم کہاں ہو۔؟"

جواب میں ہر بار "ہاں ہو ـــــ" "ہاں ـــــ ہو" کی گونج کے سوا کچھ سنائی نہ دیا۔ اس گونج میں لفظ "تم کہاں" گر جاتا تھا، کیوں گر جاتا تھا؟

فضا خوف انگیز خاموشی سے بوجھل ہونے لگی۔

"تم کہاں ہو؟" میں نے اور زیادہ بلند آواز سے اُسے پکارا۔

"ہاں ہو" جواب ملا۔

کیا کوئی میری آواز کو نہیں سن رہا تھا۔ میں مایوس ہو چلا تھا کہ مجھے قادرا نظر آ گیا۔ وہ میری طرف آ رہا تھا۔ اس نے میری آواز سے مجھے پہچان لیا تھا۔ وہ مجھے اسی حیرت سے دیکھ رہا تھا جس کا اظہار اس کے چہرے اور آواز سے پہلی ملاقات میں ہو چکا تھا۔

"قادرا؛ قادرا ـــ؟"

"جی ـــــ مالک۔"

"قادرا ـــــ تو تم یہاں رہتے ہو؟"

"جی ـــــ مالک۔"

"قادرا ـــــ یہاں اتنی خاموشی کیوں ہے؟"

"مالک ـــــ یہاں تو سب زیادہ چپ ہی رہتے ہیں ـــــ باتیں بس کبھی کبھار ہوتی ہیں وہ بھی جب مالکن کا جی چاہے"،

"مالکن؟ ـــــ قادرا ـــــ کیا تمہاری مالکن نے میری آواز نہیں سنی؟ کیا اس نے مجھے پہچانا نہیں؟ ـــــ قادرا جاؤ، اُسے بتاؤ ـــــ کوئی آیا ہے ـــــ"

"مالکن گھر نہیں ہے مالک۔"

"گھر نہیں ہے ـــــ! وہ کہاں ہے قادرا؟" میں آواز کو بلند کرنا چاہتا تھا لیکن آواز از خود مدھم ہو گئی "قادرا کیا چوٹی سے بلند تر بھی کوئی اور جگہ ہے؟"

"ٹھیک سے کچھ پتہ نہیں مالک ـــــ کئی دن ہوئے نیچے وادی کی طرف گئی تھی۔ کہتی تھی یہاں کی چپ سے تنگ آ گئی ہوں۔ اکیلے پن سے اکتا گئی ہوں"

"اوہ۔ میں جانتا تھا ایسا ہوگا۔ وہ اور کیا کہتی تھی؟"

"کہتی تھی یہاں کی چپ اور اکیلے پن نے مجھے اداس کر دیا ہے ـــــ یہاں ہر شخص اکیلا ہے ـــــ چوٹی کی طرح ـــــ وہ ان چوٹیوں کو دیکھتی اور اپنے آپ سے باتیں کرنے لگتی تھی۔ کہتی تھی

چوٹی اکیلی ہے ——— چوٹیاں آپس میں نہیں مل سکتیں ——— مالک ——— وہ بہت دکھی دکھائی دینے لگی تھی ——— کہتی تھی وادی میں ایک انمول شے بھول آئی ہوں ——— عجیب باتیں کرنے لگی تھی۔ جیسے اللہ نہ کرے پاگل ہو گئی ہو۔"

"بلند خاموشیوں کی تنہائیوں کو اپنانے کا یہی انجام ہو سکتا تھا۔"

"مالک آپ تھک رہے ہوں گے ——— بیٹھ جائیں۔"

"نہیں قادرا ——— میں نہیں بیٹھ سکتا ——— کتنی عجیب بات ہے ——— تم ذرا نیچے پہاڑی پر دوپہر میں مجھے ملے تھے تو میں نے چاہا تھا کہ میرے پاس کچھ دیر بیٹھو۔ لیکن تم نہ رک سکے۔ اب تم چاہتے ہو کہ میں یہاں بیٹھوں اور آرام کروں لیکن میں ایسا نہیں کر سکتا۔ میں نے یہ طویل سفر صرف اس کے لئے طے کیا ہے ——— بتاؤ وہ کب واپس آئے گی؟"

"پتہ نہیں مالک ——— ہم ہر روز اس کا انتظار کرتے ہیں۔ اس نے کہا تھا میں کسی وقت بھی واپس آجاؤں گی ——— ہم ہر روز اس کے آنے کی تیاری کرتے ہیں۔ وہ ہر روز وادی کے چشموں کا میٹھا، ٹھنڈا اور تازہ پانی پیتی تھی۔ اسی پانی سے نہاتی دھوتی تھی۔ بارش ہو یا نہ ہو۔ وادی کے چشموں کا پانی ضرور آتا ہے ہم ہر روز تازہ پانی مٹکوں میں بھر کر لاتے ہیں اور باسی پانی پھولوں کے ان پودوں میں ڈال دیتے ہیں جو اُس نے بڑے چاؤ سے لگائے ہیں۔ اُسے وادی کے چشموں کے پانی سے بہت پیار ہے۔"

سورج ڈوب رہا تھا۔ شام کے اندھیرے کا حلقہ چوٹی کے گرد تنگ ہوتا جا رہا تھا۔ میں نے وادی کی طرف دیکھا۔ دھندلکوں میں دل جیت لینے والی ننھی منی روشنیوں سے چراغاں ہو رہا تھا۔ وادی سے حسن اور مسرت کی کرنیں پھوٹ رہی تھیں۔

میرے پاؤں سخت درد کر رہے تھے۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ پاؤں زخمی ہو چکے ہیں اور زخموں سے خون رِس رہا ہے۔

میں جھک کر اپنے تھکے ہارے زخمی پاؤں دیکھنے لگا۔ میں ڈر گیا۔ پاؤں کی طرف بڑھے ہوئے ہمدرد ہاتھ ایک جھٹکے کے ساتھ واپس آگئے۔ سارا جسم کانپ اٹھا اور روح پر لرزہ طاری ہو گیا۔

"اوہ!" خوف کے مارے ایک لفظ کے سوا زبان سے کوئی بات نہ نکل سکی۔

حیرانی اور خوف کی ایک نئی لہر میں نے قادرا کے چہرے پر بھی دیکھی جو اب مسلسل میرے پاؤں پر نظریں جمائے کھڑا تھا۔ لگتا تھا وہ ابھی چلّا اٹھے گا۔

میرے پاؤں سخت بدنما ہو گئے تھے۔ بوجھل کالی چڑھائی ایک بھاری بدرنگ سانپ کی طرح میرے ااس سے لپٹی ہوئی تھی۔ میں نہیں جانتا تھا کہ میں اسے کیونکر اپنے ساتھ یہاں تک لے آیا تھا ——— میں نے اسے جھٹک دینا چاہا، لیکن بے سُود۔ اس کی گرفت مضبوط تھی۔ میری ٹانگیں دبلی اور کمزور ہو گئی تھیں اور کالی چڑھائی کے بوجھ نے انہیں حرکت کی قوت سے محروم کر دیا تھا۔ میں واپسی کے سفر کے قابل نہیں رہا تھا۔

"مالک ——— آپ رو رہے ہیں۔" قادرا نے اچانک سوال کیا۔ "آپ کی آنکھوں میں پانی ہے مالک!"

"نہیں قادرا ——— نہیں ——— یہاں پانی کہاں!"


بھیڑیں

پنڈال میں داخل ہوتے ہی میں بدلنے لگا ـــــ مجھے اسی بات کا ڈر تھا۔ ہجوم میرے لئے مصیبت بن جاتا ہے۔

ٹیٹ کیپر نے مجھے میری نشست کا محل وقوع اچھی طرح سمجھا دیا تھا۔ خوش قسمتی سے یہ نشست سٹیج سے زیادہ دور نہ تھی۔ دوسری ہی قطار میں جگہ مل جانا بڑی بات تھی۔ میں بڑے اعتماد سے اپنی نشست کی جانب بڑھا لیکن میرا یہ اعتماد اس خوف کا غماز تھا جو میں اس ہجوم سے محسوس کر رہا تھا! مجھے اکثر یوں لگتا ہے کہ ہجوم مجھے کھا جائے گا۔ میں ہجوم کی طرف بڑھتا ہوں تو محسوس کرتا ہوں جیسے قطرہ سمندر میں شامل ہونے جا رہا ہے زندہ دفن ہونے کا خوف! یہ بڑا سخت خوف ہے!

خوف تو مجھ پر پنڈال میں قدم رکھتے ہی سوار ہو گیا تھا لیکن دیکھنے والوں نے دیکھا ہو گا کہ یہ نوجوان کس تمکنت اور خود اعتمادی سے اپنی نشست کی طرف بڑھ رہا ہے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ خوف میرے ذہن پر طاری ہو لیکن چاہنے اور ہونے کے درمیان امکانات کا جو ایک سمندر موجزن رہتا ہے اس پر پل کون باندھے! آخر میں بڑی خود اعتمادی سے اس سمندر میں اترا اور تیرنے کی کوشش میں غوطے کھانے لگا۔ میں ڈوبا لیکن مرا نہیں۔ پھر ابھر آیا اور دوسرے کنارے لگ ہی گیا۔ لیکن اب وہ مصنوعی خود اعتمادی امکانات کے

سمندر میں نمک کی طرح گھل گئی تھی۔ اور جب میں ڈوب کر اُبھرا تو مجھے خود اعتمادی کے زیاں کا کوئی احساس نہیں تھا۔ میں بدل سا گیا تھا۔ بلکہ سب کچھ بدل سا گیا تھا اور میں بھی مطمئن تھا۔

اَب میں بھیڑوں کے ایک بڑے سے گلّے میں ایک بھیڑ تھا۔

مَیں پہلے بھی اس تجربے سے گزر چکا تھا اور اس امید پر اب ادھر چلا آیا تھا کہ شاید اب کے ایسا نہ ہو لیکن یہ قلبِ ماہیت ہو کر رہی۔ بعض اوقات تو مَیں صاف صاف محسوس کرتا ہوں کہ میرے بدن پر لمبی لمبی سفید ملائم اُون اُگ آئی ہے اور گرم کپڑے کی ملوں کے مالک مجھے للچائی نظروں سے دیکھ رہے ہیں اور باہر کھیتوں میں رہنے والا گڈریا میری موت کا منتظر ہے تاکہ میری اون سے لدی کھال کو آنے والے سرما کے حملے کا مقابلہ کرنے کے لئے ڈھال بنائے اور مَیں یہ سوچنے لگتا ہوں کہ نہ معلوم آئندہ سرما تک میرے جسم پر نیا اون آ جائے گا یا نہیں۔ پھر یہ بھی خیال آتا ہے کہ کوئی بات نہیں نہ بھی آیا تو پریشانی کس بات کی۔ میرے گھر میں تو کتنے ہی گرم کپڑے پڑے ہیں۔ میں یہ بھی محسوس کرتا ہوں کہ میرے چار پاؤں ہیں۔ ہاتھ نہیں ہیں۔ آواز ہے نطق نہیں ہے۔ مَیں چلا تو سکتا ہوں لیکن مدعا بیان نہیں کر سکتا۔ شروع میں لوٹ جانے کی خواہش بھی ہوتی ہے لیکن جلد ہی ہجوم کی مرضی کے تابع ہو جاتا ہوں۔ بارش کا قطرہ زمین کا رُخ کرنے پر مجبور ہے میرے لئے بھی یہ صورتِ حال تقدیر کا درجہ رکھتی ہے ــــ اور وہ کونسی صورت ہے جو تقدیر کا درجہ نہیں رکھتی! اس سوال کا جواب مجھے بھی نہیں ملا۔

گلّے کے آگے کی بھیڑیں جدھر جائیں گی دوسری بھیڑیں اُدھر ہی جانے پر مجبور ہوتی ہیں۔ میں اب ہجوم کی قوتِ ارادی کا اسیر تھا۔ سارا ہجوم منہ اٹھائے اسٹیج کی طرف بڑھ رہا تھا۔ مَیں بھی ساتھ تھا لیکن اسٹیج اور ہجوم کا درمیانی فاصلہ کم نہیں ہو سکا۔ کیونکہ اسٹیج بھی اسی رفتار سے آگے چلا جا رہا تھا۔

مَیں مجبور تھا۔ مَیں بھی اس عورت کو دیکھنے لگا جسے سب دیکھ رہے تھے۔

اس کا قد لمبا تھا۔ جسم بیحد پرکشش تھا۔ چہرہ نرم اور معصوم تھا۔ یقیناً وہ پنڈال میں سب سے زیادہ خوبصورت عورت تھی۔ وہ اسٹیج کے ساتھ ہی کھڑی تھی اور بڑی ملائمت سے مسکرا رہی تھی۔ مَیں اس کے حوصلے سے بہت متاثر ہُوا کہ اتنی نگاہوں کا مرکز ہونے کے باوجود وہ قطعاً ہراساں نہ تھی۔

مجھے اب یہ یاد نہیں ہے کہ مَیں اُسے کتنی دیر تک دیکھتا رہا ــــ لیکن یہ یاد ہے کہ مَیں اپنی اس حرکت

کو بُرا سمجھ رہا تھا۔ آدابِ محفل، کتابوں کا پڑھا، استادوں کا سکھایا، بزرگوں کا بتایا سب کچھ یاد آ رہا تھا۔ اور مَیں تو ایسی بدتمیزی برداشت ہی نہیں کر سکتا تھا۔ مَیں نے کبھی کسی خاتون پر آوازہ نہیں کسا۔ کسی تانگے کا پیچھا نہیں کیا۔ ایسے موقعوں پر جہاں کسی خاتون کو دیکھ کر لوگ چلنا بھول جاتے ہیں اور کاروں اور اسکوٹروں اور سائیکلوں کی رفتار کم ہو جاتی ہے مَیں اپنی کار کو تیزی سے نکال کر آگے لے جاتا ہوں مبادا کوئی اس خیال سے پریشان ہو جائے کہ اس کا تعاقب کیا جا رہا ہے۔ اب یہ اور بات ہے کہ آپ ٹریفک جام میں کسی نازک جگہ پھنس جائیں یا پھر تقدیر ہی خلاف ہو جیسے ایک بار میرے ساتھ ہُوا کہ ایک دعوت میں جاتے ہوئے مَیں نے اسی نیک جذبے کے زیرِ اثر خواتین سے بھرے ہوئے ایک تانگے سے اپنی کار آگے نکالی۔ پھر ان خواتین سے اسی دعوت پر ملاقات ہوگئی۔ انھوں نے جیسے کچھ سوچی سمجھی شرارت کے تحت پوچھا۔

"آپ ہمیں دیکھ کر اتنا ڈر کیوں گئے تھے؟ کیا ہم بڑی خوفناک نظر آتی ہیں؟"

پھر انھوں نے مل کر ایک قہقہہ لگایا جس کا مطلب تھا کہ ہم تو بیحد حسین ہیں ہمیں دیکھ کر تو لوگ راستے بھول جاتے ہیں اور ہمارے سفر کی آخری منزل تک ہمارے ساتھ آتے ہیں اور ایک آپ ہیں کہ ـــ

پھر انھوں نے چمکتی ہوئی آنکھوں سے ایک دوسرے کو دیکھا جیسے کہہ رہی ہوں "احمق ہے"!

مَیں خود بھی یہی محسوس کر رہا تھا۔

اور اب بھی میں احمقوں کی طرح اُس عورت کو دیکھے جا رہا تھا۔

"یہ عورت کون ہے؟" مَیں نے خود سے سوال کیا۔ "لگتا ہے مَیں اس سے مل چکا ہوں۔ اس کا چہرہ بالکل جانا پہچانا ہے۔ مَیں نے اسے کہاں دیکھا ہے؟ کہاں؟ ــــ ہاں ــــ یاد آگیا ــــ یہ ویسی ہی ہے: بالکل ویسی ــــ زلیخا جیسی!"

میرا استعجاب کم ہوگیا۔

زلیخا کا چہرہ بھی ایسا ہی تھا۔ مسکراتا ہُوا اور نورانی۔ معصومیت اور اطمینان کی تصویر۔ جذبات کو ٹھنڈک اور آنکھوں کو حرارت بخشنے والا چہرہ۔ زلیخا سر سے پاؤں تک ایسی تھی۔ لیکن اس عورت کے چہرے اور جسم سے متضاد کیفیات پیدا ہو رہی تھیں۔ ساڑھی میں اس کا جسم کہیں چھپتا کہیں سامنے آتا سکونِ دل کے لئے

پیغام موت تھا ـــــ وہ زلیخا نہیں تھی ـــــ وہ ایک عجیب مخلوق تھی۔ اس کا چہرہ پھول تھا لیکن جسم تلوار!

میں اندر ہی اندر شرمندہ ہو رہا تھا۔

"کیا بکواس ہے۔" میں نے خود پر قابو پانے اور بھیڑوں کے گلے سے نکلنے کی کوشش کی۔ "اس قدر بے حیائی ـــ جمیل تم پر افسوس ہے۔"

پھر ہمارے درمیان جمیل حائل ہو گیا۔ میرا ایک وجود جمیل، لیکن میں اس رکاوٹ کو عبور کرنا جان گیا تھا کہ میرے پاس آنکھیں تھیں جو دیکھ سکتی تھیں، دل و دماغ تھے جو محسوس کر سکتے تھے۔ نفس تھا جو زندہ تھا اور جب تک نفس زندہ تھا، دل و دماغ بیدار تھے۔ اور آنکھیں کھلی تھیں۔ ایک ہی منظر پیش نظر تھا۔

زلیخا سے مشابہت نے ہر مسئلہ حل کر دیا تھا لیکن میں محسوس کئے جا رہا تھا کہ میں نے اسے کہیں اور بھی دیکھا ہے اور اسے اس کی اپنی مکمل صورت میں اپنے چہرے اور جسم کے تضاد کے ساتھ کہیں دیکھا ہے۔

میں آنکھیں بند کر کے سوچنے لگا۔ "میں نے اسے کہاں دیکھا ہے؟ یہ کون ہے؟"

آنکھیں بند ہوئیں تو مجھے روشنی مل گئی۔ یہ بڑی عجیب بات ہے کہ بہت سی چیزیں ہم کھلی آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتے۔ ہمیں یہ چیزیں آنکھیں بند کرنے پر ہی نظر آتی ہیں۔ روشنی کا کام دکھانا ہے لیکن بعض چیزیں صرف تاریکی ہی میں نظر آتی ہیں۔

جونہی مجھے یاد آیا کہ اس عورت سے میری ملاقات کب اور کہاں ہوئی تھی میں نے مسکرا کر آنکھیں کھول دیں۔ قریب ہی چند نوجوان شور مچا رہے تھے۔ مجھے مسکراتا دیکھ کر زور زور سے قہقہے لگانے لگے۔ اس وقت میں نے خود سے پوچھا تھا "یہ کیوں قہقہا رہے ہیں؟" اور یوں لگا تھا جیسے ان کے لئے مناسب ترین لفظ قہقہانا ہی ہے۔

میں ان کے طنزیہ قہقہوں سے بے نیاز اس تمام ماحول کو تازہ کر رہا تھا جس میں اس عورت سے میری پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ یہ ملاقات وکٹورین عہد کے ایک انگریز شاعر نے کروائی تھی۔ وہ عورت تو کب کی مر چکی ہے لیکن یہ عورت جیسے آواگون کی سچائی ثابت کر رہی تھی۔ یا پھر یہ وہ خاص قسم کی عورت تھی جو کبھی نہیں مرتی، جو

[illegible] جس نے دنیا کو جنت بھی بنایا ہے اور جہنم بھی۔ یہ عورت زمین کی بیٹی ہے۔ مٹی سے [illegible] مٹی ہی آغاز ہے اور مٹی ہی انجام۔ مٹی ہی زندگی ہے اور مٹی [illegible]

[illegible] اس عورت کا تعارف مجھ سے یوں کروایا تھا:

[illegible] کی تصویر ہے۔

[illegible] کی بنی ہوئی یہ تصویر جیسے منہ سے بول اٹھے گی!

[illegible]

[illegible] کی یہ لہر کہاں سے آئی ہے۔

[illegible] اپنا نظر رکھتی ہے۔

[illegible] ملائی ہے!

[illegible]

[illegible] کسی رنگ کی گرفت میں نہیں آ سکتی ـــ"

[illegible]

[illegible] ہوگی۔

[illegible] کر دیا تھا۔

[illegible] ان تھی۔

[illegible] کر دیا کرتی تھیں۔

اس [illegible] سورج کی کرنوں، اپنے سفید خچر اور پھولوں کی اس ڈالی میں کبھی کوئی فرق [illegible] میرے ہی باغیچے سے توڑ کر اس کی خدمت میں پیش کر دیا کرتا تھا۔ آہ! اس کے [illegible] تھے!۔۔۔۔

اچانک میں نے محسوس کیا کہ وہ تنہا نہیں ہے۔ اس میں حیرانی یا پریشانی کی کوئی بات نہیں تھی لیکن یہ احساس کہ وہ تنہا نہیں تھی خاصا تکلیف دہ تھا۔ اس وقت میں نے یہ نہیں سوچا کہ اتنی حسین اور خطرناک عورت تنہا ہو کیسے سکتی ہے اور عورت تو کبھی تنہا نہیں رہی جو ابھی جنت سے آدم کو ساتھ لے کر نکلی تھی۔ اس عورت کے ساتھ ایک دبلا پتلا کالا سٹریل سا جوان تھا جس کا قد اس عورت کے قد سے خاصا دبتا ہوا تھا۔ اگر اس نے صاف ستھرا لباس نہ پہنا ہوتا اور اگر اس کے بائیں ہاتھ میں مسلسل سلگتا ہوا سگریٹ اور اسی ہاتھ والے بازو کے نیچے بغل میں سگریٹوں کا ڈبہ نہ ہوتا تو اسے اس عورت کا محافظ یا غلام سمجھا جاتا۔ جیسے الف لیلوی دور میں حسین شہزادیوں کی حفاظت پر حبشی نامرد غلام مامور ہوا کرتے تھے۔ سٹریل جوان کا بایاں ہاتھ مسلسل جھکا ہوا تھا جیسے اس نے چند ماشے کا سگریٹ نہیں بیس سیر کا مگدر اٹھا رکھا ہو۔ اس کا دایاں ہاتھ اس کی سوں سوں کرتی ناک کو ہر دو تین منٹ کے بعد بار بار دباتا اور رگڑتا۔ وہ کندھے اچکاتا اور سکیڑتا اور سینے کو دائیں ہاتھ سے یوں دباتا جیسے اس کی موجودگی کا یقین حاصل کرنا چاہتا ہو — ایسے میں اس کا دھنسا ہوا سینہ اور دھنس جاتا۔

سٹریل جوان اس خاتون کے ساتھ اچھل اچھل کر پنجوں پر بوجھ ڈال کر چلتا تاکہ اس سے اونچا نظر آئے چلتے ہوئے اس کی ایڑیاں زمین سے ڈیڑھ دو انچ اونچی رہتی تھیں۔ میں اس عورت کو دیکھنے میں ایسا محو ہو گیا تھا کہ کچھ دیر تک مجھے یہ جوان نظر ہی نہ آیا۔ اور جب میں نے اسے دیکھا تو اس کی صورت بھی جانی پہچانی سی لگی۔

مجھے خیال آیا کہ اس سے بھی کسی کتاب ہی میں ملاقات ہوئی ہوگی۔ کئی تصویریں ذہن میں ابھریں، کیلی بان فاسٹس، یاگو، دلیوتے، میفسٹوفلس — لیکن ان ناموں سے کئی مشترک خصوصیات کے باوجود یہ نوجوان مجھے کسی کتاب میں نظر نہ آیا۔ کتابوں سے مایوس ہو کر میں پھر آنکھیں بند کر کے سوچنے لگا اور مجھے یاد آ گیا کہ یہ تو وہی شخص ہے جو کچھ عرصہ قبل ایک ٹوٹی ہوئی سائیکل پر سوار میرے گھر کے سامنے والی سڑک سے گزرا کرتا تھا۔

شور اور ہنگامے کے باوجود ایسے لمحے بھی آتے رہے کہ پنڈال میں ایک بےچین سی خاموشی چھا جاتی۔ ان لمحوں میں اگر کوئی بات ہوتی تو صاف سنی اور سمجھی جا سکتی تھی۔ ایسے ہی چند لمحوں میں میں نے سنا کہ سٹریل جوان نے

اس خاتون کا تعارف ایک اور نوجوان سے یوں کروایا: "نیدی اپنی بھابی سے ملو — یہ شکیلہ ہے — ہی ہی ہی — حنا جی۔"

وہ اس کی بیوی تھی!

اس کا تعارف کئی نوجوانوں سے ہوا بعض کو وہ یقیناً پہلے سے بھی جانتی تھی۔ ہر ملاقاتی نے اس سے مصافحہ کیا اور ہر مصافحے پر وہ ذرا سا آگے کو جھکی۔ ایسے میں اس کے چہرے پر روشن سرخی کی ایک نئی لہر دوڑ جاتی اور وہ مسکرانے لگتی۔ تمام عرصہ وہ صرف مسکراتی رہی۔ اس کے ہونٹوں سے کوئی بات نہیں نکلی۔ اس نے ہر بات کا جواب چہرے پر دوڑنے والی سرخ روشنی کی ایک لہر اور سارے جسم پر پھیل جانے والی ایک مسکراہٹ سے دیا — بعض عورتوں کے پورے جسم کیونکر مسکرانے لگتے ہیں، معموں میں یہ بھی ایک معمہ ہے۔

یہ انکشاف سخت تکلیف دہ تھا کہ یہ خوبصورت عورت اس سٹریل جوان کی بیوی ہے۔ مجھے فطرت کی ستم ظریفی پر بڑا غصہ آیا اور اس عورت سے ہمدردی ہونے لگی۔ میں نے فرض کر لیا کہ اس عورت پر ضرور ظلم ہوا ہوگا۔ میرے ذہن میں وہ تمام کہانیاں تازہ ہو گئیں جن میں ایک پری کالے دیو کی قید میں کئی برس رہتی ہے یہاں تک کہ ایک شاہزادہ جو اپنے تمام بھائیوں سے زیادہ حسین وجیہہ اور عقلمند ہے، اسے رہا کروانے میں کامیاب ہو جاتا ہے اور پھر دونوں کی شادی ہو جاتی ہے اور وہ باقی عمر ہنسی خوشی گزارتے ہیں۔ پھر میں نے سوچا اب اس پری کی رہائی کا وقت آ گیا ہے۔ میں اس کو اس ننھے کالے شیطان کے چنگل سے آزاد کراؤں گا اور — اور میں حقیقت کو چھپانا نہیں چاہتا۔ میں نے یہی سوچا تھا کہ پھر ہم باقی زندگی ہنسی خوشی گزاریں گے۔

"خوانخواہ نفس!"

"بےحیا!"

"کمینے!"

یہ گالیاں میں صاف سن رہا تھا کہ میرے لئے استعمال ہو رہی تھیں۔ یہ گالیاں اسٹیونسن والا ڈاکٹر

جیکل مسٹر ہائیڈ کو دے رہا تھا، وہاں دو ڈرامے ہو رہے تھے۔ ایک میرے باہر پنڈال میں اور دوسرا میرے اندر پاتال میں۔

"یہ لوگ مشاعرہ شروع کیوں نہیں کر دیتے"۔ میں سخت جھلا رہا تھا۔ "اور یہ بیوقوف عورت اور اس کا سٹرپل ساتھی کب تک ہمیں پریشان کرتے رہیں گے۔ یہ کہیں بیٹھ کیوں نہیں جاتے؟ کیا انہیں سال بھر کی ملاقاتیں آج ہی کر لینا ہیں؟ یہ سمجھتے کیوں نہیں کہ لوگوں کے لئے وہ پریشانی کا باعث بن رہے ہیں"۔

میں عورت کے چہرے کو پھر غور سے دیکھنے لگا۔ اس کا چہرہ تازہ پھول کا تاثر دیتا تھا۔ نرم پاکیزہ اور معصوم۔ میں نے سوچا میں صرف اس کے چہرے کو دیکھوں گا۔ پھر خیال آیا یوں مسلسل کسی کے چہرے کو دیکھے جانا بدتمیزی ہے اور جب میں نظریں اس کے چہرے سے ہٹا رہا تھا تو مجھے پھر محسوس ہوا کہ میں برابر اس کے جسم کی تلوار کی زد میں ہوں۔ میری نظریں اس تلوار کی آب و تاب میں الجھ کر رہ گئیں۔ میں نے اس تلوار سے بچنے کے لئے اپنی نظروں کا رخ بدلا اور اسٹیج سے اٹھتے ہوئے سگریٹوں کے دھوئیں کی لکیروں کو ہوا میں تحلیل ہوتا دیکھنے لگا۔ لیکن دھوئیں کی لکیریں ذرا بلند ہو کر لہراتے جسموں میں بدلنے لگیں اور میرے سامنے اسٹیج پر دیر تک ان جسموں کا رقص ہوتا رہا۔ جب میں جیسے خواب سے جاگا تو ایک شاعر کی زبان پر یہ شعر تھا۔

اک بے طلب نشے میں گرفتار ہے بدن
اک بے سبب ہراس کی مٹھی میں جان ہے

میں مشاعرے سننے کا شوقین نہیں ہوں۔ اگر شکوہ نے مجھے اطلاع نہ دی ہوتی کہ وہ مشاعرہ کمانے آ رہا ہے اور مجھے مشاعرہ گاہ میں ملے گا اور پھر میرے پاس دو تین روز قیام کرے گا تو میں کبھی ادھر کا رخ نہ کرتا۔ مشاعرہ شروع بھی ہو چکا تھا۔ کئی شاعر پڑھ چکے تھے لیکن شکوہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں مزید انتظار نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن پھر بھی بیٹھا رہا۔ بالآخر وہ آ گیا۔ وہ شاعروں کے اس گروہ میں شامل تھا جو آدھا مشاعرہ ختم ہونے کے بعد پنڈال میں داخل ہوا کرتے ہیں۔ میں اسے دیکھتے ہی اپنی جگہ کھڑا ہو گیا۔ اس نے بھی مجھے دیکھ لیا۔ میرے پاس آیا۔ اس نے مسکرا کر اور میں نے ذرا غصے سے ہاتھ ملایا۔ اس نے مجھے اپنے ساتھ اسٹیج پر لے جانا چاہا

لیکن میں نے صاف انکار کر دیا۔

میں نے کہا "سخت بور ہو رہا ہوں۔ تم نے مجھ سے کس جنم کا بدلہ لیا ہے"۔

"فکر نہ کرو جلد ہی بھاگ نکلیں گے"۔ وہ اسٹیج پر پہونچا تو پھول ایسے چہرے والی عورت اور اس کے سٹرپل ساتھی نے اس کا بڑی گرمجوشی سے استقبال کیا اور اپنے پاس ہی بٹھا لیا۔ میں پہلے سے بھی زیادہ بور ہونے لگا۔

پھر جب وہ غزل پڑھ چکا تو اسٹیج سے اتر گیا۔ اس نے اسی وقت اپنا معاوضہ وصول کیا اور میرے پاس آ گیا اور پھر ہم پنڈال سے باہر آ گئے۔ 2666

باہر آزادی کی فضا تھی۔ لیکن میں پھر اخلاقی پابندیوں کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ میں نے شکوہ سے کہا "تمہارا اخلاقی فرض تھا کہ تم مشاعرے کے اخیر تک رکتے اور دوسروں کو بھی سنتے"۔

"اماں چھوڑو دنیا بدل گئی تم نہیں بدلے۔ شعر سنانے کے پیسے طے ہوئے تھے۔ شعر سنانے پیسے لئے بات ختم"۔

مجھے ایک عرصہ یہ یاد کر کے سخت ندامت ہوتی رہی کہ مشاعرے سے واپسی پر کار اسٹارٹ کرنے کے بعد میں نے شکوہ سے جو گفتگو کی اس کا موضوع وہی پنڈال والی عورت تھی۔ میں خاصا پریشان تھا کہ بات کیسے شروع کروں۔ میں نے بڑی مشکل سے اس سے پوچھا "تم اس عورت کو کیسے جانتے ہو؟" یہ سوال پوچھتے ہوئے مجھے اس سے نظریں ملانے کا حوصلہ نہ ہوا اور میں سامنے ونڈ اسکرین میں سے نظر آنے والی روشنیوں کو دیکھتا رہا اور میں نے یہ ظاہر کیا جیسے میں گاڑی کو احتیاط سے چلانے کی کوشش کر رہا ہوں۔

یقیناً سوال کچھ گھبراہٹ میں کیا گیا تھا اور یقیناً میرے لہجے میں حسد اور رشک کا رنگ تھا۔ جبھی میں سوال کر کے شرمندہ سا بھی ہو رہا تھا۔ ورنہ جس طرح شرارت کے انداز میں اس نے مجھے ٹھوکا دیا تھا نہ دیتا۔ شکوہ بہت ہوشیار ہے۔ اس نے میرے دل کا چور پکڑ لیا تھا۔

میں اب ہجوم سے الگ ہو چکا تھا لیکن ابھی تک ہجوم میں شامل ہونے سے پہلے والی حالت میں پوری

طرح واپس نہیں آیا تھا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جس حالت میں میں اب تھا وہی میری اصلی حالت تھی اور اب پلٹنے کا سوال ہی باقی نہیں رہا تھا۔ میں اپنے آپ کو دھوکا بھی دے رہا تھا اور یہ بھی سمجھ رہا تھا کہ اب میں اپنے آپ کو اس حد تک جان گیا ہوں کہ چھپنے چھپانے میں کوئی فائدہ نہیں تھا۔

"تم اتنے پریشان کیوں ہو؟ کیا اس نے تمہیں کوئی تکلیف پہنچائی ہے!" شکوہ نے کہا۔

"یہ میری بات کا جواب نہیں ہے۔"

"ناراض کیوں ہوتے ہو بتائے دیتا ہوں۔ میں اس عورت کو کافی عرصہ سے جانتا ہوں۔ کوئی اعتراض؟ ہاں اب تم بھی بتاؤ کہ آخر تم صرف اس کے بارے میں گفتگو کیوں فرما رہے ہو؟"

"اس عورت نے سارے پنڈال کو پریشان کر رکھا تھا۔"

"ہو سکتا ہے ـــــ لیکن اس میں اس کا قصور؟ تم ذرا کھل کر بات کرو۔"

اس نے ٹھیک کہا تھا۔ میں خود محسوس کر رہا تھا کہ میری گفتگو بالکل کسی احمق کی گفتگو معلوم ہو رہی تھی۔ بات صاف صاف کرنا ہی مناسب تھا۔

میں نے کہا "میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ اتنی خوبصورت عورت اس کالے سڑیل شیطان کی بیوی کیوں ہے!"

"دوسرے لفظوں میں تم یہ جاننا چاہتے ہو کہ وہ تمہاری بیوی کیوں نہیں ہے۔ تو اس کا جواب بڑا سیدھا ہے کہ تم موقع پر نہیں پہنچ سکے ـــــ کوئی اور بات کرنے سے پہلے میری طرف سے مبارکباد قبول کرو کہ تم نے عورتوں میں دلچسپی لینی شروع کر دی۔"

"تم غلط سمجھے ہو۔" میں صاف جھوٹ بول رہا تھا۔ "میں تو یہ سوچ کر پریشان ہو رہا تھا کہ قدرت بھی کیسے کیسے جوڑ ملاتی ہے۔ کیا یہ انصاف ہے؟"

"افسوس ہے کہ تم اس کی شادی سے قبل اس کو نہ مل سکے ورنہ انصاف بھی ہو جاتا اور اس کی قسمت بھی جاگ اٹھتی۔ خیر اب بھی کیا گیا ہے۔ وہ ہیلن ہے تو تم شہزادہ پیرس ہو۔ لے بھاگو اس کو پرتھوی راج مہاراج! شیر افگن سے جہانگیر بن کر ملو۔" یہ کہہ کر شکوہ نے زور سے قہقہہ لگایا۔

"بکتے ہو، بکتے ہو۔ سنجیدگی سے کسی بات پر غور نہیں کرتے ـــــ پتہ نہیں شعر بھی سنجیدگی سے کہتے ہو یا نہیں۔"

"تمہیں کیا معلوم ہوتا ہے۔"

"مجھے تو تم شاعری کے بارے میں بھی غیر سنجیدہ لگتے ہو۔"

"اچھا ـــــ تو لو ہم سنجیدہ ہو گئے، اب کرو بات ـــــ" اس نے شرارت کے ساتھ چہرے کا تاثر بدل کر کہا۔

"اگر وہ گونگی ہے تو اس پر دوہرا ظلم ہوا ہے۔ یعنی قدرت کی طرف سے اور معاشرے کی طرف سے بھی۔"

"گونگی! تمہیں کس نے بتا دیا کہ وہ گونگی ہے؟"

"دو گھنٹے کے عرصہ میں وہ کتنے ہی لوگوں سے ملی لیکن ایک لفظ اس نے نہیں کہا۔ ذرا سا سر کو جھکا کر مسکرا دی اور بس۔ میں سمجھا وہ گونگی ہے اسی لئے اُسے ایسا شوہر ملا ہے۔"

"واہ معلوم ہوتا ہے شرلاک ہومز اور جیمز بانڈ تم نے سارے کا سارا پڑھ ڈالا ہے۔ تم تو اب اُڑتی چڑیا کے پر گننے لگے ہو۔ اسکاٹ لینڈ یارڈ والوں سے ملو۔ وہی تمہاری صحیح قدر دانی کر سکتے ہیں۔"

"یہ کیا بیہودگی ہے۔"

"بیہودگی کیا ہے تمہاری سادگی کا قصیدہ اور عقل کا مرثیہ ہے۔ روتا ہوں تو بُرا مانتے ہو۔ ہنستا ہوں تو ناراض ہوتے ہو۔ تمہارا خیال بالکل غلط ہے۔ وہ یقیناً کم گو ہے لیکن گونگی نہیں ہے۔"

"وہ گونگی نہیں ہے تو یہ ظلم اور زیادہ شدید ہو جاتا ہے ـــــ عورت بیوقوفی کی حد تک سادہ معلوم ہوتی ہے اور مرد لومڑی کی طرح چالاک اور مکار ـــــ ایک دن کی طرح روشن ہے تو دوسرا رات کی طرح سیاہ ـــــ عورت کا جسم بیحد متوازن اور ہوشربا ہے اور مرد کا مریل اور سڑیل سا۔ اِس کی مسکراہٹ میں سادگی اور معصومیت ہے اور اُس کی ہنسی میں ریاکاری ـــــ اس عورت کی زندگی کتنی کربناک ہو گی!"

"دلچسپ بات یہ ہے کہ وہ دکھی نہیں ہے، وہ مطمئن ہے۔"

میں نے اس بات پر پہلے غور نہیں کیا تھا حالانکہ یہ بات بالکل درست تھی۔ اگر اس عورت کی زندگی میں کوئی تلخی، کوئی بے اطمینانی یا کوئی پریشانی ہوتی تو اس کا کچھ نہ کچھ اثر تو اس کے چہرے پر ہوتا۔ اس کے چہرے پر دکھ یا کرب کی کوئی علامت نہیں تھی۔ وہ بیوقوفوں کی طرح مسلسل مسکرائے جاتی تھی ـــــ گویا وہ بے حس تھی۔ اسے بہت سی پریشان کن باتوں کا علم تھا نہ احساس۔ یہ کم علمی اس کے لئے نعمت کا درجہ رکھتی تھی ـــــ بہرحال یہ عورت اچھی خاصی مصیبت تھی اور آخر میں شکوہ کے اس سوال نے کہ آخر میں کیوں اس کے بارے میں پریشان ہو رہا تھا۔ مجھے مشکل میں ڈال دیا۔ میں نے کہا "میں ہی نہیں سارا پنڈال پریشان ہو رہا تھا۔"

"تمہیں معلوم ہے کہ ان کے تین بچے ہیں۔"

مجھے یہ اطلاع اچھی نہیں لگی۔

گھر پہنچ کر سونے سے پہلے ہم دیر تک باتیں کرتے رہے۔ شکوہ کئی برسوں کے بعد ملا تھا۔ وہ تین عورتوں سے شادی کر کے انہیں طلاق بھی دے چکا تھا۔ میں نے کہا "یہ بڑا ظلم ہے۔" جواب میں اس نے ایک قہقہہ لگایا اور کہا۔

"ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں۔"

"آخر تم نے یہ شادیاں کی ہی کیوں تھیں؟"

"محبت ـــــ محبت ـــــ محبت!"

"پھر طلاق کیوں؟"

"نفرت ـــــ نفرت ـــــ نفرت!"

"عجیب آدمی ہو تم بھی۔ یونہی محبت کو بدنام کرتے ہو۔"

"بھئی واہ۔ ہماری بلی اور ہمیں کو میاؤں۔ محبت کو ہم سے زیادہ کون سمجھ سکتا ہے۔ ہر چیز کی طرح محبت کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ اس حد سے آگے نکل جاؤ تو محبت نفرت میں بدل جاتی ہے میں محبت کرتا ہوں آزار نہیں پالتا۔ بیوی آزار بن کر دماغ پر سوار ہو جائے تو محبت ختم ہو جاتی ہے!"

"یہ سب ذہنی آوارگی ہے۔"

میری اس بات پر وہ یوں ہنسا جیسے کوئی بزرگ کسی بچے کی بات پر ہنستا ہے۔

صبح میں دفتر چلا گیا اور شکوہ شہر کی سیر کو نکل گیا۔ شکوہ نے طے کیا تھا کہ میں اس شام اسے شکیلہ کو اور شکیلہ کے شوہر کو کسی اچھے ہوٹل میں عصرانہ دوں۔ میرے اندر نیم مردہ سا یہ احساس تھا کہ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیئے لیکن میں نے اس تجویز کو مسترد نہیں کیا۔ پھر شکوہ ایسا زبردست قسم کا آدمی تھا کہ اس کی تجویز کو مسترد کرنا ممکن بھی نہیں تھا۔

دفتر جاتے ہوئے کار میں بیٹھے بیٹھے میں نے خود سے بہت سی باتیں کیں۔ مجھے اس بات پر ہنسی آئی اور میں کچھ شرمندہ سا بھی ہوا کہ میں نے شکیلہ کے شوہر کا نام تک معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی تھی اور اسے سڑیل جوان اور کالا شیطان قسم کے ناموں سے ہی جانتا رہا۔

"تم حسد کا شکار ہو۔" میں نے خود سے کہا۔

"ہاں ـــــ لیکن اب ایسا نہیں ہے۔ ہجوم میں میں مجبور محض ہو کر رہ گیا تھا۔ اور ـــــ اور پھر اس کو دیکھ کر مجھے زلیخا بھی تو یاد آ گئی تھی ـــــ اور یہ بات میرے لئے کشش کا سب سے بڑا سبب تھی کہ میرے برعکس وہ ہجوم سے ذرا بھی پریشان نہ تھی۔ بلکہ اس نے سارے ہجوم کو پریشان کر دیا تھا اور مسکرا رہی تھی۔"

"لیکن اس کے لئے تمہارے جذبات وہ نہیں تھے جو زلیخا کے لئے تھے۔"

"میں شرمندہ ہوں ـــــ"

میں واقعی بہت شرمندہ ہو رہا تھا اور چاہتا تھا کہ میرا ذہن ہر طرح کی پریشانی سے نجات حاصل کر لے۔ یہ عورت زلیخا نہیں تھی۔ اس کے لئے میرے جذبات وہ نہیں ہو سکتے تھے جو زلیخا کے لئے تھے ـــــ اور یہ بات بڑی غیر شریفانہ تھی کہ میں ایک عورت کے بارے میں یوں سوچ رہا تھا۔ زلیخا روح تھی۔ اس سے میرا روحانی تعلق رہا تھا۔ لیکن شکیلہ مٹی تھی۔ یا اس کا چہرہ ایک پھول تھا جو گندی مٹی کے ڈھیر، اس کے اونچی آواز سے پکارتے ہوئے جسم پر اُگا تھا۔ اس پھول تک پہنچنے کا راستہ گندگی

کے اس ڈھیر سے ہو کر جاتا تھا اور پریشانی یہ بھی کہ گندگی کے اس ڈھیر میں وہ حُسن تھا وہ کشش تھی جس کا مقابلہ کرنا ممکن نہیں تھا۔

لیکن دوسری آواز بھی مسلسل گونج رہی تھی۔ "مٹی سب سے بڑی حقیقت ہے مٹی کو گندگی کہہ دینے سے اس سے آدمی کا رشتہ ٹوٹ نہیں سکتا۔ جو مٹی سے بنا ہے۔ مٹی اسے ضرور کھینچتی ہے۔ تم نے اس کشش کو محسوس کیا ہے۔ کیا نہیں کیا ہے؟ کیا جھوٹ بولو گے!"

"میں نے ابھی گمراہی اختیار نہیں کی ہے۔ میں روحانی عظمتوں کا خواہاں رہا ہوں۔ میں مٹی ہوں لیکن روشنی کی ایک کرن کے سہارے مٹی سے اوپر اٹھنے کی قوت رکھتا ہوں ـــــ زلیخا روشنی کی ایک کرن تھی اس نے مجھے سربلند کر دیا تھا۔ شکیلہ مٹی ہے وہ مجھے مٹی میں ملا دینا چاہتی ہے۔ لیکن ایسا نہیں ہوگا ـــ میں خود پر فتح حاصل کروں گا میرا کردار داغدار نہیں ہوگا۔ میری روح زخم زخم نہیں ہوگی ـــ شام کو چائے کی دعوت نہیں ہوگی۔ اس سے دور رہنے میں ہی بہتری ہے یہ عورت جو دیکھنے میں ایک بھیڑ کی طرح سادہ اور معصوم ہے مردوں کو تباہ کرنے کی بڑی قوت رکھتی ہے ـــ میں شکوہ سے سب کچھ کہہ دوں گا۔ صاف صاف کہہ دوں گا ـــ کہہ دوں گا کہ میں تباہ نہیں ہونا چاہتا۔"

دفتر میں سارا دن بڑے اطمینان سے گزرا۔ دل پر کوئی بوجھ نہیں تھا۔ گندے خیالات سے میں آزاد ہو چکا تھا۔

شام آئی تو میں نے اچانک دیکھا کہ صبح کے ارادے دوپہر کی آگ میں جل کر راکھ ہو چکے ہیں۔ شام حسبِ معمول بڑی سہانی تھی۔ سہانی شام کی سرگرشیاں نشہ لاتی ہیں۔ آدمی کئی ایسی باتیں بھول جاتا ہے جن کا یاد رکھنا ضروری ہوتا ہے اور کئی ایسی باتیں یاد آ کر ذہنی کیفیت کو بدل ڈالتی ہیں جن کے دبے رہنے ہی میں عافیت ہوتی ہے۔

صبح کے ارادہ کی راکھ کریدتے ہوئے میں نے سوچا کہ وعدہ ایفا کرنا میرا اخلاقی فرض ہے میزبان کو مہمانوں کے استقبال کے لئے پہلے سے موجود ہونا چاہیئے۔

میں کیفے میں داخل ہوا تو ڈر رہا تھا کہ کہیں مہمان مجھ سے پہلے نہ آ چکے ہوں۔ جلد ہی شکوہ دوسرے

مہمانوں کو لے کر آ پہنچا۔

اس سے پہلے کہ شکوہ ہمارا باقاعدہ تعارف کرواتا اور میں آدابِ ملاقات کے احترام اور اپنی خواہش کے تقاضوں کے مطابق پہلے شکیلہ سے مصافحہ کرتا، سڑیل جوان نے اپنا سڑا ہُسا کمزور ہاتھ میرے ہاتھ میں ڈالتے ہوئے کہا۔

"کلیم تُوڑی۔"

"جی!"

"کلیم تُوڑی۔"

"یہ کیا نام ہے؟" میں سوچتا رہا۔ "تُوڑی، یعنی بھوسہ، یعنی چہ؟"

پھر خیال آیا کہ انکسار اور عجز کے اظہار کے لئے شاید کلیم نے اپنے نام کے ساتھ "تُوڑی" لگا لیا۔ یا پھر ہو سکتا ہے کہ اس کے ماں باپ کے بچے زندہ نہ رہتے ہوں اور بڑی منتوں کے بعد یہ بچہ کچھ بڑا ہوا تو اسے بھوسے پر سلایا گیا اور یوں تُوڑی اس کے نام کا مستقل حصہ بن گیا۔ میں کچھ مطمئن سا ہو گیا۔ لیکن شکوہ نے میری بے چینی کا اندازہ کر لیا تھا۔ اس نے کہا "حیرت ہے جمیل تم اس شہر میں رہتے ہو اور انہیں نہیں جانتے یہ کلیم طُوری ہیں۔ نامور شاعر، دانشور ـــ اور طُوری بھائی یہ جمیل ہے میرا لنگوٹیا یار ہے۔ ہم پڑھنے میں جتنے پھسڈی تھے یہ اتنا ہی تیز تھا۔"

کلیم طوری نے اپنا ملاقاتی کارڈ نکال کر مجھے پیش کیا جس پر شہر کے امیر ترین علاقے کا ایک پتہ درج تھا اور ساتھ ہی کوئی نصف درجن ادبی اور رفاہی اور سماجی اداروں کے نام درج تھے جن کا یا وہ صدر تھا یا سیکرٹری ـــ میں نے جس شخص کو اتنا ہیچ جانا تھا وہ بہت اہم نکلا۔ میں بری طرح مرعوب ہو رہا تھا۔

آخر شکیلہ سے بھی تعارف ہوا۔ مصافحہ کے ساتھ ہی وہ مسکرائی اور ایکدم آس پاس کی فضا کا رنگ بدل گیا۔ میں نے نظریں گرا لیں۔ لیکن یہ نظریں اس کے سراپا میں الجھ کر رہ گئیں۔ بڑی تکلیف دہ کشش تھی اس کے کھنچے کھنچے پکارتے جسم پر اس کا سادہ معصوم چہرہ عجیب تضاد پیش کر رہا تھا۔

"تلوار کی نوک پر رکھا ہُوا پھول" ـــــ میں نے سوچا۔

"آپ لوگوں سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔" میں نے کہا، یہ بات نصف جھوٹ تھی۔ کیونکہ خوشی صرف شکیلہ سے مل کر ہوئی تھی طوری سے نہیں۔

میں نے کنکھیوں سے کلیم کی طرف دیکھا۔ وہ اپنی کرسی پر نہیں تھا۔ لیکن کرسی خالی بھی نہیں تھی۔ کرسی میں ایک لومڑی بیٹھی مجھے یوں گھور رہی تھی جیسے میرے جھوٹ کو سمجھتی ہو۔ چند لمحوں کو میں اسی تجربے سے گزرا جس سے میکبتھ اس وقت گزر رہا تھا جب دعوت میں اس کی اپنی خالی کرسی میں اسے بینقو کا بھوت بیٹھا نظر آیا تھا۔ میں نے دو تین بار آنکھیں جھپکائیں اور پھر غور سے دیکھا۔ مجھے دھوکا ہُوا تھا۔ کلیم تو اپنی جگہ پر ہی تھا۔ وہ سگریٹ پی رہا تھا اور اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں مجھے گھور رہی تھیں۔

"ہمیں بھی آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی ـــــ حنا جی۔"

یہ کہہ کر وہ ہنسا اور شکیلہ کی طرف دیکھنے لگا جو مسلسل مسکرائے جا رہی تھی۔

"یہ حنا جی کیا ہے۔" میں سوچنے لگا۔ "شاید شکیلہ کا پیار کا نام ہے۔"

دوران گفتگو اس نے کئی بار "حنا جی حنا جی" کہا تو مجھے معلوم ہُوا کہ یہ اس کا تکیہ کلام ہے اور وہ اپنی بات کے لئے تائید حاصل کرنے کی خاطر "ہیں نا جی" کچھ اس تیزی سے کہتا ہے کہ "حنا جی" سنائی دیتا ہے یہ تکیہ کلام دلچسپ تھا ـــــ وہ "ر" کی آواز نہیں نکال سکتا تھا "ڑ" ہی کہتا تھا۔ گفتگو میں شکیلہ نے کوئی حصہ نہ لیا۔ "جی ہاں"۔ "جی نہیں"۔ "اوہ" سے آگے نہ بڑھی۔ "آپ بچوں کو ساتھ نہیں لائیں۔ مجھے شکوہ نے بتایا ہے کہ آپ کے تین بچے ہیں۔" یہ سوال میں نے یہ سوچ کر کیا تھا کہ بچے ماؤں کا محبوب ترین موضوع ہوتے ہیں۔ اس لئے شکیلہ گفتگو کرنے پر مجبور ہو جائے گی۔

وہ مسکرا کر کلیم کی طرف دیکھنے لگی۔ کلیم بولا۔ "بچوں کو گھر نوکرانیوں کے پاس ہی چھوڑ آتے ہیں۔ بچے ساتھ ہوں تو ایسی محفلوں کا سارا مزا خراب ہو جاتا ہے ـــــ حنا جی۔"

اپنے تمام حسن اور دلکشی کے باوجود شکیلہ اکتا دینے والی ثابت ہوئی۔

"عجیب عورت ہے۔" میں نے اکتاہٹ کے عالم میں سوچا "چہرے سے بھیڑ ہے اور جسم سے بیسوا۔"

میں بیزاری اور خطرے کے احساس سے پریشان تھا۔ لیکن بیزاری کا احساس بڑا مبارک تھا کہ اس کے جسم کے حملے کے لئے ڈھال کا کام دے رہا تھا۔

شکوہ اور کلیم کو گفتگو کے لئے مشترکہ دلچسپی کے کچھ موضوع مل گئے تھے اور وہ مسلسل کچھ ایسے لوگوں کو بُرا بھلا کہنے میں مصروف تھے جنہیں میں نہیں جانتا تھا۔

ڈیڑھ دو گھنٹے کی اس غیر دلچسپ اور بدمزہ ملاقات کے بعد شکوہ کے اصرار پر میں ان لوگوں کو ان کے گھر چھوڑنے گیا۔ کلیم نے بار بار کہا کہ وہ ٹیکسی سے جانا پسند کرتا ہے لیکن شکوہ نہ مانا۔

ایک بہت عالیشان بنگلہ کے سامنے پہنچ کر شکوہ نے کہا۔ "اندر سے چلو۔"

بنگلہ کیا تھا محل تھا۔ کئی ایکڑ زمین تھی جس کے وسط میں ایک عالیشان عمارت کھڑی تھی۔ میں کار کو سیدھا پورچ کی طرف لے جانے لگا تو شکوہ نے روک دیا اور مجھے دائیں جانب مڑنے کی ہدایت کی۔ اس طرف پانچ چھ کوارٹر بنے تھے جو یوں تو اچھے خاصے مکان معلوم ہوتے تھے۔ لیکن اس بنگلے کے ساتھ ان کی حیثیت نجی کوارٹروں سے زیادہ نہیں تھی اور جب کار کوارٹر نمبر ۲ کے سامنے رکی تو میں نے دیکھا کہ دروازے پر تالا پڑا ہُوا ہے۔ کلیم تمام راستہ خاموشی سے سگریٹ پیتا رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ میرے یہاں آنے سے خوش نہیں تھا۔ وہ کار سے یوں اترا جیسے تھک گیا ہو۔ کار کے شور اور ہماری آوازوں کی وجہ سے ساتھ والے کوارٹر سے تین بڑے خوبصورت بچے "امّی، امّی" کرتے باہر آئے اور شکیلہ سے لپٹ گئے، نوکر کوئی نظر نہیں آرہا تھا۔ کلیم نے تالا کھولا اور کہنے لگا۔ "آیئے۔"

میں نے نفرت سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر افسوس کی ہلکی سی لہر تھی لیکن شرمندگی کا کوئی نشان نہیں تھا۔ مجھے اس کی کمینگی کا احساس بڑی شدت سے ہُوا۔

اس نے دروازے کے قریب کھڑے کھڑے مجھ سے ہاتھ ملایا اور کندھے اچکا کر اور سینہ دبا کر بولا۔ "اب تو ملاقاتیں ہوتی رہیں گی ـــــ حنا جی۔"

مجھے کچھ جواب دینا چاہیے تھا لیکن میری طبیعت سخت بدمزہ ہو چکی تھی۔ بیزاری کا حملہ اتنا شدید تھا کہ شکیلہ کے جسم کی دلکشی بھی اس میں حائل نہیں تھی۔ مجھے اپنے وقت کے زیاں کا شدید احساس ہونے

لگا۔ اور میں دل ہی دل میں ان لوگوں کو کوسنے لگا۔

واپسی پر میں کار کو آہستہ آہستہ چلاتا رہا۔ مجھے اس بات کی خوشی تھی کہ کسی طویل الجھن کا شکار ہونے سے بچ گیا تھا۔ شکیلہ کا سحر ٹوٹ گیا تھا اور میں آزاد تھا شروع میں مجھے یہ خیال بھی نہ تھا کہ یہ سحر اتنا عارضی اور کمزور ثابت ہوگا اور خطرہ اتنی جلدی ٹل جائے گا۔ لیکن اب سر پر لٹکی ہوئی تلوار نظروں سے اوجھل تھی میں پورے ایک دن کی غلامی کے بعد آزاد ہوا تھا اور اب آزادی کی اہمیت کو پہلے سے بہتر طور پر جان گیا تھا۔

"کچھ لئے دیئے سے رہے تم۔ شائد تمہیں ملاقات کا لطف نہیں آیا۔" شکوہ نے کہا۔

"بھئی بڑے بور لوگ ہیں یہ۔ ساری شام خراب ہوگئی۔ تم نے بھی کن کن لوگوں سے دوستی پال رکھی ہے۔"

ہاں ——— ٹھیک کہتے ہو ——— ایک دوست وہ ہیں اور ایک تم۔"

اور ہم دونوں زور سے ہنسے۔

میں دیر سے قہقہہ لگانے کی شدید ضرورت محسوس کر رہا تھا اور اب جو موقعہ ملا تو میں نے اس سے پورا فائدہ اٹھایا۔ قہقہہ رکتے ہی شکوہ نے مجھے بڑی معنی خیز نظروں سے دیکھا۔ میں نے کہا۔ "عورت دلکش ہے لیکن سخت بے حس معلوم ہوتی ہے۔ چھترکی بنی ہے اور سخت اکتاہٹ پیدا کرتی ہے۔ آدمی بڑا خود غرض اور مکار ہے ——— معلوم نہیں تم انہیں کیسے برداشت کرتے ہو ——— ہاں، بچے ضرور پیارے ہیں ——— ماں پر ہیں سب کے سب، باپ سے کوئی اثر نہیں لیا ——— وہ برنارڈ شا والا لطیفہ سنا ہے نا تم نے؟ اگر یہ بچے باپ پر جاتے تو کیسے بدشکل ہو جاتے ——— پھر دونوں میں کئی تضادات ہیں۔ اگر یہ عورت بے حس نہ ہوتی تو ان دونوں کا اکٹھے رہنا ناممکن تھا۔"

"بھئی تم ٹھہرے ماہر نفسیات۔ اب تم سے کونسی بات چھپی رہ سکتی ہے۔"

"ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ مجھے پہلی ہی نظر میں اس کالے سڑیل آدمی سے نفرت ہوگئی تھی اور ثابت ہوگیا کہ یہ آدمی واقعی قابل نفرت ہے ——— جانتے ہو ایسا کیوں ہے؟"

"ہاں، اچھی طرح جانتا ہوں ——— ایسا اس لئے ہے کہ تمہیں شکیلہ سے پہلی نظر میں محبت جو ہو

گئی تھی۔

"بکتے ہو۔"

"ہا ہا ہا۔" شکوہ نے قہقہہ لگایا۔

میں بہت شرمندہ ہُوا۔ مجھے یہ خیال نہ تھا کہ بات اتنی جلدی کھل بھی جائے گی۔ میں نے اپنے آپ کو ٹٹولا۔ "جمیل کیا تجھے شکیلہ سے واقعی محبت ہے؟ کیا شکوہ واقعی ٹھیک کہتا ہے؟" ——— "نہیں، یہ غلط ہے، جذبات کا ایک طوفان تھا جو تھم گیا ہے۔ محبت یوں نہیں ہوتی اور ایسی نہیں ہوتی۔"

پھر میں نے اعتماد سے کہا۔ "تمہارے اس قہقہہ کے باوجود یہ سچ ہے کہ تمہارا خیال غلط ہے۔"

"میرا خیال غلط نہیں ہوسکتا ——— میں کسی رومانی اور روحانی اور افلاطونی محبت کا ذکر نہیں کر رہا تھا میں تو سیدھی سادھی جسمانی محبت کا ذکر کر رہا تھا اور تمہیں اس سے اسی قسم کی محبت ہوئی تھی۔"

"یہ سچ ہے۔" سچ بولنے میں ہی خیریت تھی۔ "یہ سچ ہے کہ میں نے یہ کشش محسوس کی تھی۔ لیکن وہ لہر گزر چکی ہے اور وہ کشش ختم ہو چکی ہے ——— کیا تم ان کی خرابیوں سے واقف نہیں ہو۔"

"اچھی طرح واقف ہوں۔"

"تم پھر بھی ان کے دوست ہو۔"

"یہ خرابیاں ہی تو میرے لئے دوستی کا جواز ہیں۔"

"یعنی؟"

"یعنی ——— پہلی بات تو یہ کہ دوستیاں دشمنیاں حادثوں کی طرح ہوتی ہیں، کبھی ہم چاہتے ہیں کہ دوستی قائم ہو جائے اور نہیں ہوتی اور کبھی چاہتے ہیں کہ کسی کو بھول جائیں اور نہیں بھول سکتے۔ پھر جس کو ہم ایک بار جان جائیں یہ ممکن ہی نہیں کہ ذہن اس کیفیت کو لوٹ جائے جو اس ملاقات سے پہلے قائم تھی یعنی حادثہ ہو جائے تو اس کے نہ ہونے کا احساس قائم نہیں ہوسکتا ——— دوسری بات یہ ہے کہ خرابیاں خامیاں تو سب میں ہوتی ہیں۔ اگر ہم ان خامیوں کو نظرانداز نہ کریں تو کسی سے بھی، یہاں تک کہ باپ سے

بھی تعلق قائم نہیں رہ سکتا ___ پھر مزاج کا فرق بھی ہوتا ہے۔ میرے لئے ان کی صحبت بیزار کن نہیں ہے، آدمی مکار ہے اور عورت بے حس، یہ ٹھیک ہے لیکن ان کی یہی خصوصیات مجھے پسند ہیں ___ اس آدمی نے بڑے جھگڑوں سے یہ شادی کی ہے۔ وہ اس کی عمزاد ہے۔ ایک روز اسے کسی طرح عدالت میں لے گیا اور شادی ہوگئی۔ ایسا نہ کرتا تو وہ کبھی یہ شادی نہ کر سکتا۔ شکیلہ کے باپ نے لڑکی پر پابندی لگادی اور سال بھر اسے گھر سے نہ نکلنے دیا۔ شکیلہ کو کوئی غم نہیں تھا وہ نصیحتوں اور ڈانٹ ڈپٹ کو سن کر بھی اسی طرح مسکرانے لگتی تھی جیسے کوئی گیت سن کر یا کسی نئے ملاقاتی سے مصافحہ کرکے۔ غم کی خبر سن کر بھی وہ وہی تاثر دیتی جو خوشی کی خبر سے پیدا ہوتا۔ اس نے نہ کبھی کسی کو برا کہا نہ بھلا۔ اس نے کلیم کے خلاف باپ کی غصیلی اور کڑوی باتیں بھی سنیں اور باپ کے خلاف کلیم کی بکواس بھی لیکن کچھ نہ کہا ___ شادی سے پہلے وہ معصوم، نرم دل اور ناتجربہ کار سمجھی جاتی تھی، اب عورتوں نے اسے سنگدل اور ظالم کہنا شروع کر دیا ___ لیکن اس میں کوئی بھی تبدیلی نہ ہوئی تھی۔ آخر باپ کو شکست قبول کرتے ہی بنی۔ گھر سے وداع ہوتے ہوئے نہ وہ روئی نہ اس نے قہقہے لگائے ___ سسرال میں بھی وہ ایسی ہی رہی جس نے جو چاہا کہا اس نے مسکرا کر سن لیا۔ کلیم کی اپنی ماں اور بڑے بھائی سے باپ کے چھوڑے ہوئے واحد مکان پر جھگڑا ہوا اور یہ الگ ہو گئے ___ اس کوارٹر کا کرایہ ڈیڑھ سو تھا۔ لیکن کلیم کی شکل دیکھ کر مالک نے کرایہ بڑھا دیا وہ ایسے آدمی کو یہاں نہیں رکھنا چاہتا تھا۔ کلیم نے شکیلہ کو بھیجا اور اب مکان پچاس روپے پر مل گیا ___ یہ گھر بہت بھاگوان ثابت ہوا۔ ان کی شادی کو تین برس ہو چکے تھے لیکن اولاد نہیں تھی۔ یہاں آکر ان کے ہاں ہر سال ایک لڑکا پیدا ہوا اور ہر لڑکا چاند کا ٹکڑا۔"

"یہ آدمی کام کیا کرتا ہے؟"

"تم نے کارڈ غور سے نہیں پڑھا شاید! وہ کوئی درجن بھر اداروں کا صدر یا سیکرٹری ہے چندے بٹورنے کا فن جانتا ہے اور ہماری پبلک ایسی ہے کہ اگر کوئی اسے بیوقوف بنانے کی اہلیت رکھتا ہو تو وہ اسے کبھی مایوس نہیں کرتی۔"

"تو کیا کوئی اسے پوچھنے والا نہیں ہے؟"

"ہے، لیکن یہ کوئی پریشانی کی بات نہیں۔ اول تو پیسے سے کام بن جاتا ہے اور کوئی صورت نہ ہو تو شکیلہ کے ذریعے معاملات ٹھیک ہو جاتے ہیں۔"

اس رات میں سونے سے پہلے دیر تک سوچتا رہا کہ وہ لوگ کہاں رہتے ہیں جن کی تعریف آسمانی کتابوں میں آئی ہے!

صبح میرا ذہن صاف تھا۔ میں اپنے رویے پر مطمئن تھا۔ میں پہلے بھی کئی بار بڑی بڑی نازک صورتحال سے بچ نکلا تھا اور بچ نکلنے کے بعد یہ واقعات ایک خواب کی حیثیت اختیار کر جاتے رہے۔ اور اب بھی میں مطمئن تھا جو کچھ ہو چکا تھا وہ ایک بیہودہ خواب کے سوا کچھ نہیں تھا۔

دفتر میں کام کرتے ہوئے میرے ذہن پر کوئی بوجھ نہیں تھا ___ لیکن دفتر سے فارغ ہو کر میں کار میں بیٹھا ہی تھا کہ مجھے شکیلہ کا خیال آیا۔ گزشتہ شب کی کہانی ایک نئے اور لمبے سفر کی طرح دلچسپ معلوم ہونے لگی اور مجھے معلوم ہو گیا کہ کسی کو جاننے کے بعد اسے نہ جاننے اور اس سے تعلق نہ رکھنے کا دعویٰ کرنا اور دیکھنے کے بعد یہ سمجھنا کہ وہ ذہن سے نکل بھی سکتا ہے احمقانہ خیال ہے۔ لیکن میں اب بھی شکیلہ سے نہ ملنے کے ارادے پر قائم تھا مگر یہ بھولا ہوا تھا کہ ایک خواہش اس ارادے پر سوار ہے اور ارادہ شکیلہ سے ملاقات کا جواز تلاش کر رہا تھا۔

میں نے شکیلہ کی کشش کا غلط اندازہ کیا تھا۔

اور جلد ہی میری کار اس کے کوارٹر کے سامنے جا رکی۔

شکوہ پہلے سے وہاں موجود تھا۔

"تمہیں آج کہاں کہاں ڈھونڈنا پڑا ہے۔" میں نے شکوہ سے کہا۔ "آخر خیال آیا کہ تم شاید یہاں مل گئے۔" غرض اور ہوس جھوٹ بولنا سکھا دیتے ہیں۔

شکوہ مسکرا دیا اور مجھے معنی خیز نظروں سے دیکھنے لگا۔ وہ بہت ہوشیار تھا اور جانتا تھا کہ میں جھوٹ بول رہا تھا اور دراصل شکیلہ سے ملنے کا جواز ڈھونڈ رہا تھا۔

میں نے شکیلہ کے ہاتھوں کی بنی ہوئی چائے پی ـــــ اس کے بچوں کو پیار کیا حالانکہ میں عام طور سے بچوں سے دور رہتا ہوں۔ میں نے اس کے تینوں بچوں کو دس دس روپے دیئے۔ "یہ بچوں کی مٹھائی کے لئے ہیں۔ میں خالی ہاتھ چلا آیا تھا۔ اس روز تو آپ ان کو ساتھ ہی نہیں لائی تھیں ـــــ کتنے پیارے بچے ہیں آپ کے۔ بالکل آپ پر ہیں۔"

شکیلہ مسکراتی رہی اور میرے ذہن میں کئی پرانی کہاوتیں گھومنے لگیں۔

لیلیٰ سے پیار کرنا ہے تو اس کے کتّے سے بھی پیار کرو۔

مجھے چاہو تو میرے بچوں کو بھی چاہو۔

عشق اور جنگ میں سب کچھ روا ہے۔

"آپ نے کمرے کی سجاوٹ میں اعلیٰ ذوق کا ثبوت دیا ہے۔" میں شکیلہ سے بے تکلف ہونا چاہتا تھا وہ صرف مسکرادی۔

اُدھر شکوہ بھی معنی خیز انداز سے مسکرائے جارہا تھا۔ بولا۔ "ان کے ذوق کی کیا بات ہے۔"

میں نے اس کو نظرانداز کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ میں شکیلہ سے ہمکلام رہا۔ "ایک عجیب بات سنیئے میں نے مشاعرے والی رات آپ کو دیکھا تو محسوس کیا جیسے میں آپ کو مل چکا ہوں۔ آپ کا کیا خیال ہے۔"

"جی ـــــ یاد نہیں آتا۔"

"مجھے بھی یاد نہیں آرہا تھا ـــــ بہت دیر سے یاد آیا۔ آپ سے میری ملاقات ایک کتاب میں ہوئی تھی۔ ایک شاعر کے ذریعے۔"

"جی! کتاب میں؟" اُس نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے سوالیہ انداز میں کہا۔

"ہاں ـــــ شاعروں نے آپ کے بارے میں بہت کچھ لکھا ہے۔"

"اوہ!"

"مثلاً ایک شاعر نے کہا ہے۔

سائے کی طرح ساتھ چلیں سرو و صنوبر ، تو اس قدِ دلکش سے جو گلزار میں آوے

شکوہ کے ایک بلند قہقہے نے مجھے بتایا کہ میں بھی براؤننگ کی نظم والے خوشامدی عاشقوں کی صف میں کھڑا ہوں۔

قربت بہت سی چیزوں کے حسن کو ختم کر دیتی ہے۔ شکیلہ کی شخصیت کا مجموعی تاثر بھی اسی قسم کا تھا۔ اس کا مردہ پن بیزاری کا احساس پیدا کرنے لگا۔ اس کا قرب وقفوں سے جسم کو ضرور جھنجوڑتا تھا۔ میں آنکھیں بند کرتا یا رُخ پھیرتا تو جی چاہتا کہ اس کو دیکھوں اور اُسے دیکھنے لگتا اور اس سے باتیں کرتا تو جی چاہتا کہ یہاں سے بھاگ جاؤں۔ اس لئے بھی کہ وہ بیزاری کا احساس پیدا کرتی تھی اور اس لئے بھی کہ اس کا بدن آدمخور پودے کی خاصیت رکھتا تھا۔

یہ بہت اچھا ہوا کہ ہماری ملاقات تنہائی میں نہیں ہوئی اور میں بخیر و عافیت واپس آ گیا۔

"میں تمہاری ذہنی کیفیت کو سمجھتا ہوں۔" شکوہ نے کہا۔ "لیکن یاد رکھو یہ عورت زلیخا نہیں ہے۔ تمہارے معیار پر یہ عورت پوری نہیں اتر سکتی۔ اس کی خاطر تمہیں اپنی بلند مسند اور ضابطوں کو ترک کرنا پڑے گا۔ تم نیچے اترو گے وہ اوپر نہیں اٹھے گی ورنہ تمہارا اس سے کوئی تعلق نہیں ہو سکتا۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو۔" میں نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

میرے ذہن میں موسیٰ پر نازل ہونے والے احکامات خداوندی میں سے ساتویں حکم کی عبارت گھوم رہی تھی:

"مردوں کو چاہیئے کہ وہ دوسرے مردوں کی عورتوں کو حاصل کرنے کی کوشش نہ کریں۔"

سونے سے پہلے میں نے ذہن کو اچھی طرح صاف کر لیا تھا اس لئے صبح بیدار ہوا تو دماغ پر کوئی بوجھ نہیں تھا۔

ناشتہ کی میز پر شکوہ نے بتایا کہ وہ باقی دو دن شکیلہ کے ہاں رہے گا۔

"نہیں ـــــ تم یہیں میرے پاس رہو گے۔"

"وہ بھی میرے دوست ہیں۔ ان کا بھی مجھ پر حق ہے۔"

"تم جھوٹ بول رہے ہو۔ میں جانتا ہوں تم وہاں کیوں جا رہے ہو۔"

"واقعی؟"

"ہاں، اب ہم دونوں ننگے ہو چکے ہیں لیکن اب بھی وقت ہے ہمیں لباس پہن لینا چاہیئے۔"

"آنکھوں کے پردے سب سے اچھا لباس ہیں۔ آنکھیں بند کرلو۔"

"تم وہاں نہیں جاؤ گے ـــــ میں اپنے ساتھ تمہیں بھی لباس پہناؤں گا۔ تمہیں تباہ نہیں ہونے دوں گا۔"

"میں نہیں رک سکتا۔"

"یہ کہاں کی دوستی ہے۔"

"دوستیاں دشمنیاں حادثوں کی طرح ہوتی ہیں۔ آج ہیں کل نہیں ہیں جس دوستی سے کچھ حاصل نہ ہو اسے ترک کرنا ہی بہتر۔ میرے لئے دوستی بغیر مقصد کے کوئی معنی نہیں رکھتی تم سے میری دوستی کا بھی کوئی مقصد ہے مثلاً یہی کہ میں تمہارے پاس ٹھہرا رہا ہوں۔"

"اور طوری اور شکیلہ کیا مقصد ہے تمہارا؟"

"تم سمجھتے ہو۔ ٹھیک سمجھتے ہو۔ شکیلہ یہاں نہ ہوتی تو شاید میں نہ آتا۔"

"تم بہت ذلیل ہو، تم شیطان ہو، شیطان۔"

"تو کیا تم اسے پوچھنے کے لئے گئے تھے؛ ذرا اپنے گریبان میں تو جھانکو!"

"میں بھٹک گیا تھا لیکن میں نے گناہ کی اسیری قبول نہیں کی ـــــ میں تمہیں بھی ذلت سے بچانا چاہتا ہوں۔"

"جسے تم ذلت کہتے ہو میرے لئے وہ سرخروئی ہے ـــ تم ابھی اپنے آپ میں بند ہو اور ایک اندھی گلی میں رہتے ہو۔ سامنے جو دیوار ہے اسے توڑ دو۔ کیونکہ اس کے دوسری جانب جنت ہے۔"

"لیکن تمہارا ضمیر؟ ـــ کیا وہ مر چکا ہے؟ ـــ اوہ ـــ یہ بڑی خوفناک صورتِ حال ہے۔ اگلے سال تم آؤ گے تو مجھے بتاؤ گے کہ یہ گھر بڑا بھاگوان ہے اس میں ان کے ہاں چوتھا بچہ بھی پیدا ہوگیا ہے ـــ اوہ! ـــ تم کبھی مطمئن نہیں رہ سکو گے۔ یہ گناہ تمہیں جیتے جی مار ڈالے گا۔"

شکوہ نے ایک قہقہہ لگایا "بچے ہو ضمیر میرے قابو میں ہے۔ یہ جو کراچی اور حیدرآباد میں میرے کئی بچے دوسرے پل رہے ہیں تو ان کی وجہ سے نہ میں پریشان ہوں نہ میرا ضمیر بے چین ہے تم ناحق خوفزدہ ہو۔"

"اچھا اجازت، خدا حافظ" ناشتے سے فارغ ہو کر اس نے کہا اور مصافحے کے لئے ہاتھ آگے بڑھایا لیکن میرا ہاتھ بے حس ہو چکا تھا۔

"ارے اتنے ناراض کیوں ہو۔ ہاتھ تو ملاؤ" اس نے کہا اور مجھ سے زبردستی ہاتھ ملا کر رخصت ہوگیا۔

میں نے اپنے ذہن میں جھانکا۔ دلیلوں کا ترکش خالی پڑا تھا۔

△

ایک برس گزر گیا۔

میں اس واقعہ کے ناگوار اثرات سے بالکل آزاد ہو چکا تھا۔

پھر وہ شام آئی جو سب شاموں سے مختلف تھی۔

گھنٹی بجی۔ ملازم نے ملاقاتی کو ڈرائنگ روم میں بٹھا کر مجھے اطلاع دی کہ کوئی خاتون ہے۔ مجھے اس کو پہچاننے میں کوئی دیر نہ لگی۔ وہ شکیلہ تھی۔

مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔

"اوہ، آپ؟"

"جی" وہ مسکرائی۔

سارا کمرہ زہر سے بھر گیا۔

میں نے اپنے آپ سے کہا "مجھے اس سے نفرت ہے، سخت نفرت۔"

میں چاہتا تھا وہ یہاں سے جلد چلی جائے۔ چائے آگئی۔ میں نے پوچھا "کہیئے کیسے آنا ہوا؟"

"جی ـــ وہ معلوم ہوا تھا کہ آپ کی فرم سماجی بہبود کے اداروں کو کچھ عطیات دیتی ہے" اس کی آواز بڑی دلکش تھی۔ اس نے پہلی بار اتنا لمبا فقرہ کہا تھا۔ جی چاہا وہ اور بولے۔

"جی ہاں ـــ یہ بھی اشتہار بازی کی ایک صورت ہے۔ کیا کیا جائے۔ زمانے کے ساتھ جو چلنا ہوا!"

میں بول رہا تھا لیکن یہ میری آواز نہیں معلوم ہوتی تھی۔ اس آواز میں کوئی اور آواز بھی شامل تھی۔ لیکن کمرے میں ہم دونوں کے سوا کوئی نہیں تھا۔

"یہاں ہم دونوں کے سوا کوئی نہیں ـــــ کوئی نہیں ـــ کوئی نہیں"۔

میں نے سر کو دو جھٹکے دیئے اور گفتگو کا موضوع بدلنے کی کوشش میں ایک عجیب سا سوال کر دیا۔

"آپ کے بچے کیسے ہیں؟ اب کتنے ہیں"۔

"جی چار ہیں، سب ٹھیک ہیں"۔

اور شکوہ میرے ذہن میں ابھرا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "یہ گھر بڑا بھاگوان ہے"۔

مجھے شکوہ کی خود غرضی اور ذلت پر بڑا دکھ ہو رہا تھا۔ اس نے ایک معصوم عورت کی سادگی اور ناسمجھی سے ناجائز فائدہ اٹھایا تھا۔ اس پر ظلم کیا تھا۔ میں نے سوچا میں شکیلہ کو اس ظلم کی نوعیت سے آگاہ کروں گا

"میرے شوہر کئی سماجی اداروں کے سربراہ ہیں"۔ اس نے کہا۔ "انہوں نے بہت کام کیا ہے میں ان کی سفارش کرنے آئی ہوں"۔

"کتنی سادہ ہے یہ عورت"۔ میں نے سوچا۔ "کلیم کی ہر بات مان لیتی ہے۔ اس کا ضابطہ اخلاق کوئی نہیں ہے۔ یہ معاملات کی نوعیت کو نہیں سمجھتی۔ اسے نہ اپنی بے بسی کا احساس ہے۔ نہ مظلومیت کا۔۔۔ اس کی کوئی مرضی نہیں ـــــ یہ بدل کیوں نہیں جاتی؟ کلیم ایسے بے حیا کو قتل کیوں نہیں کر دیتی۔ اپنے مالک مکان اور شکوہ پر مقدمہ کیوں دائر نہیں کرتی؟ مگر یہ تو خوش ہے۔ اسے کوئی دکھ نہیں۔ یہ میرے سامنے بیٹھی مسکرا رہی ہے۔ اس کا یہ پھول سا چہرہ ـــــ اور یہ تیز دھار تلوار سا جسم ـــــ"

"شیطان ـــــ یہ عورت نہیں شیطان ہے۔ اس سے دور رہنا ضروری ہے"۔ میں نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ میں اُٹھ کر دروازے کی طرف بڑھا۔ تاکہ کمرے سے باہر نکل کر کھلی ہوا میں سانس لوں لیکن میں باہر کیسے جاتا جبکہ وہاں کوئی دروازہ تھا نہ دیوار، ہر جانب سرسبز و شاداب اور وسیع کائنات پھیلی تھی۔ یہ وہ دنیا تھی جسے آدم اور حوا نے پہلی بار دیکھا تھا۔ یہاں میز کرسیاں قالین کچھ نہیں تھا۔ سبزے کا فرش تھا اور آسمان کی چھت اور آزاد کھلی فضا ـــــ جس میں جمیل نام کا کوئی آدمی نہیں تھا۔ دو سائے ہاتھ میں ہاتھ دیئے

میری نظروں کے سامنے دور چلے جا رہے تھے اور جلد ہی سامنے درختوں کے ایک جھنڈ میں غائب ہو گئے۔

میں نے یہ سوچتے ہوئے آنکھیں کھولیں کہ یہ ایک نیا خواب تھا۔ لیکن یہ خواب نہیں تھا میرے کمرے کے فرش پر بچھا ہوا قالین نئی زندگی کی بشارت دے رہا تھا۔

رخصت ہوتے ہوئے میں نے اپنی کمپنی کی طرف سے پانچ ہزار کے عطیہ کا چیک شکیلہ کو دیا۔ میں نے اس کی طرف ڈرتے ڈرتے دیکھا۔ وہ مسکرا رہی تھی۔

"ملتی رہیئے گا"۔ میں نے کہا۔

اور اس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ اس کے سارے چہرے پر پھیل گئی۔

اس واقعے کو ایک ہفتہ گزر گیا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ میں بدل گیا ہوں، ذہن میں نئے سوال ابھر رہے ہیں۔ زلیخا کی تصویر دھندلا گئی ہے ـــــ یہ شام دوسری تمام شاموں سے کتنی مختلف تھی ـــــ اس شام نے تمام امتیازات ختم کر دیئے ہیں۔ شکوہ، شکیلہ، کلیم، ان کا مالک مکان جمیل۔ ان میں اب کوئی فرق نظر نہیں آتا سب ایک ہی راستے پر رواں ہیں۔ ان کے سفر کی نوعیت ایک سی ہے۔ وہ سب ایک سے ہیں۔ صرف نام مختلف ہیں!!!

اور اگلے برس میں خود لوگوں کو بتاؤں گا کہ یہ گھر بڑا بھاگوان ہے!

△


تکمیل
کا
زخم

اگر میں وہ نہ ہوتا جو کہ ہوں تو میری زندگی بالکل مختلف ہوتی۔

میں ایسی باتیں کیوں سوچتا ہوں جو فیروز نہیں سوچتا۔ ایک ہی دنیا میں رہتے ہوئے اس کے اور میرے راستے الگ الگ کیوں ہیں؟ اس سوال کا بھی کوئی جواب نہیں ملتا۔ سوائے اس کے کہ میں فیروز نہیں ہوں اور یہ جواب کسی طرح بھی اطمینان بخش نہیں ہے۔ ساتھ ہی یہ جواب اور دشوار تر سوالات پیدا کرتا ہے اور میں جاننا چاہتا ہوں کہ میں فیروز کیوں نہیں ہوں۔ اور اگر فیروز ایک لمحے کے توقف کے بغیر وطن سے ہزاروں میل دور جانے کا فیصلہ کر لیتا ہے تو میں کیوں نہیں کر سکتا؟ اس شہر اور سڑک نے آرام و سکون نام کی کوئی چیز بھی تو مجھے نہیں دی۔ پھر بھی میں اسے کیوں نہیں چھوڑ سکتا؟ اور ان سوالوں کا بھی وہی مبہم جواب ہے کہ میں فیروز نہیں ہوں اور یہ جواب پھر دشوار تر سوالات پیدا کرتا ہے اور میں جاننا چاہتا ہوں کہ میں فیروز کیوں نہیں ہوں ـــــ اور اب میرے پاؤں اس دائرے کی قید میں ہیں۔ میں اس دائرے پر ایک طویل مدت سے چل رہا ہوں۔ یہ دائرہ اب سطح زمین پر کھینچی ہوئی ایک لکیر نہیں بلکہ ایک گول خندق ہے۔ میں آنکھیں بند کر کے بھی چلوں تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔

یہ پہاڑیاں جو میرے لئے زنجیر بن گئی ہیں بظاہر ویسی ہی ہیں جیسی کہ پہلے ہوا کرتی تھیں۔ لیکن

ان میں ایک ایسی تبدیلی آچکی ہے جو بیان نہیں ہو سکتی۔ فیروز واقعی بہت حوصلے والا آدمی تھا۔ میں شاید اتنا ہی کم حوصلہ ہوں۔!

فیروز سے میری ملاقات یہیں ڈاکخانے سے پنڈی پوائنٹ کی طرف جانے والی سڑک پر کسی ہوٹل میں ہوئی تھی۔ بہت معمولی واقعہ تھا۔ بارش کی اچانک آمد کی وجہ سے سڑک پر چلنے والے لوگ دکانوں اور ہوٹلوں میں پناہ لینے کو جمع ہو گئے تھے۔ ایسا ہر روز بلکہ بعض اوقات تو دن میں کئی کئی بار ہو جاتا تھا۔ بڑی عام اور معمولی بات تھی۔

میں بارش کی آمد سے پہلے ہی اس ہوٹل میں بیٹھا تھا جس میں بارش شروع ہوتے ہی فیروز ایک خوبصورت لڑکی کا ہاتھ تھامے داخل ہوا تھا۔ اس وقت صرف وہی دو کرسیاں خالی تھیں جو میری میز کے ساتھ رکھی تھیں اور وہ بڑی بے تکلفی سے اس پر آ بیٹھے تھے۔ یہ بھی ایک عام اور معمولی واقعہ تھا۔ اس کے بعد فیروز سے چند اور ملاقاتیں ہوئیں اور ہم ایک دوسرے سے کچھ بے تکلف ہو گئے لیکن یہ سب باتیں بھی بالکل معمولی تھیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ یہی معمولی باتیں اور واقعات میری زندگی کے اہم ترین واقعات بن گئے ہیں اور بعض بڑے بڑے واقعات ایسے ہیں جن سے میں نے بظاہر کوئی اثر نہیں لیا مثلاً اس بات کو لیجئے کہ میرا باپ عین اس وقت مر گیا جب مجھے اس کی سخت ضرورت تھی اور ماں میرا ساتھ دینے کی بجائے چند ہی روز بعد مجھے اس دنیا میں بالکل تنہا چھوڑ گئی لیکن میں زندہ رہا اور میری پرورش بھی ہو گئی اور تعلیم بھی۔

عجیب باتیں اور بھی بہت سی ہیں۔ ابھی جب میں آنکھیں بند کئے اپنی کرسی میں بیٹھا سامنے سڑک کی طرف دیکھ رہا تھا جہاں زندہ جیتے جاگتے رنگوں کا ایک سیلاب اوپر ڈاکخانے سے نیچے کی طرف اور نیچے سے اوپر ڈاکخانے کی طرف رواں تھا تو شام تھی اور اب آنکھیں کھول دی ہیں تو صبح کا سورج کتنا بلند نظر آرہا ہے۔ شام کتنی خوشگوار اور آباد تھی اور صبح کتنی بے رنگ اور بے رونق ہے اور منظر کی تبدیلی میرے لئے کیسی عذاب انگیز ہے لیکن میں بے بس ہوں اور میں اس عذاب سے ہمیشہ کے لئے باندھ دیا گیا ہوں۔ میں پوری طرح محسوس نہیں کر سکتا لیکن صبح کے عقاب کی تیز چونچ کو اپنے جگر میں پیوست محسوس کر سکتا

ہوں۔ نظر نہ آنے والی زنجیروں سے مجھے ان پہاڑیوں کے درمیان اس خوفناک سڑک کے کنارے پر باندھ دیا گیا ہے حالانکہ میرا اس شہر سے کوئی تعلق تھا نہ اس سڑک سے۔ میں تو یہاں صرف ایک موسم گزارنے آیا تھا۔ میں نظر نہ آنے والی تمام زنجیروں کو توڑ کر یہاں سے بھاگنا چاہتا ہوں لیکن یہ فیصلہ نہیں کر سکتا کہ کیا میں واقعی ایسا چاہتا بھی ہوں یا نہیں۔ میں ایسا کیوں ہوں۔ جیسا کہ ہوں اور ویسا کیوں نہیں جیسا کہ فیروز تھا؟ یہ ایک دائرہ ہے حلقہ در حلقہ۔ ایک زنجیر ہے جسے میں نہ توڑ سکتا ہوں۔ نہ شاید توڑنا چاہتا ہوں۔ میں کیا چاہتا ہوں، میں کیا نہیں چاہتا، سب کچھ گڈمڈ ہو گیا ہے۔ صبح کے بلند ہوتے ہوئے سورج کی تیز روشنی میں بھی جسے چیزیں صاف صاف دکھائی نہ دیں اور جسے دکھائی نہ دینے والی چیزوں کے وجود کا احساس ہمیشہ پریشان رکھے۔ اس کے لئے وہ زندگی کا کونسا لمحہ ہوگا جو عذاب سے کم نہیں ہوگا!

سڑک کا یہ چھوٹا سا ٹکڑا ایسا تھا جہاں سے اس شہر میں سیر و تفریح کی غرض سے آنے والا ہر شخص کئی بار گزرتا تھا۔ آتے جاتے کسی نہ کسی سے علیک سلیک قدرتی اور ضروری بات تھی فیروز بھی اکثر مجھے اس سڑک پر ملتا رہا۔ ہاتھ بلند ہو کر ماتھے تک جاتے۔ دونوں طرف سے مسکراہٹوں کا تبادلہ ہوتا اور وہ اپنے ساتھ چلتی ہوئی لڑکی کا ہاتھ تھامے رنگوں کے سیلاب میں گم ہو جاتا۔ لیکن اس کی گمشدگی ہمیشہ عارضی ہوتی۔ اگلی شام وہ اس سمندر سے پھر ظاہر ہوتا اور پھر ڈوب جاتا اور مجھے کتابوں میں پڑھی ہوئی سمندری دیوی دیوتاؤں کی بہت سی کہانیاں سچ معلوم ہونے لگتیں۔ ایک ماہ کے عرصہ میں میں نے اسے کم از کم سات نئی اور خوبصورت لڑکیوں کے ساتھ دیکھا۔ بات یہ بھی بڑی معمولی تھی اور مجھے اسے اہمیت نہیں دینا چاہیئے تھی لیکن حقائق کو ایک بار جان لیا جائے تو ان کے بارے میں انجان اور اجنبی نہیں بنا جا سکتا۔

بارش کئی بار ہماری ملاقات کا ذریعہ بنی۔ ایسے ہی ایک موقعے پر جب بارش اچانک آگئی تھی ہم دونوں ایک ساتھ ایک ہوٹل میں پناہ لینے کے لئے داخل ہوئے اور جب تک بارش نہ تھمی ہم اکٹھے بیٹھ کر کافی پیتے اور باتیں کرتے رہے۔ اس روز وہ تنہا تھا۔ پہلی بات اس نے کی تھی۔ تکلف اس نے کبھی نہیں کیا تھا۔

"تم سے ملاقات بارش ہی میں ہوتی ہے۔"

"الٰہی یہ گھٹا دو دن تو برسے۔"

اور ہم دونوں زور سے ہنسنے لگے۔

"فیروز آج تم اکیلے ہو۔"

"نہیں فیروز اکیلا نہیں ہو سکتا۔ بارش کے تھمتے ہی وہ بھی پہنچ جائے گی۔ آج یہیں ملاقات طے ہے ـــــ میں تو اکیلے پن کے بارے میں کبھی سوچتا بھی نہیں ـــــ تمہارے بارے میں ضرور کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ تم یہاں کیا لینے آتے ہو۔"

"سب لوگ ایک سے نہیں ہوتے۔"

"ہاں سب لوگ ایک سے نہیں ہوتے لیکن سب لوگوں کی خواہشات ضرور ایک سی ہوتی ہیں۔"

"یہ شخص تو مجھے ہر طرح احساس کمتری میں مبتلا کر دینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔" میں نے دل میں سوچا۔ لیکن میں اس سے بہت سی باتیں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے کہا "تم یہ کیوں کر برداشت کر لیتے ہو کہ دو چار دن کے بعد اپنا ساتھی بدل لیتے ہو؟"

"اس کا جواب تو تم خود دے چکے ہو کہ سب لوگ ایک سے نہیں ہوتے۔"

"بڑے ظالم ہو فیروز۔"

"نہیں میں ظالم نہیں ہوں۔ میں تو بہت مہربان اور محبت کرنے والا ہوں۔ میرا کام تو خوشیاں سمیٹنا اور مسرتیں بانٹنا ہے۔ چاہو تو تحقیق کر لو۔"

"لیکن .... لیکن وہ لڑکیاں جنہیں تم خراب کر کے چھوڑ دیتے ہو .... کیا انہیں کوئی دکھ نہیں ہوتا اور کیا یہ حقیقت تمہارے لئے دکھ کا سبب نہیں بنتی؟"

"ناتجربہ کار ہو۔" اس نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا "وہ لڑکیاں بھی میری طرح خوشیاں سمیٹتیں اور مسرتیں بانٹتی پھرتی ہیں۔ ہم الگ ہوتے ہیں تو دھوکے کا کوئی احساس ہمارے ساتھ نہیں ہوتا اور الگ

ہونے کے چند روز بعد یاد بھی نہیں رہتا کہ کون کہاں ملا تھا اور کہاں اور کب بچھڑ گیا۔ ان ملاقاتوں کے بعض پہلو ضرور کسی ادا کی بنا پر دیر تک یاد رہتے ہیں۔ مثلاً یہ لڑکی جو آج مجھے یہاں ملنے کے لئے آ رہی ہے جس کا نام نیلم ہے اور جس کی آنکھیں بیحد نیلی ہیں اور پیاری ہیں اور جو بہت دلکش شخصیت کی مالک ہے اور جو دوسری بہت سی لڑکیوں سے اس لئے بھی مختلف ہے کہ جسم کے ساتھ ساتھ اس کا ذہن بھی زندہ ہے۔ شاید یہ مجھے دوسری لڑکیوں سے زیادہ دیر تک یاد رہے گی لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس سے ملاقات کو ابھی چند ہی روز ہوئے ہیں۔ خلافِ توقع ابھی تک اسے شیشے میں نہیں اتار سکا ہوں۔ کچھ تم سے ملتی جلتی ہے۔ آرٹ کی دلدادہ ہے۔ تم نے جو دو تصویریں اپنے ہاتھ کی بنی ہوئی مجھے دی تھیں اور جو میرے کمرے میں ٹنگی ہوئی تھیں اب اس کے ڈرائنگ روم کی زینت ہیں۔ اور سنو میں نے اس سے کیسا دلچسپ جھوٹ بولا ہے۔ میں نے اسے بتا رکھا ہے کہ یہ تصویریں میں نے بنائی ہیں۔ جانتا ہوں اسے معلوم ہو چکا ہے کہ میں نے یہ جھوٹ بولا تھا۔ لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ میری ملاقاتوں میں عام طور سے نام اہم نہیں ہوتے۔ کبھی کبھار ہی نام اہمیت اختیار کرتے ہیں۔ ایک بار ایک لڑکی کے ساتھ جب میں بہت دور تک نکل گیا۔ تو میں نے اس سے پوچھا تمہارا نام کیا ہے اور جب اس نے مجھے بتایا کہ اسے رجو کہتے ہیں تو مجھے بڑا صدمہ ہوا اور میری محبت ختم ہو گئی۔ میں نے خود کو بڑی مشکل سے سمجھایا کہ نام میں کچھ نہیں رکھا لیکن اگلے دن میرے ساتھ ایک اور لڑکی تھی ـــــ ایسے واقعات بہت کم ہیں ـــــ ورنہ نام عام طور سے نہ میں پوچھتا ہوں اور نہ ہی مجھے یاد رہتا ہے۔ میری محبت بڑی شدید ہوتی ہے اور اتنا وقت نہیں دیتی کہ ہم ایک دوسرے کا نام دریافت کریں۔ پھر یہ بھی ہے کہ کتنی ہی لڑکیوں کے نام میں نے پوچھے اور بھلا دیئے کچھ ایسی بھی تھیں جنہوں نے اپنے اصل نام نہیں بتائے اور کئی ایسی تھیں جن کو میں نے اپنا اصل نام نہیں بتایا اور کسی بھی بات سے کوئی فرق نہیں پڑا۔"

میں اس وقت تک نیلم سے نہیں ملا تھا۔ مجھے اس صورت حال سے دکھ ہو رہا تھا۔ نیلم ذہین تھی خوبصورت تھی۔ اسے مصوری سے محبت تھی اور فیروز خود غرض اور ظالم آدمی تھا۔ وہ بہت کمینہ تھا۔ وہ

ہر طرح کا جھوٹ بول سکتا تھا۔ اس نے میری بنائی ہوئی تصویروں کو ذاتی غرض پر قربان کر دیا تھا
مَیں اس سے لڑنا چاہتا تھا۔ اسے گالیاں دینا چاہتا تھا ـــــ لیکن اس وقت ایک لڑکی ہوٹل میں داخل ہوئی۔ مَیں نے اسے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ لیکن اسے مَیں فوراً پہچان گیا...... وہ نیلم تھی۔

مَیں سوچ رہا تھا فیروز نہ جانے اور کیا کیا جھوٹ بولے گا۔ اس لئے مَیں نے فوراً اپنا تعارف کروا دیا۔

"مجھے منصور کہتے ہیں ـــــ تصویریں بناتا ہوں۔"

بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔ آپ کی دو تصویریں میرے ڈرائنگ روم کا حسین اور قیمتی سرمایہ ہیں۔ فیروز ان کی قدر و قیمت سے واقف نہیں۔ آپ خوش ہوں گے کہ آپ کی تصویریں اب ایک قدردان کے پاس ہیں۔"

فیروز مسکراتا رہا۔ اس کی مسکراہٹ بڑی دلفریب، بڑی خود غرضانہ، بڑی کمینی لیکن بڑی دلکش اور خوبصورت تھی۔

پھر وہ دونوں مجھ سے الگ ہو کر ہوٹل سے باہر نکل گئے اور مَیں زندگی میں پہلی بار ایک لڑکی کا پیچھا کرنے کے ارادے سے جیسے بے بس ہو کر سڑک کی طرف بھاگ کھڑا ہُوا۔

سڑک پر زندہ رنگوں کا سیلاب رواں دواں تھا۔ جس میں فیروز اور نیلم کہیں گم ہو گئے تھے، اور مَیں واپس ہوٹل میں آگیا۔

مَیں سڑکوں پر پہلے بھی گھومتا تھا لیکن مجھے کسی خاص شخص کی تلاش نہیں ہُوا کرتی تھی۔ اب یہ صورت نہیں تھی۔ اب مجھے نیلم کو دیکھنے اور اس سے ملنے کی آرزو رہنے لگی تھی۔ اگلے ایک ہفتے میں میرا ان کا دو ایک بار آمنا سامنا ہُوا۔ لیکن ملاقات علیک سلیک پر ہی ختم ہو جاتی رہی۔

اور پھر جب وہ اچانک غائب ہو گئے اور کئی ہفتوں تک نظر نہ آئے تو میں فیروز کی قیام گاہ کی تلاش میں نکل کھڑا ہُوا۔ میں اپنے آپ سے بہت شرمندہ تھا لیکن میں مجبور تھا۔ مجھے پتہ چلا کہ فیروز تو

کب کا کراچی جا چکا ہے اور شاید وہاں سے یورپ کے لئے روانہ بھی ہو چکا ہو گا۔

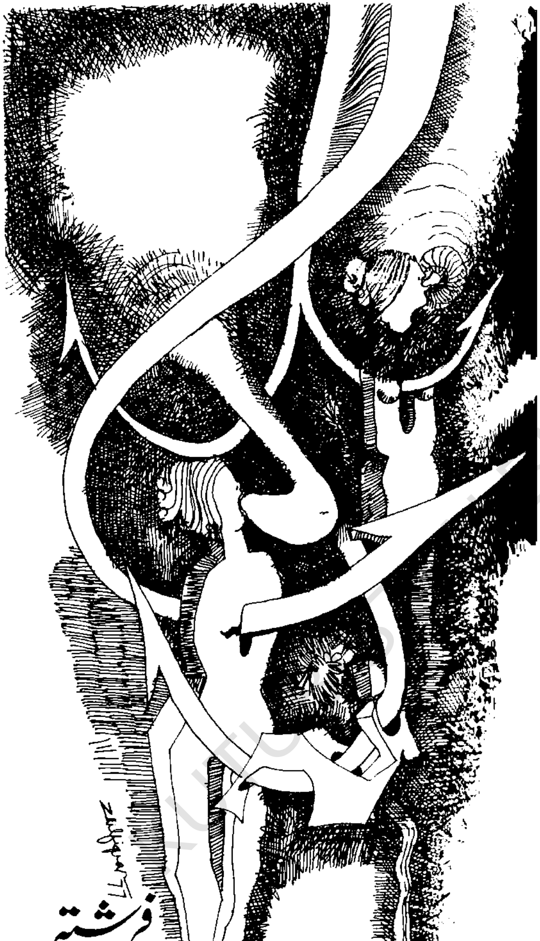
مجھے پہلے تو اس بات پر خوشی ہوئی کہ فیروز چلا گیا لیکن پھر اس خیال سے دکھ ہُوا کہ یقیناً نیلم بھی اس کے ساتھ چلی گئی ہو گی۔

اس گھر کے مالی نے میرے استفسار پر مجھے نیلم کے گھر کا پتہ دیا اور بتایا کہ نیلم یہیں ہے اور کہا یہ جاتا ہے کہ وہ پاگل ہو گئی ہے۔

فاصلوں اور راستوں کی سب دشواریاں ختم ہو چکی تھیں۔ مَیں نے نیلم سے پوچھا "لوگ کیا کہتے ہیں؟ کیوں کہتے ہیں کہ تم پاگل ہو گئی ہو؟ اگر تمہیں فیروز کے جانے کا غم ہے تو سنو، فیروز انسان نہیں حیوان ہے۔"

اس نے جس مسکراہٹ سے میرا استقبال کیا تھا اسی مسکراہٹ کو قائم رکھتے ہوئے اس نے آنکھوں سے سیاہ چشمہ ہٹا کر کہا۔ "منصور تم دیکھ رہے ہو میری ایک آنکھ ضائع ہو گئی ہے۔ اس حادثے کے وقت وہ بھی میرے ساتھ تھا۔ بڑی حد تک وہی حادثے کا ذمہ دار بھی ہے ـــــ لیکن وہ تو اسی رات سے جدا ہو گیا تھا۔ وہ کہتا تھا میری نیلم کی تو دو نیلی آنکھیں تھیں ایک آنکھ والے چہرے سے تو مجھے خوف آتا ہے۔ شاید میں پاگل ہو گئی تھی، شاید مَیں اب بھی پاگل ہوں، یقین سے مجھے کچھ معلوم نہیں ہے پہلے مجھے یقین کے ساتھ جو کچھ معلوم تھا وہ غلط نکلا۔ اب کسی بات کسی چیز پر یقین کرتے ہوئے ڈر لگتا ہے ـــــ لیکن منصور تم بتاؤ۔ کیا تم مجھے پاگل کہتے ہو؟"

"نہیں نیلم ـــــ تم پاگل نہیں ہو۔ وہ لوگ خود پاگل ہیں جو تمہیں اس نام سے پکارتے ہیں فیروز نے تم پر ظلم کیا ہے۔ مَیں جانتا تھا وہ ایسا کرے گا۔ مَیں تمہیں اس کے بارے میں کچھ باتیں بتانا چاہتا تھا لیکن مَیں ایسا کرنے کا حوصلہ نہ کر سکا۔ اگر مَیں تمہیں بتا دیتا تو شاید تم مجھ سے نفرت کرنے لگتیں ـــــ مجھے حاسد سمجھتیں لیکن میری بات تمہارے کانوں میں گونجتی رہتی اور شاید اس سے کچھ فائدہ ہو جاتا۔ مَیں تو تمہاری محبت، تمہارے حوصلے کی داد دیتا ہوں۔ تم نے کیسے اپنے آپ کو سنبھال رکھا ہے۔ یہ کتنی بڑی بات ہے۔"



"اگر کبھی وہ واپس آجائے تو ــــــ"

"نہیں نیلم۔ یہ خیال چھوڑ دو۔ وہ کبھی تمہارے پاس واپس نہیں آئے گا۔"

نیلم تنہائی پسند ہو گئی تھی لیکن یہ حادثہ اسے میرے قریب تر لے آیا تھا۔ اسے میری ملاقاتوں پر اعتراض نہیں ہوا، بلکہ اب وہ میرا انتظار کرتی تھی۔ لگتا تھا وہ مایوسیوں، محرومیوں اور دکھوں کے درمیان زندہ رہنے کا ارادہ کر چکی ہے۔ کبھی کبھی وہ شام کو میرے ساتھ سیر کو بھی نکلتی لیکن ہمیشہ زیادہ بارونق راستوں سے گریز کرتی۔

وہ لمحہ جب اس نے مجھ سے اپنی تصویر بنوانے پر رضامندی کا اظہار کیا۔ وہ میری خوش نصیبی کا ضامن تھا موئے قلم، رنگ، دل و دماغ اور روح سب نے مل کر اس کی تصویر مکمل کی۔ میں خوش تھا نیلم بھی خوش تھی۔ اس نے تصویر کو دیکھا۔ دیر تک دیکھتی رہی۔ میں محسوس کر سکتا تھا کہ وہ تصویر کو بے حد پسند کر رہی ہے۔ میں اس کے چہرے سے یہ جاننے کی کوشش کر رہا تھا کہ کیا وہ ان جذبات سے بھی پوری طرح واقف ہے کہ نہیں جو اس تصویر کی تخلیق کا سبب بنے ہیں ــــــ خوشی اس کے چہرے کو منوّر کر رہی تھی پھر اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے خوشی کے آنسو، اس نے آنسو پونچھنے شروع کئے تو میں نے دیکھا کہ اس کے چہرے کا تاثر بدل گیا ہے۔ اب وہاں خوشی کی کوئی لہر، مسرت کا کوئی رنگ نہیں تھا لیکن وہ تصویر کو برابر دیکھتی رہی۔

اس کے بعد کا واقعہ اس تیزی کے ساتھ ہوا کہ آج تک ذہن کی گرفت میں آنے سے گریزاں ہے۔

اس نے ایک بڑا سا برش اٹھایا اور اس کے دستے کی نوک کینوس پر اس زور سے ماری کہ برش کا سرا دوسری طرف نکل گیا۔

اب تصویر کے چہرے میں بائیں آنکھ کی جگہ ایک سیاہ سوراخ ایک چھوٹا سا کالا دائرہ نظر آرہا تھا اور خود مجھے بھی کہ اس تصویر کا خالق تھا تصویر کے چہرے سے خوف آنے لگا۔

"تصویر اب مکمل ہوئی ہے ــــــ بیوقوف مصور!" اس نے کہا اور قہقہہ لگاتی ہوئی باہر نکل گئی۔

(۱)

"قبول کیا!"

دو لفظوں کے اس مجموعے میں یوں تو سبھی کے لئے افسون و سحر اور امید و آرزو کا ایک عالم آباد ہوتا ہے لیکن مراد میاں پر ان دو چھوٹے چھوٹے اور بظاہر معصوم لفظوں کا اثر بہت مختلف اور شدید تھا۔

نکاح پر جب مولوی صاحب نے ایک لمبے سے فقرے میں ان سے سوال کیا تھا کہ "گلرخ دختر احمد کلیم کو تم نے بعوض حق مہر شرعی اپنے نکاح میں قبول کیا؟" تو ان کی زبان تالو سے چپک کر رہ گئی تھی۔ آج اس واقعہ کو کم و بیش سترہ برس ہو رہے ہیں۔ ان کی شادی میں شریک ہونے والوں کو تو شاید یہ واقعہ یاد بھی نہ رہا ہوگا۔ لیکن مراد میاں کے ذہن میں تو ایک ایک بات محفوظ تھی، اس دن کا ایک ایک لمحہ نقش تھا اور مٹائے نہ مٹتا تھا۔ نکاح مرضی سے ہو یا بغیر مرضی کے اس واقعے کی تفصیلات بھلائی نہیں جاسکتیں کہ یہ واقعہ زندگی کا سب سے بڑا اور اہم ترین واقعہ ہوتا ہے۔

وہ منظر بظاہر مضحکہ خیز تھا لیکن مراد میاں کے دل پر جو گزر رہی تھی اس کا علم کسی کو نہ تھا۔ اُدھر مولوی صاحب جواب کے منتظر تھے اور ادھر مراد میاں زور لگا رہے تھے۔ "قبول کیا" کے لفظ گلے کی رگوں سے کشم کشتا ہو رہے تھے مگر راہ فرار نہ تھی۔ زبان اور ہونٹ اس انتظار میں تھے کہ کب گلے کے ادھر بیٹھے ہوئے دو بے چین مہمان، دو معصوم لفظ، قید سے رہائی پائیں اور کب وہ اس گوگو کی کیفیت سے آزادی حاصل کریں ـــــ مہمان دیر تک نہ آئے تو زبان اور ہونٹ کسمسا کر رہ گئے۔

تھوڑا بہت تامل نکاح کی روایات کا حصہ ہے۔ یہ تامل جہاں دولہا یا دلہن کی شرافت اور حیا کا مظہر ہوتا ہے وہاں اہلِ محفل کے لئے دلچسپی اور فقرے بازی کا سامان بھی فراہم کرتا ہے اور کوئی پریشان نہیں ہوتا۔ مولوی صاحب نے کچھ توقف کے بعد پھر کہا۔ "کہو قبول کیا!"

مراد میاں نے پھر زور مارا مگر طاقت جواب دے چکی تھی۔ گلے کی رگیں بے بس معلوم ہو رہی تھیں۔ زبان ہونٹوں پر بار بار یوں آ رہی تھی جیسے کسی اہم مسئلہ میں مشورہ ہو رہا ہو۔ مراد میاں نیم وا آنکھوں سے دوزانو بیٹھے مولوی صاحب کی ناف پر یوں نظریں جمائے تھے جیسے حریف کا مورچہ یہیں نصب ہو۔ اکثر چہرے مسکرانے لگے۔ دو چار قہقہے بھی بلند ہوئے اور پھر فقرے چست ہونے لگے۔

"بڑے میاں شرما رہے ہیں!"

"ابھی سے ہوش اڑ گئے!"

"آہ ناتجربہ کاری!"

ایک نیم بزرگ قسم کے صاحب نے بڑی سنجیدگی اور غصے سے کہا "یہ کیا مذاق ہے؟ عجب بدتمیزی ہے۔ واہ صاحب! واہ صاحب!!"

ایک نوجوان نے دوسرے کے کان میں کہا۔ "ان کھچڑی بزرگ کی بے چینی دیکھتے ہو؟ معلوم ہوتا ہے لڑکی کی طرف سے آئے ہیں!!"

مراد میاں کے والد شیخ باقر علی جو موقعۂ واردات پر موجود تھے آگے بڑھے۔ پرانی وضع کے یہ سیدھے سادھے بزرگ نہ صرف لرزہ براندام تھے بلکہ غصے کے مارے انہیں قدم اٹھانا مشکل ہو رہا تھا۔ خدا جانے وہ کیا کچھ سوچ رہے تھے۔ شاید یہی کہ لونڈا خاندان بھر میں رسوائی اور جگ ہنسائی کا سبب نہ بن جائے۔ وہ تو پہلے ہی شادی پر تیار نہ تھا۔ ابھی یہ نہیں ہُوا، ابھی وہ نہیں ہُوا۔ ابھی یہ باقی ہے ابھی وہ باقی ہے۔ اس کم بخت کے پروگرام ختم ہونے میں ہی نہیں آتے تھے اور شیخ صاحب جانتے تھے کہ جوانی اس انتظار میں بیٹھی نہیں رہتی کہ صاحبزادے اپنے تمام پروگرام پورے کریں۔

پھر شیخ صاحب کو اب یقین ہو چکا تھا کہ یہ لونڈا کوئی کام نہ کر سکے گا۔ ایم۔ بی۔ بی۔ ایس کے شوق میں اس نے کئی برسوں کا خون کر دیا تھا لیکن میڈیکل کالج کے اس دروازے سے بھی کوسوں دور رہ گیا تھا جس سے داخلہ کی اجازت ملتی ہے۔ داخلہ کی ایک صورت باقی ضرور تھی یعنی بیمار ہو کر لیکن یہ بات کسی کو نہ سوجھی۔ پھر مراد میاں نے کہیں سے سن لیا تھا کہ ہومیوپیتھی بڑی آسان شے ہے۔ چند مہینوں میں ڈاکٹر بن جاؤ۔ ہلدی لگے نہ پھٹکڑی اور رنگ آئے چوکھا سو اب کئی برس سے ہومیوپیتھی کا بھوت سوار تھا۔ وہ حیران بھی تھا کہ یہ کام جو چند ماہ میں ہو جانا چاہئیے تھا اتنا طول کیوں پکڑ گیا تھا۔ ابھی چند روز پہلے وہ اپنی ماں سے شادی کو غیر معین عرصہ کے لئے ملتوی کرنے کی درخواست کرتا ہُوا پکڑا گیا تھا اور بہانہ یہ تھا کہ ابھی تک وہ ہومیوپیتھی میں طاق نہ ہُوا تھا۔ شیخ صاحب نے اس کی وہ خبر لی تھی کہ پھر اسے ایسی درخواست کرنے کا حوصلہ نہ ہُوا۔

"ہم مر گئے تو تم جیسوں کو پوچھنے والا کوئی نہ ہوگا"۔ انہوں نے غصے سے کہا تھا۔ اب تو جو فیصلہ ہو چکا ہے وہی قائم رہے گا۔ تمہاری عمر کے لوگ پوتے پوتیوں والے ہونے کو ہیں"۔

غصے سے شیخ صاحب کا گورا چٹا چہرہ سرخ انگارہ ہو رہا تھا۔ دور سے ایسے لگتا تھا کہ سردی ہو تو اس چہرے کی آگ سے ہاتھ بآسانی تاپے جا سکتے ہیں۔ شیخ صاحب ان لوگوں میں سے تھے جو اولاد سے یہ نہیں پوچھتے کہ میاں آخر تمہیں تامل کیوں ہے اور نہ یہ دیکھتے ہیں کہ اولاد واقعی کتنی قابل

ہو بھی گئی ہے یا نہیں. وہ تو یہ جانتے تھے کہ ہر جوان آدمی کی شادی ہوتی ہے. اس لئے مراد علی کی بھی ہونی چاہیئے اور وہ وہیں اور اسی وقت ہونی چاہیئے جہاں اور جب والدین طے کر چکے ہیں. وہ اولاد کو یہ حق دینے کو تیار نہ تھے کہ صاحبزادے خود دلہن تلاش کر کے لے آئیں. شادی سے پہلے عشق ان کی نظروں میں گناہ سے کم نہ تھا. انہوں نے بیٹے کو ایک بار یہ بھی سمجھا دیا تھا کہ شادی ہماری مرضی سے ہو گی اور عزیزوں میں ہو گی اور بالکل قریبی عزیزوں میں ہو گی چنانچہ وہ یہ رعایت دینے پر آمادہ ہی نہ تھے کہ اگر اس لئے تامل ہے کہ کوئی ماہ لقا دل میں سما گئی ہے تو ہم کوشش کر لیتے ہیں. انہیں تامل کی کوئی وجہ نظر نہیں آ رہی تھی اس لئے وہ آپے سے باہر ہونے کو تھے۔

مراد میاں نے شیخ صاحب کو آتے دیکھا تو ان کے گلے کی تمام رگیں ایک جھٹکے سے کھُل گئیں اور مولوی صاحب کے تقاضے کے بغیر ہی ان کی زبان سے خاصی بلند آواز میں نکلا.

"قبول کیا! —— قبول کیا!"

اور پھر انہوں نے ایک طویل سانس چھوڑ کر ایک طویل تر سانس یوں لیا جیسے شیخ صاحب کو سمجھانا چاہتے ہوں" لو بابا جان' آپ کا کہا مان لیا ہے اور ایک مصیبت سے چھٹکارا پا کر ایک بلا کو گلے سے لگا لیا ہے۔"

مبارک سلامت کی صدائیں بلند ہوئیں لیکن مراد میاں نے کچھ نہ سنا. ان کو ایسے لگا جیسے ہر طرف "قبول کیا —— قبول کیا" کا شور ہو رہا ہے لیکن ان کی اپنی آواز اس شور میں شامل نہیں ہے. وہ سوچ رہے تھے" میری مرضی کے خلاف میری شادی کیوں کر دی گئی ہے —— بابا جان یہ ظلم کیوں کر رہے ہیں —— میری عمر بڑھ گئی ہے لیکن میں ابھی اس قابل کہاں ہُوا تھا کہ یہ بوجھ اٹھا سکوں —— کاش میں ہومیو پیتھی کی تعلیم پوری کر لیتا.. .... مگر اب کیا ہو سکتا ہے —— میں کیا کروں —— کتنا اچھا ہوتا کہ میں ڈاکٹری سیکھ لیتا —— اپنے پاؤں پر کھڑا ہو جاتا اور کوئی غم نہ ہوتا.......!"

لوگ شور مچا رہے تھے اور احمقوں کی طرح بے معنی خوشی کے عالم میں ایک دوسرے کو چھواروں اور چھواروں کی گٹھلیوں کا نشانہ بنا رہے تھے. مراد میاں پر بھی کئی وار ہوئے. لیکن وہ کسی جوابی حملے کے لئے تیار نہ تھے. ایک بار تو ان کے دماغ میں لہر آئی کہ ان سے پوچھیں "اے لوگو.... تم کیوں خوش ہو؟....... کیا تمہاری شادی ہوئی ہے ...... بیوقوفو مجھے سمجھاؤ یہ ہنگامہ کیا ہے .... احمقو جانتے ہو تم کتنے بڑے ظلم میں شریک ہو؟...... لیکن وہ کچھ نہیں کہہ سکے —— بس دل ہی دل میں سب کو بُرا بھلا کہہ لیا" بیوقوف کہیں کے —— احمق!"

"احمق!" مراد میاں نے آہستہ سے کہا اور خود بخود ان کی نظریں شیخ باقر علی کی طرف اٹھ گئیں وہ ہنس ہنس کر لوگوں سے مبارکباد قبول کر رہے تھے." احمق! احمق! احمق .... یہ لفظ مراد میاں کے دماغ میں کودنے پھلانگنے لگا یوں جیسے کسی برین گن کی میگزین پوری کی پوری یہیں خالی ہو گئی ہو. خود مراد میاں کو بھی یہی احساس ہو رہا تھا جیسے وہ برین گن اپنے ہاتھ میں لیئے بیٹھے ہوں اور گولیاں تڑاتڑ نکل رہی ہوں" احمق! احمق! احمق!........"

اچانک انہیں احساس ہُوا کہ اب تک کشتوں کے پشتے لگ چکے ہوں گے انہوں نے خوفزدہ ہو کر آہستہ آہستہ چاروں طرف نظر دوڑائی اور یہ دیکھ کر اطمینان کا سانس لیا کہ سب ٹھیک ٹھاک تھا اور شیخ صاحب زندہ تھے. ان کی نظریں چند لمحوں کے لیئے مولوی صاحب پر آ کر رُک گئیں اور وہ سوچنے لگے کہ میں نے کیا کہا تھا. بڑی مشکل سے انہیں یاد آیا کہ انہوں نے "قبول کیا" کہا تھا اور ذہن پھر بے چین ہو گیا" قبول کیا —— قبول کیا —— میں نے قبول کیا؟ —— میں نے کب قبول کیا؟؟ —— یہ تو بابا جان کا قصور ہے —— انہوں نے قبول کیا ہو گا —— میری کوئی ذمہ داری نہیں ہے —— میں بے قصور ہوں.... بابا جان کو کون سمجھائے کہ —— کہ میں ہومیو پیتھی کا کورس پورا کر لیتا تو شادی ہو جاتی. مگر........ آہ بابا جان!" مراد میاں کی خاموشی کو دُلہا کی روایتی خاموشی سمجھا گیا اور کسی کو ان کی اصلی حالت

کا علم نہ ہو سکا۔۔ چہرے کی پریشانی کو سہرے کی چند ہمدرد لڑیوں نے پوری طرح آشکارا ہونے سے محفوظ رکھا۔ مراد میاں چاہتے تھے کہ لوگوں کو بہت کچھ سمجھائیں لیکن کسی کے دماغ میں اترنا ان کے بس میں نہ تھا۔

(۲)

شادی کا ہنگامہ ختم ہوا اور لوگ بہت جلد بھول گئے کہ مراد میاں اپنی شادی پر کتنے پریشان تھے۔ ان کے دوستوں کی تعداد بہت کم تھی۔ گھومنے پھرنے کے وہ عادی نہ تھے۔ بس بیوی کے ہو کر رہ گئے۔ گلرخ کلیم بڑے فخر سے گل رخ مراد بنی اور پھر اس کا نام بیگم مراد کچھ ایسا چلا کہ لوگ بھول گئے کہ اس کا کوئی اور نام یعنی ایک اصلی نام بھی ہے جس کا مراد میاں کی ذات سے کوئی تعلق نہیں۔ بات عجیب اس لئے تھی کہ انفرادیت اور شخصیت تو مراد میاں کی اپنی ختم ہو گئی تھی اور وہ بیوی کے ساتھ یوں نتھی ہو کر رہ گئے تھے جیسے اکثر بیویاں اپنے سخت، جابر اور خود غرض خاندوں کی مرضی اور شخصیت کو ہی اپنی مرضی اور شخصیت بنا لیتی ہیں، لیکن نام گلرخ کا بھلا دیا گیا تھا۔ مراد میاں کا ہومیوپیتھی کا شوق برابر قائم رہا، وہ چھوٹی موٹی بیماریوں کا علاج بھی کرنے لگے تھے لیکن وہ مطمئن نہیں تھے وہ تو بڑی بیماریوں کا علاج کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے ہومیوپیتھی کی کتابوں اور دواؤں کا اچھا خاصا ذخیرہ جمع کر لیا تھا۔ اپنے دفتر سے جہاں وہ بحیثیت کلرک کے کام کرتے تھے فارغ ہو کر وہ بیشتر وقت گھر پر گزارتے۔ محلے کی عورتوں اور بچوں کا علاج وہ آسانی سے کر لیتے تھے لیکن وہ خوش نہ تھے۔ وہ دوائیں جن کی ان کو تلاش تھی ابھی تک انہیں میسر نہ آسکی تھیں۔

بیگم پرستی کی انہوں نے وہ مثال قائم کی تھی کہ محلے کی تمام عورتیں بیگم مراد پر رشک کرتیں اور تمام مرد مراد میاں کو گالیاں دیتے۔ گو کامیاب ڈاکٹر نہ بن سکنے اور بڑی بڑی بیماریوں کا علاج کرنے کے قابل نہ ہونے کی وجہ سے ان کا دل نامطمئن رہتا تھا تاہم بظاہر وہ بڑے اطمینان سے زندگی گزارتے نظر آتے تھے۔ انہیں دیکھ کر یا مل کر یہ خیال کبھی نہیں آتا تھا کہ وہ اب بھی باباجان سے ناراض ہیں۔ گھر کے کام کاج میں بیوی کا ہاتھ بٹانے اور ہومیوپیتھی کے چکر میں منہمک رہنے سے

ایسے لگتا تھا جیسے ان کے سامنے کوئی واضح نصب العین ہو۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ نصب العین گلرخ کی خوشنودی کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ اسی لئے تو بیگم مراد کی بیشتر پڑوسنیں اس کی خوش بختی پر دل ہی دل میں جلا کرتیں۔ مراد میاں کیسے "بیگم۔ بیگم" کی تسبیح پڑھتے ہیں "آپ" سے چھوٹا لفظ استعمال نہیں کرتے اور کس طرح گلرخ کی آسائشوں کا خیال رکھتے ہیں یہ موضوع آس پاس کی عورتوں میں زیر بحث رہتا اور کبھی ختم نہ ہوتا۔ مراد میاں کی محبت کی مثالیں دی جاتیں اور سب کچھ درست معلوم ہوتا کیونکہ گھر سے باہر تو وہ صرف دفتر جانے یا سودا سلف لانے کے لئے نکلتے تھے باقی سارا وقت وہ گھر پر گزارتے، حقہ پیتے اور کام کاج میں بیوی کا ہاتھ بٹاتے۔ کبھی کبھی اس کی خواہش پر اس کے ساتھ سینما بھی چلے جاتے۔ باہر سے دیکھنے والوں کو ان کی زندگی میں عجیب طرح کا اطمینان نظر آتا تھا، یہ اطمینان اتنا گہرا، اتنا بوجھل تھا۔ کہ اس پر مردہ اطمینان کا گمان ہو جانا کچھ عجیب نہ تھا۔

بیگم مراد کو جاننے والیوں میں کچھ ایسی بھی تھیں جو دل ہی دل میں کڑھنے کی قائل نہ تھیں انہوں نے اپنے اپنے خاوندوں سے باقاعدہ احتجاج کیا اور مطالبہ داغا کہ ان کو بھی اسی طرح صاحب اختیار اور قابلِ احترام سمجھا جائے جیسے بیگم مراد تھیں۔ ان کو اس بات پر شدید اعتراض تھا کہ ان کے خاوند گھر کی فکر بہت کم کرتے تھے اور گھر کے کام کاج میں ہاتھ بٹانا تو ایک طرف وہ تو بعض اوقات بازار کا کام بھی بیویوں پر ڈال دیتے تھے چنانچہ ایسا بھی ہوتا کہ ان بے چاریوں کو سبزی گوشت بھی یا تو خود لانا پڑتا یا پھر محلے کے چھوکروں کی خوشامد کرنا پڑتی اور چھوکرے بھی ایسے خودسر اور بدمعاش کہ اول تو کہا نہ مانیں اور اگر مان لیں تو آدھ سیر گوشت کا ڈیڑھ پاؤ لائیں اور محنتانے کی اکنّی الگ وصول کریں۔

ان عورتوں میں سے ایک نے غصے میں ایک روز گھر کا کوئی کام نہ کیا اور جب

میاں رات بارہ بجے شطرنج کی سی محفل سے اُٹھ کر آئے تو خوب جھگڑا ہوا۔ بیوی نے صاف صاف کہہ دیا کہ جو بوؤ گے سو کاٹو گے، جیسا سلوک تم ہم سے روا رکھو گے ویسا ہی سلوک ہم تم سے کریں گے۔ پھر اس نے مُراد میاں کی تعریفوں کے پُل جو باندھنے شروع کیئے تو میاں کو غصّہ آگیا۔ بات بھی ٹھیک تھی۔ کون سے خاوند کا جگرا ہے کہ اپنی بیوی کی زبان سے دوسرے مرد کی تعریفیں سنتا رہے اور کچھ نہ بولے۔ چنانچہ خاوند بھر گیا اور شطرنج میں کھائی ہوئی ماتوں کا غصّہ بھی بیوی پر اترنے لگا۔ بیوی کو خوب ڈانٹ ڈپٹ کر اس جوانمرد خاوند نے مُراد میاں کو وہ گالیاں دیں اور ان کے بارے میں ایسے ایسے راز افشا کیئے کہ آئندہ بیوی نے خاوند کے سامنے مُراد میاں کا نام نہ لیا۔ اور اس وقت بھی ہوشیاری سے کام لے کر بھاگم بھاگ باورچی خانے میں گھس گئی اور پھر دس پندرہ منٹ میں تلے ہوئے انڈے اور پراٹھے میاں کے سامنے رکھے تھے۔ اسی بات پہ ان کی صلح ہو گئی۔

وہ وقت تو گزر گیا لیکن مُراد میاں کے بارے میں اس آدمی کی زبان سے نکلا ایک ایک لفظ ایک ایک داستان بن کر نہ صرف زندہ رہا بلکہ اس گھر کی دہلیز سے نکل کر یہ سب لفظ یہ تمام داستانیں یوں پھیلیں جیسے خشک کاغذ کے ڈھیر میں لگی آگ۔

بیگم مُراد سے بھی کوئی بات چھپی نہ رہتی تھی۔ ہر ایک پڑوسن کسی دوسری کا نام لے کر سب اچھی بُری باتیں اس کو بتا جاتی۔ اچھی کہنا تو تکلف ہی ہے۔ یہ سب باتیں بُری ہی ہوتی تھیں ایک نے ذمہ داری حسب معمول کسی اور کے سر منڈھ کر اسے بتایا کہ فلانی زاشدہ کے ابا کو زن مرید کہتی ہے۔ فلانی نے اس کا نام جورو کا بھائی رکھا ہے اور فلانی خود بیگم مُراد کو اُلّو کی آیا کہتی ہے۔ بعض عورتیں ایسی بھی تھیں جو بیگم مُراد کے حوصلہ اور صبر و ضبط سے مرعوب ہوئے بغیر نہ رہ سکیں۔ "آفرین ہے اس عورت پر!" وہ کہتیں "اتنا بڑا جگرا ہے اس کا۔ بڑی ہمت والی ہے کیا کیا سنتی ہے اور برداشت کرتی ہے۔"

بات تھی بھی حیرانی کی۔ عورت اور سب کچھ سن کر خاموش رہے۔ تعجب ہے عورتیں ایسی بھی ہو سکتی ہیں۔ پھر بیگم مُراد تو وہ عورت تھی کہ شادی کے کچھ عرصہ بعد سے اس پر کسی کا حکم چلنے کے تمام امکانات یکسر ختم ہو گئے تھے وہ ہمیشہ ہر بات میں اپنی مرضی کرنے لگی تھی اور اس کے ماں باپ بھی اس کے سامنے بے بس تھے۔ ایسی عورت کا سب کچھ خاموشی سے سن لینا واقعی حیران کن تھا۔ جو چند عورتیں اس کی مدّاح تھیں ان کا خیال تھا کہ وہ بڑی دانائی کا ثبوت دیتی ہے اگر وہ ایک عورت سے بھی جھگڑ بیٹھتی تو اپنے سارے گھر کا سکون برباد کر دیتی۔ سمجھ دار عورتوں نے اسے داد دیتے ہوئے کہا "ٹھیک ہی تو کرتی ہے۔ ایک چپ ہزار سکھ"

بات یہ بھی درست تھی۔ شاید وہ خود مرکزیت کا شکار بھی تھی۔ اگر ایسا تھا تو یہ بات اس کے لئے بڑی مفید ثابت ہوئی۔ وہ خوب جانتی تھی کہ عورتیں اس سے کیوں جلتی ہیں۔ عورتوں نے تو اپنی مصیبتوں اور غلامی کا رونا اس کے سامنے بھی رویا اور اس سے پوچھا "اے بہن تم نے کیا کھلایا ہے مراد بھائی کو؟ کس سے تعویذ لے کر پلایا ہے انہیں؟ میں نے تو بہت کچھ کر دیکھا پر اُلٹا ہی اثر پڑتا رہا"

بیگم مُراد مسکرا کر کہتی "میں نے کچھ نہیں کھلایا پلایا ـــــ اللہ نے جس کو جیسا چاہا بنا دیا"

دل ہی دل میں وہ ان عورتوں کی جہالت اور سادگی پر ہنستی۔ تعویذ گھول کر پلانے سے کچھ ہو سکتا تو اب تک نہ معلوم وہ کیا کیا کر چکی ہوتی۔ بعض اوقات ان عورتوں کی باتیں سن کر ایک تلخ سی مسکراہٹ اس کے چہرے پر پھیل جاتی جس کا ترجمہ الفاظ میں یُوں ہی ہو سکتا ہے "بھاگ جاؤ، دُور ہو جاؤ ـــــ ذلیل کمینی عورتو ـــــ بڑی آئیں مُراد بھائی کی بہنیں!"

یہ لفظ اس کی زبان سے کبھی ادا نہیں ہوئے لیکن اس کے ماتھے پر اور ہونٹوں پر لکھے ہوئے صاف نظر آجاتے تھے۔ بیزاری کا یہ حملہ شدید تو ہوتا تھا لیکن دیر پا کبھی نہیں ہوتا تھا۔ ایسے میں وہ ایک لمبی خوفناک چُپ سادھ لیتی تھی اور عورتیں خاموشی سے رخصت ہو جاتی تھیں لیکن گھر سے باہر قدم رکھتے ہی تجسّس کی فطری خواہش انہیں بولنے پر مجبور

کردیتی تھی۔ اِن موقعوں پر ان کی گفتگو کچھ اس قسم کی ہوتی تھی :

"یہ اس کو کبھی کبھی ایک دم سے کیا ہو جاتا ہے! بھول ہی جاتی ہے کہ کوئی پاس بیٹھا ہے مجھے تو اس کی صورت سے ڈر لگتا ہے ——ہائے جیسے کھا ہی جائے گی!"

"بس ڈائن ہی تو لگتی ہے!"

"سایہ ہے سایہ —— مُراد بھائی کو تعویذ پلا کر الو بنایا ہے نا تو اس کا کچھ الٹا اثر ہونا ہی تھا!" اور پھر دیر تک اور دور تک "ہُوں ہُوں۔ ہاں ہاں" کی آوازیں یُوں ابھرتی اور ڈوبتی رہتیں جیسے کوئی کسی کی بات کو پُوری طرح سمجھنے کا اظہار کر رہا ہو۔

(۳)

ان کے چار بچے تھے۔ دو لڑکے دو لڑکیاں۔ لڑکیاں دونو بڑی تھیں۔ راشدہ کی شادی پار سال ہو گئی تھی اور بالو کا رشتہ آیا ہوا تھا۔ نور احمد کا رشتہ بیگم مُراد نے یُوں منظور کر لیا تھا جیسے اسی کے انتظار میں بیٹھی تھی یعنی اِدھر سوال پڑا اُدھر منظوری ہوئی۔ بنا بات اور بے بات پر باتیں بنانے والیوں کو ایک اور موضوع مل گیا اور وہ لے اُڑیں۔

"دو بھر ہو گیا تھا بچی کا وجود —— دوہاجو سے باندھ دی!"

"ہائے دوہاجو سے!؟"

"اور نہیں تو کیا، سارا شہر جانتا ہے بس ایک تُو ہی رہ گئی ہے بے چاری انجان۔ پہلی تو شادی کے اگلے سال ہی چل بسی تھی۔ سُنا ہے بڑا ظلم کرتا تھا اس پر —— اور اب —— ہائے میرا تو دل بیٹھا جائے ہے یہ سوچ کر کہ چودہ سال کی گڑیا کو بتیس برس کے بڈھے باندھ دیا اور وہ بھی دوہاجو —— اللہ پُوچھے گا اسے —— اتنی پیاری بچی کی زندگی تباہ کر دی میں تو بس سوچتی ہی رہ گئی کہ اپنے مبشّر کے لئے سوال ڈالوں گی۔ ہائے میرا کتنا جی تھا کیا بتاؤں!"

اور اس نے ایک سرد طویل سانس یوں لی جیسے بہت بڑے نقصان کا احساس

ہو رہا ہو۔ ادھر سب عورتوں نے اپنی اپنی جگہ معاملے کی تہ میں جانے کی کوشش کی اور حسب توفیق تحقیق و تجسّس سے کام لے کر اور کچھ اپنے اندازے کے سہارے بزعم خویش اس معمّے کو حل کر لیا اور یہ کہانی کچھ یوں بنی کہ اس رشتے کی منظوری کا سب سے بڑا محرک نور احمد کے بڑے بھائی شیر علی سے مُراد میاں کی پرانی اور گہری دوستی کا جذبہ تھا۔ کہتے ہیں شیر علی واقعی شیر کی طرح دلیر اور باحوصلہ تھا۔ مُراد میاں سے اس کا بہت گہرا یارانہ تھا۔ وہ لنگوٹیے یار مشہور تھے۔ شیر علی تجارت کے سلسلے میں گھومتا پھرتا رہتا۔ لیکن سال چھ مہینے بعد جب بھی وہ لاہور آتا مُراد میاں کے ہاں قیام کرتا۔ دونوں گھروں کا آپس میں کوئی پردہ نہ تھا۔ ایک ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتے۔ ایک ساتھ سینما جاتے اور کبھی کبھار اکھٹے سیر کا پروگرام بھی بنا لیتے۔

شیر علی اور بیگم مُراد علی کے بارے میں بھی بہت سے قصّے مشہور تھے۔ یہ شکایت عام تھی کہ وہ بیگم مراد کو ہمیشہ "گل رُخ" یا بھی "گل رُخ" کے نام سے مخاطب کرتا تھا۔ لوگوں کا خیال تھا کہ شیر علی مُراد میاں کا لنگوٹیا دوست ضرور رہا ہو گا لیکن اب ایک عرصہ سے یہ دوستی محض ایک ڈھونگ تھا اور اصل میں شیر علی نے یہ تعلق گل رُخ کے لئے قائم کئے رکھا تھا۔ ورنہ ان دونو آدمیوں میں کوئی بات مشترک نظر نہ آتی تھی۔ یہ سب باتیں بیگم مُراد تک پہونچتی رہتی تھیں مگر؛ ہاں تو ایک چپ کی ڈھال تھی جو ہر وار کو ناکام بنا دیتی تھی۔ اس نے کبھی کوئی بات نہیں الٹی۔ جو سنا وہ سید ھا دِل کے کنوئیں میں ایسا گیا کہ پھر کوئی ڈول اس کو نہ نکال سکا۔ یہ دوستی اور یہ قصّے ساتھ ساتھ چلتے رہے یہاں تک کہ شیر علی افریقہ چلا گیا اس کو شیر کے شکار کا بہت شوق تھا۔ کئی بار بنگال کے جنگلوں میں خطرات سے دوچار ہو چکا تھا۔ افریقہ جانے کا بڑا مقصد تو تجارت ہی تھا لیکن افریقہ کے شیر ببر کا شکار بھی اس کے لئے ایک بڑی کشش تھی۔ جلد ہی احباب کا اس سے خط و کتابت کا سلسلہ منقطع ہو گیا اور پھر یہ خیال عام ہو گیا کہ شیر دل کا یہ شکاری ضرور کسی شیر

بیر کا لقمہ بن گیا ہوگا۔ شیر علی کی جرأت کے پیشِ نظر ایک ستم ظریف نے کہا تھا کہ اب وہ دوبارہ کسی شیرنی کے بطن سے ہی پیدا ہوگا۔

نور احمد شیر علی کا بھائی تھا لیکن اس سے بالکل مختلف تھا۔ شیر علی جتنا تیز وطرار اور جری تھا نور احمد اتنا ہی خاموش اور بودا تھا۔ اُس کو شکار کا شوق جنون کی حد تک تھا اور خطرات اور جہاں گردی سے گویا اسے فطری لگاؤ تھا اور اس کو ایسی چیزوں سے کوئی تعلق نہ تھا نور احمد کی پہلی شادی شیر علی نے خود کی تھی لیکن یہ بیوی جلد ہی مرگئی اور پھر ایک عرصہ اس کو شادی کا خیال نہ آیا۔ پھر شیر علی بھی افریقہ چلا گیا تو نور احمد کو اکیلے پن کا احساس مارنے لگا شیر علی کی موجودگی نور احمد کے لئے کچھ ایسی مستقل نہ تھی کیونکہ اس کا اپنا گھر بار نہ تھا شادی اس نے کی نہیں تھی۔ جانتا تھا کہ بیوی بچوں کی موجودگی میں شیر کا شکار ناممکن ہوگا۔ رہی جنسی گھٹن سے بچنے کی بات تو پیسے اور جرأت سے کیا نہیں ہوسکتا۔ پھر بھی نور احمد کو ایسا محسوس ہوتا تھا جیسا اس کے سر پر کوئی ہے اور وہ لاہور ایسے بڑے شہر میں تنہا رہنے کے باوجود خود کو تنہا محسوس نہیں کرتا تھا۔ ماں اس کی اسے چند برس کا چھوڑ کر مرگئی تھی اور باپ بٹوارے کا شکار ہوگیا تھا۔ بہت سے رشتہ داروں کا بھی یہی حال ہوا تھا۔ تھوڑے سے بہت رشتہ دار جو باقی تھے وہ یا تو ہندوستان میں تھے یا وہ نہیں جانتا تھا کہ کہاں تھے۔ اس کو جب کوئی اپنا دکھائی نہ دیا تو اسے شیر علی اور مُراد میاں کی دوستی کی روشنی میں مراد میاں کا گھر نظر آیا۔ نہ روشنی تیز تھی اور نہ راستہ واضح تھا۔ لیکن اس نے محسوس کیا کہ صحرائے لاہور میں اگر کوئی نخلستان ہے تو یہی ہے اس بیابانِ دل وجان میں کوئی جائے پناہ ہوسکتی ہے تو صرف یہی۔ سو اس نے ڈرتے گھبراتے مُراد میاں کے نام ایک خط لکھ ہی ڈالا جو انہوں نے فوراً بیگم کے سپرد کر دیا۔ اور بیگم نے نور احمد کو فوراً بلا بھیجا، جو شرماتا، گھبراتا آیا اور آتے ہی رشتے کی منظوری کا مژدہ سن کر اور زیادہ گھبرا گیا۔ یہ سب کچھ اتنی تیزی سے ہوگیا کہ تھوڑی دیر کے لئے وہ چکرا سا گیا اور سوچتا رہا

کہ یہ خواب ہے یا حقیقت۔ یُوں یہ واقعہ گویا ایک حادثے کے کردار کا حامل تھا

اس گھر پر بیگم مُراد کی حکومت تھی۔ میاں مُراد کی حیثیت تو تصویر کے پس منظر یا کسی اہم کردار کے ساتھ ایستادہ کسی غیر اہم کردار کی سی تھی۔ بیگم مُراد جب بیگم مراد نہ تھی اور گل رُخ بیگم کہلاتی تھی تب اس کے حسن کے چرچے دور دور تک تھے اس کی سعادت مندی اور سگھڑپن کا شہرہ تھا لیکن شادی کے چند ہی ماہ بعد اس نے ماں باپ ماموں چچا سب کو ٹھینگا دکھانا شروع کر دیا۔ کئی بار ذرا ذرا سی بات پر اس نے سب کو جو زبان پر آیا کہا یہ بزرگ لوگ اولاد سے محبت کے ہاتھوں مجبور نہ ہوتے تو کب کے اس عورت سے دور جا چکے ہوتے ورنہ اس عورت نے تو جیسے قسم کھا رکھی تھی کہ نہ صرف کسی کا کہا نہیں ماننا بلکہ موقعہ مل جائے تو ان بزرگوں کو جلی کٹی سنانے سے بھی گریز نہیں کرنا۔ وہ لوگ اس کے معاملات میں دخل ضرور دیتے تھے گو ہر بار مُنہ کی کھانی پڑتی تھی اور ہوتا وہی تھا جو وہ خود چاہتی تھی۔ اس کی پہلی بیٹی راشدہ کی شادی پر بڑا ہنگامہ ہوا تھا۔ سب اس رشتے کے خلاف تھے لیکن بیگم مُراد ایسی بااختیار تھی کہ یہ شادی ہوئی اور سب دیکھتے رہ گئے۔ رہے مُراد میاں تو وہ تو اس کی رائے کو رد کرنا یا اس کی راہ میں آنا گناہ سمجھتے تھے۔ ایسے لگتا تھا جیسے وہ بیگم کو عقلِ کل سمجھتے ہوں۔ چنانچہ بانو کے بارے میں بھی فیصلہ وہی رہا۔ جو خود اس نے چاہا۔ بڑوں نے حسبِ عادت اب بھی احتجاج کیا: "کبھی تو ہماری بات مان لو"

"کچھ تو سنو"

"آخر کوئی حد ہوتی ہے"

"کچھ سوچ تو لو"

اس قسم کے اس نے بہت سے جملے سُنے مگر وہ جانتی تھی کہ خاموشی سے بہتر

ان کا کوئی جواب نہیں۔

(۴)

مولوی صاحب نے نورا حمد سے سوال کیا۔ بانو بنت شیخ مُراد علی کو بعوض حق مہر پانچ ہزار معجّل یا پانچ ہزار غیر معجّل، سکّہ رائج الوقت تم نے اپنے نکاح میں قبول کیا؟"

نورا حمد نے ایک تجربہ کار آدمی کے سے تیقن اور اطمینان سے جواب دیا "جی قبول کیا"، مبارک سلامت کی صدائیں بلند ہوئیں تو مُراد میاں کے ذہن میں ایک دم سے جیسے ڈھول بجنے لگے "قبول کیا ــــــ قبول ــــــ کیا ــــــ قبول کیا ــــ قبول کیا ــــ دھم دھما دھم ــــ دھم دھما دھم ــــ قبول کیا قبول کیا ــــ
دھم دھما دھم، دھم دھما دھم ــــــــ!"

"قبول کیا" ــــ یہ دو لفظ وہ کبھی نہ بھلا سکے تھے اور اب دیواریں کہہ رہی تھیں "قبول کیا"، دروازے چلا رہے تھے۔ "قبول کیا"

بانو کے جہیز کی ایک ایک چیز پکار رہی تھی۔ "قبول کیا"

دولہا کے سہرے کی ہر لڑی گا رہی تھی۔ "قبول کیا"

سجی سجائی دلھن کی چادر کا ایک ایک تار گنگنا رہا تھا "قبول کیا"

بیس برس پہلے کی ایک ایسی ہی محفل ان کے ذہن میں برپا تھی اور وہ سوچ رہے تھے۔ "قبول کیا؟ میں نے کیا قبول کیا؟ ــــ میں نے کیا قبول کیا؟ ــــ یہ سب بابا جان کا قصور تھا ــــ" اور یہ سوچتے سوچتے وہ ایسے گم ہوئے، ایسے چپ ہوئے اور کچھ دیر یوں خلا میں گھورتے رہے جیسے محفل ان کے اردگرد نہیں بلکہ اوپر ہوا میں قائم ہے ان کی حالت دیکھکر کچھ دیر کے لئے لوگ پریشان ہو گئے۔ لیکن وہ جس تیزی سے پریشان ہوئے تھے اسی تیزی سے سنبھل بھی گئے۔

کچھ اسی قسم کا دورہ ان کو راشدہ کی شادی پر بھی پڑا تھا لیکن وہ اتنا شدید نہ تھا

انکی حالت پر مختلف قسم کے تبصرے ہوئے!

"اولاد ــــ ہائے اولاد کتنی پیاری ہوتی ہے!"

"خدا لڑائی کی گھڑی لائے جدائی کی گھڑی نہ لائے"

"یہ صدمہ تو سب کو سہنا ہی پڑتا ہے"

دو لفظوں کے اس مجموعے "قبول کیا" پر بھی دیر تک گفتگو جاری رہی۔ اس قسم کی بہت سی باتیں کہی گئیں کہ کس طرح ذرا سی دیر میں یہ دو لفظ ماں باپ سے بیٹی کو جدا کر دیتے ہیں اور کس طرح وہ لاتعداد ماں باپ جو اپنی شادی پر بڑے شوق سے "قبول کیا" کہتے ہیں۔ اپنی بیٹی کو جدا کرتے وقت ان دو نازک لفظوں کی سنگینی سے مجروح ہو جاتے ہیں

مُراد میاں کی حالت دیکھ کر بڑے بڑے سنگدل اُداس نظر آ رہے تھے اور جب بینڈ باجے کے شور میں عورتوں اور لڑکیوں نے مل کر وہ گیت گایا جو لاکھوں بار گایا جانے کے باوجود تازہ ہے، جو کبھی پرانا اور فرسودہ نہیں ہوگا تو بہت کم آنکھیں تھیں جو پُرنم نہیں ہوئیں آنسو گرتے رہے اور گیت دلوں میں اُترتا رہا اور پھر آنسو گرتے رہے کوئی ایسا دل نہ تھا جو اس گیت میں شریک نہ ہو۔

لکھی بابل مورے
او ــ و ــ و ــ لکھی بابل مورے
کاہے کو دینو بدیس!
بیٹی تو بابل اک چڑیا جو پنکھ لگے اُڑ جائے
رے جو پنکھ لگے اُڑ جائے
رے اُڑ جائے
رے اُڑ جائے

عورتیں چلا چلا کر رو دیں۔ مردانے سے بھی کراہوں اور آہوں کی آوازیں بلند ہوئیں

مُراد میاں پر بھی گریہ کا زبردست دورہ پڑا۔ لیکن لوگ پریشان نہ ہوئے۔ جانتے تھے کہ باپ ہے اور غم بہہ نکلے تو آرام ملتا ہے۔

بیگم مُراد سب کے لئے ایک معمہ بنی ہوئی تھی۔ وہ کبھی کبھی سوچ میں گم نظر آتی لیکن سوچ کے یہ وقفے بہت مختصر ہوتے تھے۔ بیشتر وقت وہ روزمرہ کی طرح خوش ہی نظر آتی رہی۔ بیٹی وداع ہو رہی تھی لیکن اس کی آنکھوں میں آنسو نہیں تھے۔

واضح ہے کہ عورتوں نے اس کے بارے میں ڈھیروں باتیں کی ہوں گی ——— اور یقیناً کیں۔ اس کی بدنامیوں کے تذکرے چھیڑے گئے اس کی بے حسی پر اظہارِ افسوس کیا گیا، اس کے حوصلے کو سراہا گیا، اس کی بشاشت پر حیرانی کا اظہار کیا گیا اور اس کے دل کی سختی پر اسے لعن طعن کیا گیا۔

کسی نے کچھ کہا، کسی نے کچھ، اور بات سے بات نکلتی رہی۔

"اُسے یہ فکر تو ضرور ہو گی کہ نور احمد بالکل اکیلا ہے۔ نہ کوئی آگے نہ پیچھے۔"

"واہ بھئی واہ ——— اس میں دُکھ یا فکر کس بات کا ——— یہ تو خوشی کی بات ہوئی ناکہ نہ ساس ——— نہ نند ——— مزے سے رہو اور سُکھ کی کھاؤ ——— بہن ہم سے پُوچھو جن پر گزرتی ہے۔ ایک سے ایک بڑی آفت سے پالا پڑا ہے۔ ہتھیلی پر رکھی گاجر کو اس صفائی سے کاٹتی ہیں کہ بس دیکھتے ہی رہو ——— تم کیا جانو ——— وہ اتنے اچھے نہ ہوتے تو میں کب کی اس گھر کو آگ لگا چکی ہوتی۔"

"پر میں سوچتی ہوں یہ اس نے اتنی عمر کا بڈھا چنا ہے تو جی ہی جی میں پچھتاتی تو ضرور ہو گی۔ بیس بائیس سال کا فرق ہے۔ ہائے اللہ ہمارا ان کا صرف دس سال کا فرق ہے۔ بس اسی پر لے دے رہتی ہے میں کہتی ہوں کہ پانچ سال کا فرق ہونا چاہیئے۔ بس۔" "اپنا بدلہ نکال رہی ہے" ایک تیسری آواز قریب سے آئی اور پہلی دونو عورتوں نے یہ جان کر کہ کوئی تیسرا شخص ان کی باتیں سُن رہا تھا پہلے تو حیرانی کا اظہار کیا،

پھر انہیں دلی مسرت ہوئی کہ ان کی باتیں سُن لی گئیں۔ چنانچہ اب انہیں باتوں میں زیادہ مزہ آنے لگا۔ انہوں نے مشتاقانہ اور بے تابانہ اس تیسری عورت کی طرف دیکھا اور انتظار کرنے لگیں کہ وہ کچھ اور کہے کچھ دیر تک جب اس نے کچھ نہ کہا تو ان میں سے ایک کو صدیوں کی سی یہ خاموشی بڑی صبر آزما معلوم ہوئی اور اس نے حیرانی سے پوچھا

"بدلہ؟"

"ہاں بدلہ!" اس آواز میں وہ تیقن وہ زور تھا جو کسی بات کا صحیح علم حاصل ہونے سے پیدا ہوتا ہے۔ "خدا جھوٹ نہ بلوائے مراد بھائی اپنی بیوی سے پورے ستائیس برس بڑے ہیں ——— بھلا کوئی لڑکی باپ برابر دولھا پاکر بھی خوش رہ سکتی ہے۔ اس کی خوشی بس دکھاوے کی ہے۔ مہمان آجائے تو گندے پلید بستر پر دُھلی صاف چادر ڈالنا ہی پڑتی ہے۔"

باتیں ہوتی رہیں اور وقت گزرتا گیا۔ پھر شام ہو گئی۔ ایک ایک دو دو کر کے مہمان بھی چلے گئے اور آخر میں بانو بھی رخصت ہو گئی۔

(۵)

نور احمد کا گھر مختصر ضرور تھا لیکن اس میں ضرورت کی تمام چیزیں موجود تھیں۔ برآمدہ باورچی خانہ، غسل خانہ، سٹور، صحن اور دو کمرے۔ اسے اس سے زیادہ کی ضرورت بھی نہ تھی۔ بیگم مراد نے پہلے ہی موقع کے مطابق گھر کی صفائی کا انتظام کروا دیا تھا۔ اس گھر پر کئی برس سے عورت کا سایہ نہیں پڑا تھا۔ نور احمد کے بعض دوست اسے کہا کرتے تھے کہ محض اسی وجہ سے وہ خود اور یہ گھر تباہ ہونے سے بچا رہا ہے۔ دوستوں کا اکٹھ مولوی حمید کی بیٹھک میں ہوتا تھا اس لئے اس گھر پر عموماً خاموشی طاری رہتی تھی نور احمد کچھ ایسا سادہ مزاج تھا کہ اس نے ریڈیو سیٹ تک نہ خریدا تھا۔ وہ گھر میں بھی ہوتا تو گھر خاموش ہی رہتا۔ وہ سونے کو لیٹتا تو گھر پر چھایا ہوا سناٹا جس کا وہ عادی ضرور ہو گیا تھا کبھی

کبھی اسے پریشان بھی کر دیتا اور عجیب عجیب باتیں سجھاتا۔ وہ شاعر یا فلسفی نہیں تھا لیکن اس نے کئی بار محسوس کیا کہ جیسے خاموشی بھی ایک آواز ہے۔ اس نے کئی بار اس آواز کو سنا تھا لیکن اس کے ذہن نے اسے اہمیت نہ دی تھی۔ اس نے یہ بھی محسوس کیا کہ خاموشی بہت بڑی حقیقت ہے اور کہ خاموشی ہی زندگی کا سرچشمہ ہے اور زندگی کا دریا خاموشی کے سمندر میں ہی جا گرتا ہے اور درمیان کا یہ مختصر سا وقفہ —— مختصر سا یہ سفر چھوٹی چھوٹی خوشیوں بڑے بڑے حادثوں، احمقانہ خواہشوں اور لاعلاج پریشانیوں سے اٹا پڑا ہے۔ اسے اپنے ماں باپ تو اکثر یاد آتے تھے جو ماضی کی خاموشی کا حصہ بن چکے تھے۔ مرحومہ بیوی یاد آتی تھی جس کی آواز کبھی کبھی خاموشیوں کے بے صدا گیتوں کے قافلے کے ہم رکاب ہوتی تھی۔ یہ خیال اس کے ذہن میں اپنی انتہائی سادہ صورت میں آتے اور کبھی کسی قسم کی شدید الجھن کا سبب نہ بن سکے۔ صبح کی روشنی میں یہ خیالات، ماضی کی یہ تصویریں، گم ہو جاتیں۔ رات کی تاریکی کی یہ خصوصیت کہ وہ انسان میں بہت کچھ دیکھنے کی صلاحیت پیدا کر دیتی ہے نور احمد کی سوچ بچار کا مرکز کبھی نہیں بنی۔ اور ان سب باتوں کے باوجود اس نے یہ کبھی نہیں سوچا کہ ایک روز فطرت کا دستِ نہفتہ جو ہمہ وقت سرگرم کار ہے اسے بھی ہنگاموں کے کمزور ہاتھوں سے چھین کر لے جائے گا اور موت کی خاموشی کے حوالے کر دے گا

اس کے ذہن میں کوئی خاص الجھن، کوئی واضح کمپلیکس نہ تھا تاہم وہ ادھر کچھ عرصہ سے گھر کی تنہائی سے زیادہ ہی گھبرانے لگا تھا اور چاہتا تھا کہ اس گھر میں ہنگامے پھر واپس آ جائیں اور ایک کمزور سی امید کا سہارا لے کر اس نے مراد میاں کو خط لکھ دیا تھا اور جب وہ ان سے اور ان کی بیگم سے مل کر گھر واپس آیا اور اپنے بستر پر لیٹا تو دیر تک سوچتا رہا کہ خاموشی کا تکلیف دہ پہلو چھپ جائے گا اور بہت جلد نغموں کی سحر آ جائے گی۔ نغموں کی سحر آ گئی اور نور احمد سج سجا کر اپنے دوستوں کی معیت میں بیگم مراد کے

گھر گیا۔ شام کو وہ واپس آیا تو اس کی جھولی مرادوں کے پھولوں سے بھری ہوئی تھی اور اس کے ماتھے پر سہرا ابھی تک سجا ہوا تھا۔ وہ بانو کو لے کر گھر میں داخل ہوا اور محسوس کرنے لگا کہ یہاں خوشیاں اور ہنگامے قافلہ در قافلہ اس کے ساتھ داخل ہو رہے ہیں

(۶)

واپسی پر نور احمد کے ساتھ اس کی دُلھن اور دوستوں کے علاوہ اور چند لوگ بھی تھے۔ ان میں بیگم مُراد بھی شامل تھی۔ نور احمد کے دوست جلد ہی چلے گئے اور پھر باقی لوگ بھی رخصت ہوئے۔ بس بانو اور بیگم مُراد رہ گئے۔ بیگم مُراد نے بہت جلد جہیز کا تمام سامان نہایت سلیقے سے سجا دیا اور مختصر سا یہ گھر اب بھرا بھرا اور گنجان آباد سا نظر آنے لگا۔ شام کو یہ خبر جلد ہی عام ہو گئی کہ بیگم مُراد بیٹی کے ساتھ گئی ہے تو اس کے رشتہ داروں کو سخت غصہ آیا لیکن وہ سب خود کو بے بس پاتے تھے اور سوائے اس کے کچھ نہ کر سکے کہ جمع ہو کر ایک بار پھر اس کو بُرا بھلا کہہ لیں۔

"دیکھ لیا بہن۔ کیا زمانہ آن لگا ہے" دور کی ایک پھوپھی نے دور کی ایک خالہ سے کہا اور بغل میں دبائی گٹھڑی کو چھپانے کی کوشش میں بالکل سامنے کر دیا۔

"کل جُگ ہے آپا کل جُگ —— یہ عورت تو بس سب سے انوکھی ہے بائے لو کبھی یہ بھی ہوا تھا کہ ماں ہی بیٹی کے ساتھ چلی جائے۔ یہ رشتہ داروں کا فرض ہوتا ہے اسے نہ بڑوں کا لحاظ ہے نہ رسموں کا خیال نہ بدنامی کا ڈر۔ ماموں چچا سب یونہی تو ناراض نہیں ہیں۔"

"آنکھ کا پانی مر گیا ہے بہن —— توبہ توبہ —— وہاں بیٹھی کہہ رہی تھی کہ نور احمد اکیلا ہے اس کا تمام سامان مجھے خود ہی جا کر سنبھالنا پڑے گا۔۔۔ بڑی ہی کمینی عورت ہے عورتوں کو بدنام کر دیا ہے۔ مجھے تو ترس آتا ہے بے چارے مُراد بھائی پر —— ٹُگ ٹُگ دیدم دم نہ کشیدم —— بے چارے بے بس پڑے رہتے ہیں —— جال کی

طرح ان کے گرد لپٹ گئی ہے ——— ابھی سگائی پر مجھے کہا کہ بس بانو کے ساتھ تو تم ہی جائیو پر اس کو کس کا لحاظ ہے۔ اپنا کہا بھی بھول گئی۔ سگی نہ سہی سگیوں کے بعد تو میرا ہی نمبر آتا ہے اور سگے اس کو گھاس ہی کب ڈالتے ہیں۔ تو دیکھو میں تو کپڑوں کی یہ گٹھڑی اٹھائے تھک بھی گئی اور اس کٹنی لنگوڑی نے یہ بھی نہ پوچھا کہ بہن یہ کیا بوجھ لادے پھر رہی ہو۔"

"اب آپا اس کے مُنہ کون آئے! میں تو کہتی ہوں اچھا ہی ہوا نہ تم گئیں نہ میں۔ لوگوں کا کیا ہے یونہی اس کی بدنامیوں کا کچھ حصّہ ہمارے نام ڈال دیں اور پھر ایک بات ہو تو کوئی کہے ——— اب وہ راشدہ کا قصّہ تو تمہیں یاد ہی ہو گا۔"

"ہاں ہاں ——— یاد کیوں نہ ہو گا۔"

"اور نہیں تو کیا ——— کوئی بھولنے کی بات تھوڑی ہے۔ تم نے راشدہ کے میاں کو دیکھا ہے نا کتنا سعادت مند لڑکا ہے۔ شادی کے بعد اس بے حیا نے ضد کی کہ وہ گھر جوائی رہے۔ پہلے تو وہ ہنس ہنس کر ٹالتا رہا۔ پر جب اس نے دیکھا کہ یہ مری جا رہی ہے تو بے چارے نے ماں باپ کو راضی کر لیا کہ چلو تھوڑے دنوں کو اس کی خوشی بھی کر دو ——— پر ایک مہینہ میں نہ جانے کیا دنگا فساد ہوا کہ بے چارہ گھر چھوڑ کر بھاگ گیا۔"

"مجھے سب یاد ہے ——— کل ہی کی تو بات ہے۔"

"ہاں ——— کوئی بھولنے کی بات تھوڑی ہے ——— آگے تو سنو ——— بٹیا کو تو اس نے روک ہی لیا تھا۔ کہتی تھی کہ جانے نہ دوں گی۔ پر ایک روز یوں ہوا کہ یہ راشدہ کو ساتھ لے کر بازار چلی گئی تو کیا دیکھتی ہے کہ انارکلی کی نکڑ پر راشدہ کا دولھا یوں کھڑا ہے جیسے انہی کی راہ تک رہا ہو۔ اس نے راشدہ کا ہاتھ پکڑ کر ٹیکسی میں بٹھایہ جا وہ جا ——— یہ بیچاری کھڑی دیکھتی رہی، کر بھی کیا لیتی ——— اور کوئی بیچ میں بھی کیسے آتا آخر وہ اس کا دولھا تھا۔ اور پھر وہ دن اور آج کا دن اس نے راشدہ کو اِدھر نہیں آنے دیا۔"

"ہائے تو یوں ہوا؟! مجھے تو کہنے لگی کہ میں نے آپ ہی آپ بھیج دیا۔ پرائے دھن

پر کیا زور ——— جھوٹی ——— مکّار۔"

"لپاڑن۔"

"کمینی ——— رذیل ——— " دور کی پھوپھی نے غصّہ اتارنے کی کوشش کرتے ہوئے خوب گالیاں دیں۔ "بس دیکھ لو آپا" ——— دور کی خالہ نے بڑے عالمانہ فخر سے کہا۔

"اے بہن یہ تم نے آپا آپا کیا لگا رکھی ہے۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے تم سے سات برس چھوٹی ہوں۔ تمہاری شادی پر میں بارہ برس کی تھی؟" دور کی پھوپھی کو غصّہ نکالنے کا ایک اور بہانہ مل گیا۔ "ہائے آپا۔ یہ تم پر بھی اس لپاڑن کا رنگ چڑھ گیا۔ مجھے تو صاف یاد پڑتا ہے کہ تمہاری شادی پر میں دو مہینے کم گیارہ برس کی تھی۔" دور کی خالہ نے اپنے چھوٹے پن کی حفاظت ضروری سمجھی۔

"اے بس رہنے دو یہ جھوٹ۔"

"جھوٹی تم ہو کہ میں۔"

اور وہ لڑتی جھگڑتی دُور نکل گئیں۔

(۷)

نور احمد نے خوابگاہ کا دروازہ بند کیا تو اسے ناصرہ یاد آ گئی۔ آج ان تمام باتوں کا اعادہ اس پر فرض تھا جو اس نے اس روز کی تھیں جب وہ ناصرہ کو بیاہ کر لایا تھا اور اسی خوابگاہ میں اس سے پہلی بار ملا تھا۔ آج جو لفظ اس کی زبان سے ادا ہوتا جو حرکت اس سے سرزد ہوتی اس کی ایک تصویر اسے اپنے ماضی کی کتاب کے ایک باب میں واضح طور پر روشن نظر آ رہی تھی۔ چھوٹے چھوٹے ان واقعات کا دامن اب اسے پھیلتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ واقعات کی یہ تکرار اسے بہت عجیب سی لگی۔ کمرہ وہی تھا صرف بعض اشیاء اور ان کی ترتیب بدل گئی تھی۔ باتیں وہی تھیں وہ خود بھی وہی تھا صرف ناصرہ کی جگہ بانو نے لے لی تھی اور دوران گفتگو الفاظ میں معمولی سا ردّ و بدل ہو

گیا تھا۔ واقعات اور حادثات کی یہ تکرار ہی زندگی ہے لیکن نور احمد اس قسم کی گہری فلسفیانہ باتیں سوچنے پر آمادہ نہ تھا۔ اسے یاد تھا کہ ناصرہ سے بات کرتے ہوئے وہ خاصا پریشان تھا۔ لیکن اب تجربے کا عطا کردہ حوصلہ اس کے ساتھ تھا اب وہ تنہا نہ تھا اس لئے بڑے پراعتماد، مربیانہ اور بزرگانہ انداز میں بات کر رہا تھا شاید بات کرتے ہوئے اپنی اور بانو کی عمروں کا فرق بھی اُسے یہ انداز اختیار کرنے پر اُکسا رہا ہو۔ ایک بات کا اسے پُوری طرح یقین تھا اور وہ یہ کہ اس نے ناصرہ سے بھی محبت اور خلوص سے باتیں کی تھیں اور آج بانو سے بھی اسی سچے جذبے کے ساتھ گفتگو کر رہا تھا۔ وہ محسوس کر چکا تھا کہ عموماً شادی بلکہ سگائی ہوتے ہی دونو متعلقہ شخص ایک دوسرے کو اپنے دل میں اترتا ہوا سا محسوس کرنے لگتے ہیں اور جب ان کی ملاقات ہوتی ہے تو یگانگت کے لئے راستہ پہلے سے ہموار ہوتا ہے کم از کم اپنے بارے میں تو اس کا یہی تجربہ تھا۔

انہوں نے ایک دوسرے کو بتایا کہ وہ ایک دوسرے کے اور مستقبل کے بارے میں کیا سوچا کرتے تھے۔ انہوں نے ہونے والے بچوں کا ذکر چھیڑا۔ ماضی کے اوراق بھی الٹے اور دیر تک جاگتے اور باتیں کرتے اور مزید جاگتے اور مزید باتیں کرتے رہے یہاں تک نیند نے ان کو اپنی آغوش میں لے لیا۔

(۸)

برآمدے میں کھٹکا ہوا اور بانو کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے سامنے دیوار پر لگے کلاک کی طرف نگاہ کی۔ زیرو کے بلب کی مدھم روشنی میں اس نے دیکھا کہ رات کے تین بج رہے ہیں۔ پھر اس نے پہلو میں سوئے ہوئے نور احمد کے چہرے پر پہلی بھرپور نظر ڈالی

"یہ ابا جان سے کتنے مختلف ہیں" اس کے ذہن میں ایک خیال آیا اور چلا گیا۔

نور احمد کے بال اس کے ماتھے پر بکھرے ہوئے تھے۔ اطمینان سے سویا ہوا

وہ اس کو بہت سیدھا، معصوم اور اچھا لگا۔ اس کا دل چاہا کہ اس کے ماتھے پر ہاتھ پھیر کر بال ایک طرف ہٹا دے اور اس کی پیشانی کا پُوری طرح نظارہ کرے لیکن ابھی اس میں اتنی بے باکی نہیں آئی تھی اس کا ہاتھ ذرا سی حرکت کر کے رُک گیا۔

نور احمد کا سر ریشمی لحاف سے باہر تھا۔ پلنگ کے آخری کونے پر ایک اُبھار بتا رہا تھا کہ یہاں اس کے پاؤں ہیں۔ بانو نے اس کے سر سے پیر تک نظر دوڑائی۔

"یہ کتنے لمبے ہیں" اس نے سوچا۔ "مجھ سے تو کم از کم دو بالشت اُونچے ہوں گے" وہ مسکرانے لگی۔ "خیر اسٹول کام آجایا کرے گا" وہ اور زیادہ مسکرائی۔

"مرد عموماً عورتوں سے لمبے کیوں ہوتے ہیں" اس نے پھر سوچنا شروع کیا۔ "اور زیادہ مضبوط بھی تو ہوتے ہیں ـــ شاید اسی لئے مرد اچھے ہوتے ہیں۔ ابا جی بھی کتنے لمبے ہیں۔ وہ کتنے چُپ چاپ اور دُبلے سے ہیں پر امی پھر بھی ان سے ڈرتی ہیں"

اس نے پھر آنکھیں بند کر لیں۔ جیسے سونے لگی ہو۔ لیکن پھر باہر کھٹکا ہوا اور قدموں کی آہٹ یوں آئی جیسے کوئی اندر چلا آرہا ہو۔ اس نے گھبراہٹ میں نور احمد کو جھنجوڑ دیا۔ نور احمد جاگ اٹھا اور بانو گھبرا گئی کہ کیا کہے۔ اسے یہ بتاتے ہوئے حجاب آرہا تھا کہ وہ ایک معمولی سے کھٹکے سے ڈر گئی ہے۔ وہ سوچیں گے اتنی بڑی ہو کر ڈرتی ہے۔ عین اس وقت پھر قدموں کی مدھم سی آواز آئی لیکن اب کے یوں لگا جیسے یہ آواز دروازے سے دور جا رہی ہو۔ بانو کی مشکل آسان ہو گئی۔ "یہ سنا آپ نے؟ باہر کوئی ہے!" اس نے کہا۔

نور احمد مُسکرانے لگا۔ وہ بانو کی گھبراہٹ سے لُطف لے رہا تھا۔ "امی جان کے سوا کون ہو سکتا ہے؟" اس نے کہا "ماما! سمجھتی ہونا! شاید ابھی نہیں سمجھیں۔ ابھی تم اس فکر کا اندازہ نہیں کر سکتیں جو تمہاری امی جان کو تمہارے بارے میں ہو سکتا ہے۔ خیر سو جاؤ ـــ سو جاؤ" اور اس نے لحاف اچھی طرح اس کے گرد لپیٹ دیا۔

اس کے چہرے پر کھیلتی ہوئی شرارت سے بانو نے اندازہ کر لیا تھا کہ پریشانی کی

کوئی بات نہیں لیکن یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی کہ امی جان کو کیا فکر لاحق ہو سکتی تھی۔

اگلی صبح بانو کو بہت اچھی بھی لگی اور عجیب اور نئی بھی۔ وہ حیران تھی کہ صبحیں ایسی بھی ہو سکتی ہیں۔ اس نے پہلو میں خوابیدہ نور احمد کی طرف دیکھا اور ایک انگڑائی لے کر ڈرتے ڈرتے بازو پھیلائے اور کمرے کا جائزہ لینے لگی۔ کلاک آٹھ بجا رہا تھا۔ کمرے میں نئی قسم کی روشنی کا احساس ہو رہا تھا۔ سورج کی یہ روشنی عام نہ تھی آج اس روشنی میں کسی اور نئی روشنی کی خوشگوار آمیزش تھی۔

"زندگی کتنی اچھی ہے"۔ اس کے اندر سے ایک آواز آئی۔

"زندگی کتنی عجیب ہے،" در و دیوار نے کہا۔

"زندگی کتنی خوبصورت ہے،" کمرے میں رکھی ہوئی ہر شے نے سرگوشی کی۔

"آج نماز قضا ہو گئی،" اس کو اس خیال سے دکھ ہوا۔ اس نے نور احمد کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے سے جلد بیدار ہونے کے امکانات عیاں نہیں تھے۔ "ان کے جاگنے سے پہلے نماز پڑھ لوں،" اس نے سوچا۔ وہ اٹھنے لگی تو اچانک اسے چند باتیں یاد آئیں جو شادی سے ایک روز پہلے اس کے کان میں ڈالی گئیں تھیں اور اسے خیال آیا کہ آج نماز نہیں پڑھ سکتی۔ وہ لیٹی رہی اور پھر نور احمد کو نظروں میں تولنے لگی۔

"کیا یہ کام کاج میں اسی طرح میرا ہاتھ بٹائیں گے جیسے ابا جان امی جان کا ہاتھ بٹاتے ہیں؟ ابا جان آج تک کسی سے سختی سے نہیں بولے۔ نہ جانے یہ کیسے بولا کریں گے — لگتے تو بہت اچھے ہیں۔ ابا جان سے بھی اچھے"

"ان کو بچوں کا کتنا شوق ہے!"

نو بجے کے قریب ایسے لگا جیسے نور احمد جاگ جائے گا۔ اس نے آنکھ کھولی اور بند کر لی۔ چند منٹ کے بعد پھر اس نے یہی عمل دہرایا اور پھر تیسری بار اس نے پہلو میں ہاتھ مارنے کے بعد گھوم کر دیکھا۔ بانو آئینے کے سامنے بیٹھی اپنے ہاتھوں سے

اپنے بال درست کر رہی تھی۔ اس کے ذہن میں وہ مصرعہ گھوم گیا جو پہلی شادی کی دوسری صبح اس کے دوستوں نے ایک قوالی کی صورت میں گا گا کر اسے سنایا تھا۔

تیری صبح کہہ رہی ہے تیری رات کا فسانہ — آ ہے رات کا فسانہ
ارے رات کا فسانہ — اجی رات کا فسانہ

وہ باہر آئے۔ بیگم مراد نے ناشتہ تیار کیا ہوا تھا اور غسل خانے میں ٹب گرم پانی سے بھرے رکھے تھے۔

نور احمد نے آنکھیں آسمان کی طرف اٹھائیں اور دل ہی دل میں کہا۔ "اے خدا — اے مہربان خدا! میں تیرا شکر کیونکر ادا کروں!"

(۹)

رواج کے مطابق بانو اپنی ماں کے ساتھ واپس چلی گئی۔ نور احمد کو یہ رواج کچھ اچھا نہ لگا بیگم مراد یہ بات سمجھ گئی تھی وہ تو خود کسی لمبی چوڑی پابندی کی قائل نہ تھی۔ اس نے نور احمد سے کہا۔ "تم بھی وہیں ہمارے ساتھ چل رہو۔" لیکن نور احمد کو یہ مناسب معلوم نہ ہوا۔ پھر گھر اکیلا چھوڑنا بھی درست نہ تھا۔ یقیناً اس وقت تک آس پاس بلکہ دور دراز کے چوروں کو معلوم ہو چکا ہو گا کہ اس گھر میں شادی کا نیا نیا سامان آیا ہے۔ آخر طے یہی ہوا کہ نور احمد رات گھر پر ہی گزارے گا۔ دو دن کی بات تھی۔

دوستوں نے شام کو اسے سسرال ہی میں آ گھیرا۔ مولوی حمید کہ "سرخیلِ حلقۂ یارانِ طریقت" کہلاتا تھا، مولوی ضرور تھا لیکن خاصا جدید قسم کا مولوی تھا یعنی داڑھی رکھنے اور نماز پڑھنے کے باوجود سیر سپاٹے اور فلموں کا خاص شوق رکھتا تھا۔ اس وقت سب فلم کا پروگرام بنا کر آئے تھے اور چلتے چلتے وہ یہ بھی کہتے گئے کہ رات کے کھانے پر نور احمد کا انتظار نہ کیا جائے۔ ایبٹ روڈ کی مشہور دکان سے نان کباب اور تکے کھا کر انہوں نے فلم دیکھی اور اب اتنی دیر ہو چکی تھی کہ نور احمد کو یہی مناسب معلوم ہوا کہ

سیدھا اپنے گھر جائے۔ گھر پہنچ کر اس نے دروازہ کھلا پایا۔ اندر روشنی بھی ہو رہی تھی پہلا خیال جو اسے ذہن آیا یہ تھا! تو ہو گیا چاندنا! بٹیا اور جاؤ فلم دیکھنے!"

وہ چوروں کے ڈر سے ڈرتے ڈرتے چوروں کی طرح دبے پاؤں اندر داخل ہوا۔ بھنے گوشت کی خوشبو سے سارا گھر مہک رہا تھا۔ باورچی خانے سے کوئی نکلا اور نور احمد ٹھٹک کر رک گیا۔

"آپ ــــ! ــــ اوہ!" اس نے اطمینان کی ایک سانس لے کر کہا۔ "میں تو ڈر ہی گیا تھا"

"ہاں ــــ دوسری چابی میں ساتھ ہی لے گئی تھی۔ تم تو اپنے دوستوں کے ساتھ چلے گئے اور مجھ پر یہ فکر سوار ہو گئی کہ نہ جانے کیا الّم غلّم کھا لو۔ سو میں کھانا ساتھ لے آئی۔ گرم ہے اور بالکل تیار ہے۔ صبح ناشتہ کر کے گھر جاؤں گی۔ پھر کل شام کو تم بانو کو لے آنا"

"اُوہ آپ کتنی مہربان ہیں ــــ میں آپ کا شکریہ اور خدا کا شکر ادا نہیں کر سکتا۔ مجھے اپنی قسمت پر ناز ہو جائے گا۔ ایسا ہو تو اسے خدا مجھے گنہ گار نہ سمجھ لیجیو۔" اس نے یہ کہہ کر ہاتھ آسمان کی طرف اُٹھا دیے۔

اسے بھوک نہ تھی پھر بھی اس نے تھوڑا سا کھانا کھا ہی لیا۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ اس وقت کچھ نہ کھانا گناہ ہو گا۔

شب خوابی کا لباس پہن کر وہ بستر پر لیٹ گیا۔ تکیہ عطر کی خوشبو سے مہک رہا تھا۔ دلہن کا جسم طرح طرح کی خوشبوؤں سے مہکا کر پیش کیا جاتا ہے اور دولہا سمجھنے لگتا ہے کہ یہ خوشبو اس عورت کے پیکر کی خوشبو ہے اس کی ذات کا حصہ ہے اور وہ اسے گل بدن کہتا ہے۔ اور جب وہ قریب نہ ہو تو اس خوشبو کے احساس سے اسے قریب محسوس کرنے لگتا ہے۔ زیادہ حساس ہو تو شاعروں کی طرح پھولوں کی خوشبو کو اسی کا مرہون منت قرار دیتا ہے۔ یہ خوشبو بانو کی نہ تھی یہ خوشبو تو ہر اس دلہن کے جسم سے آتی ہے جس کے ماں باپ کے پاس اتنا پیسہ ہوتا ہے کہ اسے کسی نہ کسی خوشبو میں بسا دیں۔ یہ خوشبو کچھ اتنی

تیز تھی کہ نور احمد کو یہ بات پوری طرح یاد نہ آسکی کہ ناصرہ کے وجود سے بھی اس قسم کی خوشبو کی لپٹیں اُٹھا کرتی تھیں۔ مگر وہ خوشبو اب دُور ماضی میں جا چکی تھی اور وہ جسم مٹی میں مل چکا تھا اور گو نور احمد نے اس جسم سے بھی محبت کی تھی تاہم وہ سب کچھ وقت کا ایک خاصا طویل فاصلہ طے کر کے اتنی دور جا چکی تھی کہ اب اسے اس پرانی خوشبو کا احساس بہت کم ہوتا تھا۔ تکیے کی خوشبو کو ذہن میں اتارتے ہوئے اسے مسلسل یہ احساس تھا کہ یہ خوشبو بانو اپنے ساتھ لائی ہے اس لیے یہ اسی کی خوشبو ہے اور خود خوشبو کا پیکر ہے اور نیم غنودگی کی حالت میں وہ محسوس کرتا رہا۔ جیسے اس خوشبو کے واسطے سے وہ خوشبو کا پیکر اس کے پاس موجود ہے اور وہ اس پیکر کو اپنے ذہن کی آغوش میں لے کر سو گیا۔

ابھی نصف شب نہ گزری تھی کہ باہر برآمدے میں کچھ آہٹ ہوئی اور اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے اپنے پہلو کی جانب ہاتھ بڑھا کر آہستہ سے کہا!

"بانو!"

لیکن ہاتھ یوں واپس آ گیا جیسے اُسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہو اور ایک مسکراہٹ اس کے لبوں پر پھیل گئی۔ وہ دروازے کی طرف دیکھ کر سوچنے لگا۔ "باہر کون ہے۔؟ بلی یا امی جان؟" اور وہ بار بار دل میں "بلی یا امی جان ــــ بلی یا امی جان" کے الفاظ دہرا کر مسکراتا رہا اور پھر سوچنے لگا۔ "بلی ہی ہو گی ــــ آج امی جان کو پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہو سکتی ہے" اس کے چہرے پر شریر سی مسکراہٹ پھیل گئی اور اس نے پھر اپنے پہلو کی طرف دیکھا جیسے بانو سے داد کا طالب ہو کر دیکھو ہم نے کیا مزے کی اور کتنی معنی خیز بات کی ہے۔

"بلی ہی ہو گی۔" اس نے دل میں فیصلہ کیا اور آنکھیں بند کر کے سو جانا چاہا لیکن پھر وہی آہٹ پیدا ہوئی اور ایسے لگا جیسے کوئی اندر کی طرف چلا آ رہا ہے اس نے اُٹھ کر ایک دم سے دروازہ کھول دیا۔ باہر بیگم مراد کھڑی تھیں۔ ان کے چہرے سے معمولی

سی پریشانی عیاں تھی۔

"اکیلے سونے کی عادت نہیں ہے نا۔ بھرے کمرے میں سو سو کر عادت بگڑ گئی ہے دل گھبرانے لگا اور نیند بھاگ گئی۔" انہوں نے کہا۔

"گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔" نور احمد نے تسلی دی۔ "آپ بے فکر ہو کر سوئیں۔ ضروری سمجھیں تو بیچ کا دروازہ کھول لیں۔ آپ کا احساسِ تنہائی جاتا رہے گا۔ نور احمد نے دیکھا کہ بیگم مراد مطمئن نظر آ رہی تھیں۔ بیچ کا دروازہ کھل گیا اور وہ بستر پر آ لیٹا۔ تکیہ سے منہ لگا کر اس نے کئی لمبی لمبی سانسیں یوں لیں۔ جیسے بستر کی تمام مہک کو پی جانا چاہتا ہو۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور دایاں بازو یوں بڑھایا جیسے اپنے قریب اُسی پیکرِ خوشبو کو محسوس کرنا چاہتا ہو۔ جسے وہ اپنی بند آنکھوں میں چھپائے لیٹا تھا اور جس کا یوں وہ مسلسل نظارہ کر رہا تھا اسے پھر ان تکلیف دہ رسوم و رواج پر غصہ آنے لگا جو دوسرے ہی دن بیوی کو میاں سے الگ کر دیتے ہیں اسے آج یہ بات بہت بھلی لگی کہ یورپ کے لوگ شادی کرتے ہی ایک مہینے کے لئے سب لوگوں سے دور چلے جاتے ہیں تاکہ ہنی مون کا مہینہ بغیر کسی طرح کی مداخلت کے گزرے۔ بستر اور بالخصوص تکیے میں بسی ہوئی خوشبو جہاں اس کے ذہن کو خوابوں کی دنیا میں لے گئی تھی وہاں مسلسل بانو کا خیال بھی پیدا کرتی تھی۔ اس نے تھکن سی محسوس کی اور نیند کے انتظار نے تھکن کے احساس میں اضافہ کیا اس کا سر بھاری ہو گیا اور وہ بانو اور بانو کی خوشبو کے بارے میں سوچتا ہوا کچھ دیر بعد سو ہی گیا۔ وہ سو گیا اور خواب دیکھنے لگا... ایک گھر ہے، چھوٹا سا گھر۔ خوشیوں سے مالا مال، سکون و راحت کا گہوارہ ــــ وہ دفتر سے تھکا ہارا آیا ہے۔ سر میں گرانی ہے وہ لیٹ جاتا ہے۔ بانو فکرمند سی نظر آتی ہے اور پاس آ کر سر دبانے لگتی ہے۔ وہ اس کے سرہانے پلنگ کے کونے پر بیٹھی ہے اور سر دباتے دباتے ذرا اور قریب ہو جاتی ہے۔ نور احمد کو بڑا آرام ملتا ہے اور اس پر نیم غنودگی کی سی کیفیت طاری ہونے لگتی ہے وہ خواب ہی خواب میں اس خیال سے خوش ہوتا ہے کہ بانو اتنی جلدی واپس آ گئی۔ خوشی سے اس پر نشہ طاری ہو جاتا ہے اور وہ بانو کے ہاتھ کی پُشت کو اپنی پیشانی ہی پر اپنے ہاتھ سے دباتا ہے اور کوئی محبت کی بات کہہ کر اس کے ہاتھ کو اپنے رُخساروں پر کھینچ لاتا ہے۔ بانو مزاحمت نہیں کرتی۔ وہ اسی طرح چارپائی کے سرہانے ایک کونے پر مگر اس کے بہت قریب بیٹھی رہتی ہے نور احمد اب اس کے دوسرے ہاتھ کے ساتھ بھی وہی سلوک کرتا ہے جو پہلے ہاتھ کے ساتھ کر چکا ہے۔ پھر وہ اس کے ہاتھوں کی ہتھیلیوں کو آپس میں یوں ملا دیتا ہے جیسے دیو داسیاں اپنے دیوتاؤں کے حُضور ملاتی ہیں پھر وہ اس کی انگلیوں کی پوروں کی حِنا کو چُومتا ہے، ہاتھوں کی پشت پر پیار کرتا ہے۔ کلائیوں پر اپنے رُخسار ملتا ہے اور پھر اس کے ہونٹ بانو کی گردن پر جا پہنچتے ہیں۔ وہ اس کی قمیض سرکا کر اس کے شانوں پر بوسوں کی بارش کر دیتا ہے اور پھر بانو اس کی آغوش میں آ گرتی ہے اور اس کا دماغ سو جاتا ہے۔ چُپ ہو جاتا ہے اور جسم پُوری طرح جاگ اٹھتا ہے۔

(۱۰)

جلد ہی نور احمد کے جسم کو نیند آ گئی اور اس کا دماغ جاگنے لگا اور اس کی آنکھیں ماحول کا جائزہ لینے لگیں جیسے جاننا چاہتی ہوں کہ یہ سب خواب تھا یا حقیقت۔ اس کا ہاتھ خوشبو کے پیکر کو اپنے قریب پا رہا تھا اور اس کا جسم اسے اپنے جسم سے مس کرتا معلوم ہو رہا تھا۔

"بانو!" اُس نے آہستہ سے کہا۔ "تم آ گئیں! تم! تم کب آئیں؟!"

"میں تو یہیں تھی۔ تمہارے پاس۔ میں تو کہیں بھی نہیں گئی۔ تمہیں یاد ہے، خوشبو کا پیکر خوشبو کا پیکر ــــ میں ہی تو ہوں وہ خوشبو کا پیکر ــــ خوشبو کا پیکر......" اس کے اپنے اندر سے آواز آئی۔

"اُوہ! خوشبو کا پیکر ــــ" اس نے سوچا "خوشبو کا پیکر ــــ تو یہ خواب ہی ہے ــــ

یہ خواب ہی ہے — میں خواب دیکھ رہا ہوں" اور اس نے آنکھیں بند کرلیں۔ لیکن قریب پڑے ہوئے جسم کے لمس اور اس کی گرمی کا احساس ایک حقیقی احساس کی صورت میں قائم رہا۔ اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا اب اسے یقین ہوگیا کہ وہ جاگ رہا ہے اور اس نے تیزی سے گھوم کر اپنے پہلو میں لیٹی ہوئی بالو کی طرف دیکھا اور اس نے محسوس کیا کہ در و دیوار کانپ رہے ہیں۔ زیرو کا بلب بڑی تیزی کے ساتھ دُور اندھیرے میں چلا گیا۔ اور دور تر ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ پھر وہ بہت دور ایک ننھے سے ذرے کی طرح نظر آنے لگا۔ اس اندھیرے میں اس نے دیکھا کہ جہاں کمرے کی اکثر چیزیں نظر آنا بند ہوگئی تھیں اور ایک دم اندھیرے کے سمندر میں ڈوب گئی تھیں وہاں سامنے دیوار پر ایک روشن تحریر بڑی آب و تاب سے چمک رہی تھی۔

"یہ تم نے کیا کیا؟"

نور احمد کو حالات کی اجنبیت اور نزاکت کا احساس ہونے لگا تھا۔

"نور احمد، یہ تم نے کیا کیا؟" سرہانے دائیں جانب رکھی ہوئی سنگار میز کے شیشے نے آگے بڑھ کر پوچھا۔

"یہ تم نے کیا کیا؟" اندھیرے میں چھت نے جیسے نیچے اُتر کر سوال کیا۔

"یہ تم نے کیا کیا؟" خوشبو سے مہکتے ہوئے تکیے نے سرگوشی کی۔

"یہ کیا ہوگیا؟ کیسے ہوگیا؟" اس نے سوچا اور چاہا کہ اٹھ کر حالات کا جائزہ لے اور اس دور جاتے ہوئے زیرو کے بلب کو، اس مدھم روشنی کے سرچشمے کو غائب ہونے سے پہلے روک لے، واپس لے آئے اور دیکھے کہ اس کمرے کو کیا ہوگیا ہے مگر اس کے جسم میں اُٹھنے کی طاقت نہ تھی۔ اس کا بستر گھوم رہا تھا اور دیواریں گھوم رہی تھیں اور چھت گھوم رہی تھی اور دماغ میں لال پیلی تحریریں گھوم رہی تھیں۔ "تو یہ خواب نہ تھا — اوہ — یہ کیا ہوا۔ یہ میں نے کیا کیا — یہ کیسے ہوگیا — گناہ — سزا — موت — جہنم موت

گناہ — جہنم — گناہ — خودکشی — ذلّت — خودکشی — اوہ"

اس کا سر چکراتا رہا اور اس کے سر کے ساتھ تمام چیزیں چکر کھاتی رہیں۔ اس کی آنکھیں اپنے حلقوں سے باہر نکل کر دروازے کی جانب بڑھیں اور دروازہ کھول کر باہر نکل گئیں کان بھی آنکھوں کے پیچھے پیچھے گئے اور دروازے پر آکر رُک گئے۔ اور اندر ہی بیٹھ رہے اور آنکھوں نے دیکھا اور کانوں نے سُنا کہ باہر ایک مجمع کھڑا ہے اور قہقہے لگا رہا ہے عجیب عجیب آوازیں آرہی ہیں۔ لوگ مسلسل بول رہے ہیں! "ہاں — یہی ہے — یہی ہے نور احمد یہی ہے — ہا ہا ہا — ہا ہا ہا — یہ نور احمد ہے — اس کا نام دیکھو اور اس کے کرتوت دیکھو — یہ اس کو امی جان کہا کرتا تھا — امّی جان ...... ہا ہا ہا ...... ہا ہا ہا ...."

کانوں کے لئے یہ الفاظ ناقابلِ برداشت تھے اور آنکھوں میں گلی والے انبوہ سے نظریں ملانے کا حوصلہ نہ تھا۔ پس آنکھیں واپس آگئیں اور پھر کان بھی واپس آگئے نور احمد کے ہاتھ کبھی اپنی بند آنکھوں کی طرف اُٹھتے اور کبھی کانوں کی طرف لیکن بند آنکھیں مسلسل باہر کا منظر دیکھتی رہیں اور کان جن میں بعد میں نور احمد نے انگلیاں ٹھونس لی تھیں، باہر سے آنے والی ہر آواز کو اپنے بالکل قریب محسوس کرتے رہے۔ نور احمد نے بیزاری اور بے بسی کے عالم میں اپنے پہلو میں لیٹی ہوئی عورت کی طرف دیکھا۔ اُسے حیرانی ہوئی کہ تاریکی میں بھی وہ اُسے دیکھ سکتا تھا۔ ایک خیال آسمانی بجلی کے کوندے کی طرح اس کے ذہن میں لپکا اور اس کو جیسے ایک راستہ اس تاریکی میں باہر نکلنے کا نظر آگیا۔ اس کے ہاتھ تیزی کے ساتھ پہلو میں آرام سے لیٹی ہوئی عورت کی گردن کی طرف اٹھے لیکن گردن سے ایک اِنچ اِدھر رُک گئے اور پھر اسی تیزی سے واپس آگئے۔

"نہیں نہیں۔ یہ ٹھیک نہیں ہے — اس کو مار ڈالنے سے کیا ہوگا۔" اس نے سوچا۔ اسے خود سے نفرت سی ہونے لگی اور اب اس کے ہاتھ اس کی اپنی گردن کو مسلنے لگے۔ "میں کیا کروں — کیا کروں — موت ہی بہتر ہے۔ مجھے مر جانا چاہیئے۔" لیکن اس کے

ہاتھوں میں نوراحمد کو مارنے کی ہمت نہ تھی. یہ نوراحمد ایک نئی نویلی دلھن کی ملکیت تھا "گلاب کیا ہو گا.. مجھے مرجانا چاہیئے — مجھے کیا کرنا چاہیئے؟" یہ الفاظ اس کے ذہن میں یوں گھومنے لگے جیسے گراموفون کی سوئی ریکارڈ کے ایک ہی دائرے پر گردش کرنے لگی ہو.

اس کا دل ڈوبنے لگا اور جسم سرد پڑ گیا. وہ ڈرا ڈرا سہما سہما بستر سے نکلا اور کمرے کے ایک کونے میں جا کھڑا ہوا. اسے وقت کے گزرنے یا نہ گزرنے کا احساس نہیں ہو رہا تھا.

"اُف! کس قدر تاریکی ہے"، اس نے اِدھر اُدھر دیکھنے کی کوشش کرتے ہوئے سوچا. "یہ میری قبر ہے... روشنی دور جا چکی ہے...... وہ چمکتا ہوا ذرہ، میرے کمرے کا مدھم روشنی دینے والا بلب اتنی دُور کیوں چلا گیا ہے...... میں دُنیا سے دور کیوں چلا گیا ہوں...... میں...... مگر یہاں اتنی سردی کیوں ہے؟..... اور" اُس نے اپنے سردی سے کانپتے ہوئے جسم پر ہاتھ پھیرا اور سوچنے لگا." اوہ — تو لوگوں نے مجھے کفن بھی نہیں دیا — اب میں کیا کروں....... کیا کروں..... اس حالت میں؟" — "ساتھ والے کفن کا چرالو" تاریکی میں کہیں سے آواز آئی.

"میں نے کبھی چوری نہیں کی..... میں چور نہیں ہوں، میں بُرا آدمی نہیں ہوں"

اس نے جواب دیا. اچھا! تم بُرے آدمی نہیں ہو؟ اس واقعے کے بعد بھی یہ کہنے کی جرأت رکھتے ہو؟" — "میں — میں — میں نہیں جانتا —"

"ٹھیک ہے تم کچھ نہیں جانتے. سردی سے بچنا ہے تو میرا مشورہ مانو - یہ دیکھو تمہارے سامنے ایک اور لاش پڑی ہے نا - غالباً یہ لاش ہی ہے اور اگر لاش نہیں ہے تو اسے لاش بنانا، ایسا کیا مشکل ہے. ایک عورت کے جسم کی گرمی ختم کرنا کچھ ایسا دشوار کام بھی تو نہیں. بس اس کا کفن اُڑا لو — آگے بڑھو — ڈرو نہیں اور چند لمحوں کے لئے اس کا جسم تن گیا - گردن اکڑ گئی اور ہاتھ سامنے اندھیرے میں ترازو ہو گئے. پھر اس نے ایک قدم آگے بڑھایا، لیکن اگلے ہی لمحے دو قدم واپس آ گیا.

"نہیں نہیں — یہ مجھ سے نہیں ہو سکتا"، اُس نے سوچا.

"اچھا تو پھر کھڑے کانپتے رہو. تم ایسے بزدلوں کی یہی سزا ہے" اس آواز نے حقارت سے کہا "جو شخص حالات کے مطابق خود کو نہیں ڈھالتا اور دوسروں کی حماقتوں سے فائدہ اٹھانا نہیں جانتا وہ تمہاری طرح پریشان ہی رہتا ہے"

وہ دیر تک کھڑا کانپتا اور تاریک خلا میں گھورتا رہا.

اچانک اُس نے محسوس کیا جیسے قبر کی چھت ہٹا دی گئی ہے اور آسمان پر ستارے چمک رہے ہیں جن کی مدھم روشنی میں اندر کا منظر دُھندلا سا نظر آ رہا ہے. پھر دائیں بائیں اور آگے پیچھے کی دیواریں بھی گر گئیں اور گلی کا مجمع اس کی طرف بڑھنے لگا اس کے جسم میں اچانک چُستی کی ایک لہر دَوڑ گئی اور اُس نے تیزی سے بڑھ کر قریب کرسی پر پڑے ہوئے کمبل کو اٹھا کر اپنے گرد لپیٹ لیا اُس نے اپنا سر بھی کمبل میں چھپا لیا. پھر اس کے چاروں طرف دیواریں کھڑی ہو گئیں. چھت اپنی جگہ پر واپس آ گئی اور اس کے جسم نے کانپنا بند کر دیا. اُس نے ڈرتے ڈرتے کمبل سے مُنہ نکالا اور اپنے ارد گرد دیکھا سامنے دیوار پر زیرو کا بلب واپس آ چکا تھا. مدھم روشنی میں کمرے کی ہر چیز دُھندلی سی نظر آ رہی تھی. سامنے کلاک میں تین بج رہے تھے.

اُس نے جسم میں طاقت عود کرتی محسوس کی. وہ آگے بڑھا. اُس نے بڑا بلب روشن کر دیا. اور غور سے اس عورت کے چہرے کو دیکھنے لگا. جو اس کے بستر میں بظاہر سکون سے محوِ خواب تھی - "یہ کون ہے؟ — یہ عورت کون ہے؟" وہ سوچنے لگا.

"یہ چہرہ کس کا ہے؟ یہ اس عورت کا چہرہ تو معلوم نہیں ہوتا جس نے رات مجھے بڑی شفقت سے کھانا کھلایا تھا — وہ — وہ تو اس سے مختلف تھی — یہ ایک ننگی عورت کا چہرہ ہے... ایک بے حیا بیسوا کا چہرہ ہے — ایک طوائف کا چہرہ ہے" اس نے کبھی کسی طوائف سے ملاقات تو نہ کی تھی لیکن سُننے اور پڑھنے سے جو علم حاصل

ہوا تھا اس کی روشنی میں ۔۔۔ اس علم کی مدھم روشنی میں ۔۔۔ اس کا ذہن بھٹک رہا تھا اور بہت سی درست باتیں سوچ رہا تھا۔ یہ جنس کا چہرہ ہے ۔۔ جنس کا، جس کو رشتوں کا لحاظ نہیں ہوتا ۔۔ اس چہرے کے دو رُوپ ہیں ۔۔ اس کا اصلی رُوپ کونسا ہے ۔۔ اگر یہی اس کا اصلی رُوپ ہے تو ..... کیا ہر عورت کے دو رُوپ ہوتے ہیں؟ ۔۔ کیا بانو کیا بانو بھی ۔۔ اس ہی نے تو اُس کو جنا ہے ۔۔ اس ہی نے تو اُس کو جنا ہے ۔۔ اس ہی نے تو اس کو پالا ہے ۔۔ مگر نہیں ۔۔ نہیں ۔۔ بانو تو بہت نیک ہے ۔۔ وہ تو بہت اچھی ہے ...... مجھے جرأت سے کام لینا چاہیئے ۔۔ جرأت سے ۔۔ میں مرد ہُوں ۔۔" اور پھر اس کے ذہن میں ایک خوفناک خیال نے سر ابھارا اس کے ہاتھ اس عورت کی گردن کی طرف بڑھے لیکن اب پھر گردن سے ایک اِنچ اِدھر رُک گئے اور واپس آ گئے۔ اس نے محسوس کیا جیسے اس چہرے کا ایک ایک نقش کہہ رہا ہو۔ "تم مجھے نہیں مار سکتے۔ مجھے کوئی نہیں مار سکتا۔ وہ روپ جس کے لئے موت ہے وہ کب کا مر چکا میں اپنے اصلی رُوپ میں تمہارے سامنے موجود ہُوں۔ کوئی ہے جو اس رُوپ کو اصل تسلیم کرنے سے انکار کی جرأت رکھتا ہے ۔۔ مجھے کوئی نہیں مار سکتا۔ میں اُس وقت بھی زندہ تھی جب تم نہ تھے، میں اس وقت بھی زندہ رہوں گی جب میں نہ ہوں گی ۔۔ مجھے کون مار سکتا ہے۔ کیا تم مجھے نہیں پہچانتے ۔۔ دیکھو میں کون ہوں ۔۔ میں بیگم مراد ۔۔ بیگم دلہن ۔۔ بیگم الیشور سنگھ ۔۔ بیگم مُرلی دھر ۔۔ میں یہ سب ہوں ۔۔ میں جنس ہوں ۔۔ کوئی مجھ سے میرا حق چھین سکتا ہے؟ اخلاقی ضابطے اور معاشرتی پابندیاں میرے لئے بے معنی ہیں ۔۔ میں نے بڑی بڑی دیواروں کو گرا دیا ہے ۔۔ تم کیا ہو ۔۔ ایک کمزور تنکا۔ میں تمہاری کمزوری ہُوں ۔۔ میں تمہاری کمزوری کی سزا ہوں ۔ میں میں بیگم مُراد ۔۔ بیگم دلہن ۔۔ بیگم الیشور سنگھ ۔۔ بیگم مرلی دھر ۔۔ میں ۔۔ میں بیگم نور احمد ۔۔ بیگم نور احمد ۔۔۔ بیگم نور احمد ۔۔۔۔ بیگم نور احمد ۔۔۔۔

اور اس نے محسوس کیا جیسے پھر گراموفون ریکارڈ کی سوئی ایک ہی دائرے پر گھومنے لگی ہو۔ "نہیں نہیں ۔۔" وہ اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ کر چیخا اور بیگم مُراد نے آنکھیں کھول دیں اور نور احمد خود کو ایک طوفان کے مقابل کھڑا محسوس کرنے لگا۔ وہ مُسکرائی۔ اس کی مُسکراہٹ میں فاتحانہ غرور تھا۔ "یقیناً عورت کا یہی رُوپ ہے جس نے ہر زمانے میں مرد کو زیر کیا ہے۔" نور احمد نے سوچا، وہ اس عورت کی فاتحانہ شانِ بے اعتنائی سے مُسکراتی آنکھوں کی تاب نہ لا سکا۔ اور بھاگ کر دوسرے کمرے میں داخل ہو گیا اور اندر سے کُنڈی چڑھا کر سوچنے لگا کہ اب کیا کرے۔ بیگم مُراد بھی چند لمحے مُسکراتی اور سوچتی رہی۔ پھر وہ لباس دُرست کرتی اُٹھی۔ زیرو کے بلب کو اُس نے بجھا دیا اور معنی خیز انداز سے کہا "اب زیرو کے بلب کی ضرورت نہیں رہی"۔ پھر وہ بانو کی سنگار میز کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ اُس نے انگڑائی لی اور بازوؤں جھٹکے کے ساتھ پھیلائے جیسے تمام غم و فکر اُتار کر پھینک دیے ہوں۔ وہ چند لمحے آئینے میں اپنے سراپا کو دیکھتی رہی پھر بیچ والے دروازے کے قریب آئی اور ایک آرام کرسی پر بیٹھ گئی۔

دروازے کے اُدھر نور احمد فرش پر بیٹھا کراہ رہا تھا جیسے کسی کرب میں مُبتلا ہو۔ بیگم مُراد نے دروازے کو ذرا سا چھیڑا اور پاؤں سے ہلکی سی آہٹ پیدا کی اور نور احمد دم بخود ہو کر سوچنے لگا۔ "وُہی آہٹ ۔۔ بالکل وُہی ۔۔"

"نور احمد"۔۔ بیگم مُراد نے کہا "جو ہونا تھا ہو چکا۔ اب پریشان ہونے کی بجائے حالات کو سنبھالنے کی کوشش کرو"۔

اُدھر سے کوئی جواب نہ آیا تو بیگم مُراد نے پھر کہا "نور احمد میری سمجھ میں یہ نہیں آ رہا کہ تم اس قدر پریشان کیوں ہو۔ یہ واقعہ اگر کسی پریشانی کا سبب ہو سکتا ہے تو صرف میرے لئے ہے۔ لیکن مَیں پریشان نہیں ہُوں۔ میں نادم بھی نہیں ہُوں۔"

ان الفاظ سے نُور احمد کو یہ اطمینان تو ہو گیا کہ وہ تنہا قصُور وار نہیں ہے اور اس کا یہ

خدشہ بھی جاتا رہا کہ یہ عورت جاگ کر نہ جانے کیا اُدھم مچائے گی لیکن وہ خود میں اتنی ہمت نہیں پاتا تھا کہ دُنیا کے سامنے جا سکے۔ اس دُنیا کے سامنے جو باہر گلی سے شروع ہوتی تھی اور پھر جس کا کوئی دوسرا کنارا نہ تھا۔

دل سے ایک خوف کم ہوا تو اس کی جگہ شدید نفرت نے لے لی۔

"نور احمد کیا تم سو گئے ہو؟" بیگم مُراد نے سوال کیا۔

"اُس جاگنے سے بہتر تھا کہ میں سویا رہتا۔ آپ نے مجھ پر ظلم کیا ہے میں گناہ کے احساس سے مر جاؤں گا۔"

"نہ میں نے کوئی ظلم کیا ہے اور نہ تم نے کوئی گناہ۔"

"جی!؟"

"تم نے کوئی گناہ نہیں کیا۔ تم نے ایک شخص کی پیاس بجھائی ہے جو کوسوں پیدل چل کر تمہارے پاس آیا تھا۔ ایسے لوگوں کا درجہ فرشتوں کے برابر ہوتا ہے۔"

"یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟" نور احمد چکرا گیا۔ اسے توقع تھی ایک طوفان کی۔ مگر یہاں اسے دور ساحل پر ایک پُرسکون ہوا سے سامنا تھا۔

"ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہوں"۔ پُرسکون آواز آئی۔

"مگر — آپ نے — آپ نے بانو سے میری شادی کی ہے۔ اور وہ آپ کی بیٹی ہے۔"

"عورت اتنی بڑی قربانی بہت کم دیتی ہے۔"

"قربانی!؟؟؟"

"ہاں — قربانی — کیا تم نہیں سمجھتے — یا جان بوجھ کر انجان بن رہے ہو؟"

"آپ نے اپنے علاوہ بانو پر، مجھ پر اور مُراد میاں پر، سب پر ظلم کیا ہے۔ آپ ہم سب کی گناہ گار ہیں۔ — ہم سب کی — ہم سب کی اور —

اور آپ خدا کی گنہ گار ہیں۔ آپ نے مُراد صاحب ایسے فرشتہ آدمی سے دغا کی ہے۔"

"مُراد صاحب اور فرشتہ؟" بیگم مُراد کی آواز ایک دم طنزیہ ہو گئی اور اس نے ایک نفرت بھرا مختصر سا قہقہہ لگایا۔ "ہاں، کہتے تو ٹھیک ہو۔ جو شخص مرد ہو کر کبھی مردوں والا کام نہ کرے وہ فرشتہ ہی ہو سکتا ہے۔ تم نے ان کو باہر سے دیکھا ہے اور میں ان کو اندر سے جانتی ہوں۔ تم سوچ رہے ہو کہ مجھے کیا ہوا ہے۔ تم نہیں جانتے لیکن میرے گھر کی دیواریں جانتی ہیں مجھے کیا ہوا ہے — اور اب تو شاید تم بھی جان گئے ہو گے — اور سمجھ گئے ہو گے کہ آدمی کا وقار آدمی بننے میں ہے نہ کہ فرشتہ بننے میں۔ — تمہاری طرح فرشتہ بننا اور بات ہے تم نے تو گویا غیبی سہارا دیا ہے۔"

"آہ! آپ کس قدر خود غرض ہیں۔ آپ نے مجھے جہنم کی آگ میں جھونک دیا ہے حالانکہ میرا کوئی قصور نہ تھا۔ آپ نے مُراد میاں اور بانو کے حقوق غصب کیے ہیں۔ میں ذہنی پریشانی میں پھنس گیا ہوں حالانکہ میرا کوئی قصور نہ تھا۔ کوئی قصور نہ تھا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ کیا کروں۔"

"تمہارا کوئی قصور نہیں؟ یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟" بیگم مُراد نے پینترا بدلا۔ "سب قصور تمہارا ہے۔ ایسے معاملات میں قصور ہمیشہ مرد ہی کا ہوتا ہے۔ میں نے تو صرف یہ دیکھا کہ تم تھکے تھکے سے ہو اور میں تمہارا سر دبانے لگی مگر تم نے میرے ہاتھ کو پہلے ذرا سا دبایا پھر اپنی جانب کھینچ لیا۔ میں نے کچھ نہ کہا اور دوسرے ہاتھ سے تمہارا سر دباتی رہی مگر تم نے اس ہاتھ کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا۔ پھر تم نے میرے ہاتھوں کی ہتھیلیوں کو یوں آپس میں ملا دیا جیسے میں کسی دیوتا کے حضور میں کھڑی ہوں۔ آخر تم نے خود کو کیا سمجھا تھا۔ تم نے میری حیثیت اور میرے رُتبہ اور میرے رشتے کی پرواہ نہ کرتے ہوئے میری انگلیوں کو چوما میری کلائیوں پر اپنے گال رگڑے، میری گردن اور شانوں پر بوسوں کی بارش کر دی۔ پھر تم نے مجھے پوری کی پوری کو اپنی طرف کھینچ لیا ...... پھر تم نے ......

پھر تم نے تمام حدوں کو توڑ دیا...... اور اب بھی تم کہتے ہو کہ تمہارا کوئی قصور نہیں ؟"

"بس بس — شیطان صفت عورت، میں اپنی ذلت کا بدلہ تجھ سے ضرور لوں گا" نور احمد نے چیخ کر کہا اور غصے سے دروازے کی کنڈی کھول کر زوردار جھٹکے کے ساتھ دروازے کو کھولنا چاہا۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ ایسا کر سکے بیگم مراد نے انتہائی پھرتی اور چالاکی سے اپنی جانب کی کنڈی چڑھا دی۔

دروازے کی کھڑکھڑاہٹ کے ساتھ بیگم مراد کا ہلکا سا قہقہہ بھی اس کو سنائی دیا اور وہ غصے میں بولتا رہا "اخلاق باختہ عورت تو ایک روز ضرور اپنی سزا پائے گی......"

"یہ اخلاق و خلاق کی باتیں میں نہیں جانتی۔ ویسے تمہیں بھی یہ باتیں کچھ ایسی زیب نہیں دیتیں۔ میں اخلاق باختہ تھی تو تمہیں کیا ہوا تھا — غور سے سنو، یوں پریشان ہونا فضول ہے اگر میں ابھی شور مچا دوں تو جانتے ہو تمہارا کیا حشر ہوگا — آرام سے لیٹ جاؤ اور زندگی سے سمجھوتا کرنا سیکھو۔"

اس کمرے میں بھی ایک بستر تھا۔ اس نے بستر کو حسرت سے دیکھا مگر کنڈی چڑھانے کا ہوش نہ رہا۔ پھر بستر کے قریب رک کر سوچنے لگا" یہ بستر بھی پلید ہے —— ہر بستر پلید ہے — بستر کی حرمت ختم ہو چکی ہے — بستر کا ایک شیطان صفت عورت سے تعلق ہے — میں اب بستر پر نہیں سو سکتا —— یہ جہنم کی آگ اپنے اندر چھپائے ہوئے ہے —"

اس نے بستر کو لپیٹ دیا اور کمبل ہی میں لپٹ لپٹا کر صوفے پر جا بیٹھا۔ یہ اس کا پرانا پہلی شادی والا صوفہ تھا جو نیا سامان آنے پر اس کمرے میں رکھ دیا گیا تھا۔ اس کے ذہن کا گرداب وقفوں سے زندہ ہو جاتا تھا اور بیگم مراد کے الفاظ بار بار اس کے کانوں میں گونج رہے تھے "تم نے ان کو باہر سے دیکھا ہے۔ میں انہیں اندر سے جانتی ہوں...... میرا بستر جانتا ہے کہ مجھے کیا ہوا ہے!...... مراد اور فرشتہ!؟...... آرام سے لیٹ جاؤ اور زندگی سے سمجھوتہ کرنا سیکھو...... سمجھوتہ کرنا سیکھو..... سمجھوتہ..... سمجھوتہ..... سمجھوتہ...."

اذیت ناک خیالات میں کوئی کمی واقع نہ ہوئی۔ ان میں یوں اور اضافہ ہوا کہ ایکبارگی وہ تمام ناخوشگوار باتیں بھی اس کے ذہن میں ابھر آئیں جو اس نے اس عورت کے بارے میں سنی تھیں اور جن پر اس نے کبھی یقین نہیں کیا تھا۔ وہ سوچنے لگا" تو یہ سب کچھ سچ ہے...... تو کیا اس کے چاروں بچوں میں سے کوئی بھی مراد میاں سے نہیں ہے...... اور مراد میاں واقعی — واقعی بے بس ہیں، مجبور ہیں...... مگر وہ سب کچھ کیسے برداشت کرتے رہے...... جانتے بوجھتے وہ اس آرام اور خاموشی سے کیسے زندگی گزار رہے ہیں۔

— کیا انہوں نے بھی زندگی سے کوئی سمجھوتہ کر رکھا ہے — سمجھوتہ..... کیا...... واقعی سمجھوتہ کرنا ضروری ہے...... مگر انہوں نے شادی ہی کیوں کی..... یہ ظلم ہی کیوں کیا — اور اب ظلم کے دریا کے راستے میں میرا چھوٹا سا گھر کیوں آگیا — میرا کیا قصور تھا؟..؟

— مراد میاں کو اس جرم کی سزا ملنا سمجھ میں آسکتا ہے کہ انہوں نے ایک عورت پر ظلم کیا۔ لیکن میرا کیا قصور تھا؟ میرا کیا قصور تھا؟ — کیا نیکی کا یہی صلہ ہوتا ہے!..... کیا فطرت واقعی اندھی ہے جیسا کہ بعض لوگ کہتے ہیں.......... اوہ!!"

اس کا سر درد کرنے لگا تھا۔ اس نے سر کو گھٹنوں میں زور سے دبایا اور دونوں ہاتھوں سے سر کی پشت کو اپنی پوری طاقت سے سہلانے لگا۔ چند ہی منٹ گزرے ہوں گے کہ ایک خوفناک خیال نے سر اٹھایا۔

بانو کا باپ کون ہے؟؟!"

اور اس کے سر میں تیز و تند آندھیاں سی چلنے لگیں۔

یہ سوال سخت تکلیف دہ تھا۔ بانو ایسے شخص کو باپ سمجھے ہوئے تھی جس کا اس سے کوئی تعلق نہ تھا۔ پہلے تو نور احمد کو یہ اطمینان تھا کہ اکثر لوگ جھوٹ بولتے ہیں بالخصوص عورتوں کے سلسلے میں رائی کا پہاڑ بنا ڈالتے ہیں لیکن اب تو سب پردے اٹھ گئے تھے اور عریاں، بدشکل، کریہہ المنظر حقیقت سامنے کھڑی اس کا منہ چڑا رہی تھی۔ اس کی شرافت پر ہنس رہی

تھی اور تکلیف دہ خیالات تھے کہ اُمڈے ہی چلے آتے تھے "ہمارے نیچے ہوں گے وہ مُراد صاحب کو ہی نانا کہیں گے ــــ میں انہیں اصل حقیقت کیسے بتا سکوں گا ــ کیا میں بانو کو بتا سکوں گا کہ اس کا مُراد سے کوئی تعلق نہیں اور اس کی ماں آوارہ عورت ہے جس نے بیگم مراد نام کی ایک نقاب اوڑھ رکھی ہے ابھی شاید اُس کو کچھ بھی معلوم نہیں ہے۔ وہ ابھی بالکل معصوم معلوم ہوتی ہے۔ کیا یہ اطلاعات اس کی زندگی کو زہر آلود نہ کر دیں گی ـــــــ کیا میں اس کو ــ ؟ ۔۔۔۔ نہیں نہیں میں چھوڑنے کا خیال بھی دل میں نہیں لا سکتا اس کا کیا قصور ہے! ــ تو پھر کیا خاموش ہی رہنا پڑے گا ــ کیا ضمیر کو مار ڈالوں ــ حقائق سے سمجھوتہ کر لوں کیا مجھے واقعی یہ سمجھوتہ کر لینا پڑے گا ــ ؟"

اُس نے سر کو کئی بار جھٹکے دیئے اور اسے دونوں ہاتھوں میں یوں تھام لیا جیسے کوئی گرتی ہوئی دیوار کو سہارا دے رہا ہو۔ دماغ میں ایک گرداب تھا ــ ایک طوفان تھا۔ ایک شور تھا کہ تھمنے کا نام نہ لیتا تھا ــ ریل گاڑیاں، جہاز، سڑک کوٹنے کے انجن اس کے سر میں ٹکرا ٹکرا کر پاش پاش ہو رہے تھے اور سر تھا کہ سلامت تھا۔

اور وہ سوچتا رہا۔ "بانو بہت اچھی ہے۔ بہت نیک ہے ــ وہ تو ان تلخ حقائق سے واقف ہی نہیں ہے میں اس سے یہ راز چھپائے رکھوں گا ــ میں اس کی زندگی کو تلخ نہ ہونے دوں گا ــ سب عورتیں ایک سی نہیں ہوتیں۔ سب مرد بھی تو ایک سے نہیں ہوتے ــ مجھے اس سے نفرت کرنے کا کوئی حق نہیں ــ مجھے اس کی حفاظت کرنا چاہیئے ــ وہ میری ہے ــ وہ مُراد علی کو باپ سمجھتی ہے ــ سمجھتی رہے۔ کیا فرق پڑتا ہے ــ کچھ فرق نہیں پڑتا۔"

اُس نے اطمینان کا ایک مختصر سا سانس لیا ہی تھا کہ پھر اذیت ناک خیالات کا ایک ریلا آیا۔ "مگر لوگ ــ لوگ تو بہت کچھ جانتے ہیں ـــ ایک نہ ایک دن بانو کو سب کچھ معلوم ہو جائے گا ـــ پھر ـــ پھر کیا ہو گا؟ ــ لوگ بہت ظالم ہوتے ہیں ـــ تکلیف پہنچا

کر تماشہ دیکھتے ہیں ــ علیحدگی ہی بہتر ہے، کوئی نہ کوئی بہانہ مل ہی جائے گا ــ اگر اس کے ہاں میرا بچہ ہو گیا تو ـــ اور اگر بچی ہو گئی تو؟ ــ تو کیا ہو گا؟ اس کی پرورش اُسی گھر میں ہو گی ۔۔۔ نہیں نہیں ـــ وہ میرے پاس رہیں گے ـــ میں ان کا محافظ ہوں ـــ"

انہی خیالات میں غلطاں وہ کچھ دیر کے لئے سو گیا اور جب اس کی آنکھ کھلی اس وقت روشندانوں سے روشنی جھانک رہی تھی۔ روشندان سے صبح کے سورج کی پہلی کرنیں سامنے پلنگ پر گول لپٹے ہوئے بستر پر پڑ رہی تھیں۔ رات کے واقعات اُسے خاصی دور افتادہ شے معلوم ہونے لگے لیکن یہ احساس زیادہ دیر قائم نہ رہ سکا تاہم روشنی میں وہ خود کو کچھ باحوصلہ ضرور پا رہا تھا ــ اُس نے بیچ کے دروازے کی جانب نفرت اور بے چارگی سے دیکھا اور پھر لباس میں تھوڑا سا رد و بدل کر کے کمرے کا گلی والا دروازہ کھول کر باہر نکل گیا

دوسرے کمرے میں موجود عورت بھی جاگ چکی تھی اور اس کی توجہ برابر ادھر لگی تھی ــ اس کو معلوم ہو گیا کہ نُور احمد گلی میں نکل گیا ہے۔ وہ بھاگم بھاگ چھت پر پہونچی اور دیوار کے جنگلے سے اسے جاتا دیکھنے لگی ــ آہستہ آہستہ چلتا ہوا وہ کتنا دلکش لگ رہا تھا ــ وہ گلی کی نکڑ سے گذر کر سڑک پر پہنچا اور پھر دائیں جانب گھوم کر غائب ہو گیا۔ جیسے مکانوں اور دکانوں کی دیواریں اسے ایک دم نگل گئی ہوں۔ اس نے رخ پھیرے بغیر زیر لب کہا ــ

"نُور احمد اگر تم بانو کے باپ کے بارے میں پریشان ہو تو میں تمہیں بتا دینا چاہتی ہُوں میں تمہیں بتا دوں گی کہ شیر علی اس کا باپ نہیں ہے۔"

وہ کمرے میں واپس آئی اور آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر اپنے سراپا کا نظارہ کرنے لگی ــ

"گناہ!" اس نے آہستہ سے کہا ــ "ہونہہ گناہ!" وہ مُسکرا دی "بیوقوف ناشکرا!" ــ

اُس نے دیکھا آئینے میں وہ تنہا نہیں تھی ــ اُس کے پیچھے ایک قطار میں چار مرد کھڑے تھے ــ مُراد علی، افتخار علی، (یہ نام آج اسے کتنے ہی برس بعد یاد آیا تھا) شیر علی اور نور احمد اور وہ سوچنے لگی "مذہب نے اجازت دی ہے کہ اگر بیوی مستقل بیمار رہے یا کوئی

اور جائز وجہ ہو تو مرد اور شادی کر سکتا ہے ۔ چار تک اجازت ہے ۔" اور وہ اپنے پیچھے کھڑے ہوئے چار آدمیوں کو دیکھ کر اور زیادہ مسکرائی۔

وہ پلٹی تو سامنے مینٹل پیس پر رکھی ہوئی نور احمد کی تصویر پر اس کی نظر جا پڑی۔ اس نے آگے بڑھ کر اس کو اٹھایا۔ چند لمحے اسے غور سے دیکھ کر مسکراتی رہی پھر اس کے چہرے پر ایکدم سنجیدگی کا بادل چھا گیا اور اس نے تصویر کو زور سے سنگار میز کے شیشے پر دے مارا۔ اس ایک واقعہ سے قطع نظر بیگم مراد کو اس صبح نے بالکل ویسا ہی پایا جیسی وہ عام طور پر نظر آتی تھی۔ اس نے اطمینان سے نہا دھو کر ناشتہ کیا اور پھر سب سے پہلا کام یہ کیا کہ خود بازار جا کر ایک آدمی کو بلا لائی جس نے سنگار میز اور نور احمد کی تصویر کے ٹوٹے ہوئے شیشے اٹھا کر ان کی جگہ نئے شیشے لگا دیے اور پھر اس گھر کو مقفل کیا اور اپنے گھر کی طرف چل دی۔

وہ جانتی تھی کہ نور احمد فوری طور پر اس کے گھر نہیں آئے گا، اس لئے اس نے آتے ہی کہہ دیا کہ افسران نے اس کی چھٹی منسوخ کر دی ہے اور کسی ضروری کام کے سلسلے میں چند روز کے لئے فوری طور پر باہر بھیج دیا ہے۔ یہ کوئی تسلی بخش بات نہ تھی لیکن اس کی بات کو الٹنا اس گھر میں ممکن نہ تھا۔ بالو کو دفتر والوں کی یہ سختی بہت بری لگی لیکن وہ کچھ نہ کر سکی تھی۔

(۱۱)

نور احمد کوئی فیصلہ نہ کر سکا کہ کیا کرے۔ اس کی کوشش یہ تھی کہ ان جگہوں سے دور رہے جہاں اس کے دوستوں اور واقفوں کے ملنے کے امکانات زیادہ تھے۔ رات وہ ایک گمنام سے ہوٹل میں جا رہا۔ وہ گھر سے دور چلا گیا تھا مگر اذیت ناک خیالات نے اس کا دامن نہیں چھوڑا۔ وہ ایک وفادار کتے کی طرح اس کی خوشبو سونگھتے اس کے تعاقب میں چلے آئے تھے۔ وہ یہ بھی فیصلہ نہ کر سکا کہ کسی مولوی سے فتویٰ لے یا دوستوں سے مشورہ کرے۔ ہر طرح بات پھیلنے اور بدنام ہونے کا خدشہ تھا اسی ادھیڑ بن میں دو دن گزر گئے۔ دوست اس کی اچانک گمشدگی پر حیران تھے۔ مراد میاں کے ہاں سے خاطر خواہ جواب

نہ پا کر انہوں نے دفتر سے بھی پتہ کیا لیکن کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ یہ محض اتفاق تھا کہ دوست محمد کی اس سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ دوست محمد اپنے کسی عزیز سے ملنے جا رہا تھا کہ راستے میں اسے نور احمد نظر آ گیا۔ اس کا چہرہ اترا ہوا اور زرد تھا اور داڑھی بڑھی ہوئی تھی۔ چہرے کا ایک ایک نقش اذیت کا اشتہار تھا۔ دوست محمد نے محسوس کیا کہ وہ اس سے بچ کر بھاگ نکلنا چاہتا ہے اس لیے وہ زیادہ تیز، مستعد اور محتاط ہو گیا اور اس تک جا ہی پہونچا۔ اس نے طے کر لیا تھا کہ وہ اب نور احمد کو اپنے ساتھ لئے بغیر واپس نہ ہو گا۔

اس کے مجبور کرنے پر نور احمد نے بہزار دقت اور بہت تامل کے بعد تمام حالات اس کو سنائے کچھ دیر تو دوست محمد کی سمجھ میں بھی نہ آیا کہ کیا جواب دے۔ آخر اس نے یہی مناسب سمجھا کہ مولوی حمید سے بات کی جائے۔ وہ جانتا تھا کہ بات پھیلے گی لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اس کو پھیلنے سے روکنے پر بھی کوئی قادر نہیں۔

وہ حمید کی بیٹھک پر پہونچے اور چق اٹھا کر اندر داخل ہو گئے۔ وہاں حمید کے علاوہ اختر، اطہر اور حیدر گنجا بھی موجود تھے۔ دوست محمد نے نور احمد کو ان کے سپرد کیا اور خود چائے کا آرڈر دینے کے لئے ہوٹل کی طرف چل دیا۔

اس کے باہر نکلتے ہی سب لوگ نور احمد پر پل پڑے۔

"ارے تو کہاں تھا اتنے دنوں سے ——؟"

"کیا شکل بنالی ہے"

"دُہرے میرے قیس عامری —— یہ تجھے کیا ہوا ہے۔ یہ دوست محمد تجھے کس دشتِ جنون سے پکڑ لایا؟"

"اسے کچھ نہ کہو بے چارے کی بیوی بھاگ گئی ہے" حیدر گنجے نے مصنوعی سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے اور اپنے گنجے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"ہیں!؟ کب!؟ کیوں!؟ کس کے ساتھ!؟ تو نے پہلے کیوں نہ بتایا؟" ان سب آوازوں

سے مل کر بنی ہوئی ایک آواز اُبھری۔

"پہلے کیا بتاتا!" حیدر نے وضاحت کی۔ "مجھے خود ابھی خیال آیا ہے۔ مگر پریشانی کی کوئی بات نہیں۔" حیدر نے لطف لیتے ہوئے کہا۔ "وہ ذرا میکے گئی ہے اپنی ماں کے ساتھ۔"

اور سب قہقہے لگانے لگے مگر نور احمد افسردہ اور خاموش بیٹھا رہا۔

"کوئی کہہ سکتا ہے کہ تیری شادی کو صرف چار روز ہوئے ہیں۔ اپنی صورت تو دیکھ۔ جیسوں کا بیمار لگتا ہے۔ سبھی کی بیویاں شادی کے فوراً بعد میکے جاتی ہیں۔ تیرے ساتھ کوئی نئی بات تو نہیں ہوئی۔ آخر تو سنیاس لینے پر کیوں آمادہ ہے؟" اختر راٹھور نے کہا۔

"تجھے کیا پریشانی ہے؟" حیدر گنجے نے سینے پہ ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ "کون تیرے راستے میں آیا ہے۔ تو اشارہ کردے باقی ہم خود سمجھ لیں گے۔ تو اپنی مشکل ایک بار ہم سے کہہ تو دے پھر دیکھ یاروں کے حوصلے۔ کچھ بول تو سہی۔ بول کہ تھوڑا وقت بہت ہے۔ ۔ ۔ بول"

نور احمد خاموش رہا۔

"ابے کچھ بکے گا بھی!" اختر راٹھور چلایا۔

نور احمد پھر خاموش رہا۔

اچانک مولوی حمید کے بستر میں پڑے ہوئے لحاف میں زلزلہ آیا اور اندر سے کسی نے یا علی کا نعرہ لگا کر کہا۔

دیکھ ابے اختر راٹھور

پتھر سے ماتھا مت پھوڑ

اور پھر سب قہقہے لگانے لگے۔ یہ عاشق مزنگی تھا جسے سردی کچھ زیادہ ہی لگتی تھی اور جو آتے ہی مولوی حمید کے بستر پر قبضہ جما لیتا تھا۔ اگر کبھی مولوی حمید بستر میں ہوتا تو بھی وہ بے دھڑک گھستا ہی چلا جاتا یہاں تک کہ مولوی حمید بستر چھوڑ کر ایک کمبل میں لپٹ لپٹا کر آرام کرسی پر جا بیٹھنے پر مجبور ہو جاتا۔ وہ اس اُونٹ کی طرح تھا جو سر چھپانے کی جگہ مانگ کر پورے خیمے

پر قابض ہو گیا تھا۔ وہ مولوی حمید، اختر، نور احمد اور دوست محمد کا ہم عمر اور ہم جماعت تھا مگر چوتھی جماعت سے ہی بھاگ نکلا تھا۔ پرانی دوستی پر وہ جان دیتا تھا۔ یہ کسی کے بس میں نہ تھا کہ اس پر کوئی پابندی لگا سکے۔

عاشق مزنگی کو وہاں پا کر نور احمد کو بہت دُکھ ہوا۔ وہ اس کی بے ہودگی سے ہمیشہ نالاں رہا تھا۔ اور اس وقت اس کی موجودگی اسے جرم کی تشہیر کا یقینی اور مکمل سامان معلوم ہو رہی تھی

نور احمد کی خاموشی اب پریشانی کا سبب بنتی جا رہی تھی۔ سب کو خیال ہونے لگا تھا کہ ضرور کوئی خطرناک بات ہے۔ چنانچہ مولوی حمید نے اسے شانے سے جھنجھوڑ کر کہا۔ "تو بولتا کیوں نہیں۔۔۔ آخر ماجرا کیا ہے؟"

ارے بھئی یہ کیا بولے گا۔" لحاف میں زلزلہ آیا۔ "ہم سے پوچھو، سالا نامرد ہے۔۔۔ ورنہ عورت کی مجال ہے کہ شادی کے دو روز بعد بھاگ جائے اور پھر خود سے واپس نہ آئے"

پھر ایک قہقہہ بلند ہوا۔ ایسے لگتا تھا جیسے صرف ماحول کو ٹھیک کرنے اور پریشانی سے بچنے کے لئے یہ قہقہہ لگایا گیا ہو۔

عاشق مزنگی کے الفاظ نے نور احمد سے برداشت کی قوت چھین لی۔ اس کا چہرہ ایکدم زرد پڑ گیا۔ پھر اسے اتنی ہی تیزی سے غصہ آیا اور چہرے پر آگ سی پھیل گئی اور وہ بلند آواز سے چیخا۔۔۔

"بکواس مت کرو!"

اس کی آواز میں دُکھ تھا۔ چند لمحے وہ فرش کی طرف دیکھ کر کچھ سوچتا رہا۔ پھر اٹھا اور دروازے کی طرف بڑھا۔ مولوی حمید فوراً راستے میں آکھڑا ہوا اور اسے پھر اپنی جگہ پر بٹھا دیا گیا۔

"تو دوستو توڑ دی ہے اس کی چپ۔۔۔ سالا بڑا اکڑتا تھا۔۔۔ وہ کون سا کام ہے جو ہم نہ کر سکیں۔" عاشق مزنگی نے بڑے فخر سے کہا اور پھر زیر لب بڑبڑایا۔ "کتابوں کی بات دوسری ہے پڑھنا لکھنا بھی کوئی کام ہے؟"

مولوی حمید نے اب سمجھانے کے انداز میں گفتگو شروع کی۔ "دیکھو بھائی تمہاری پریشانی سے ہم بھی پریشان ہیں جب تک تم خیالات ہم پر واضح نہیں کرو گے یہ لوگ اسی طرح تمہیں پریشان کرتے رہیں گے۔"

"اگر تمہیں واقعی کوئی ایسی ویسی بیماری تھی تو شادی سے پہلے ہی کہہ ڈالتے۔" حیدر نے ایک آنکھ بند کر کے اپنے گنجے سر کو شرارت سے کھجاتے اور اپنی مسکراہٹ کو دباتے ہوئے کہا۔

"مجھے کوئی بیماری نہیں ہے۔ تم سب پاگل ہو گئے ہو۔" نور احمد نے دکھ سے کہا۔

"تو وہ کیوں بھاگ گئی تیری ماں؟" عاشق مزنگی نے ایک اور بندوق داغی۔

نور احمد کا جی چاہا کہ اٹھ کر عاشق مزنگی کا گلا دبا دے۔

"میں تمہیں مار ڈالوں گا حرامزادے!" اس نے غصے سے کہا اور ہاتھ ہوا میں اٹھا کر پلنگ کی طرف بڑھا۔

"باپ رے باپ۔ اس کے سر پر تو خون سوار ہے۔ بچاؤ بھئی بچاؤ ــ بچاؤ۔" عاشق مزنگی نے لحاف کو اچھی طرح مضبوطی سے اپنے سارے جسم کے گرد لپیٹ کر شرارت سے کہا۔ نور احمد پلنگ کے قریب پہنچ کر رک گیا۔ سامنے ریشمی لحاف سے سر باہر نکالے بیگم مراد لیٹی تھی...... اس کا سر چکرانے لگا۔ اب ذہن ایک زبردست گرداب کی گرفت میں تھا۔ "تم مجھے نہیں مار سکتے۔ مجھے کون مار سکتا ہے۔ مجھے کوئی نہیں مار سکتا...... زندگی سے سمجھوتہ کرنا سیکھو۔ سمجھوتہ...... ہا ہا ہا ــــ وہ اسے امی جان کہا کرتا تھا.... اور اب بھی تم کہتے ہو کہ تمہارا کوئی قصور نہیں...... تو وہ کیوں بھاگ گئی تیری ماں.... تیری ماں........ ہا ہا ...... وہ اسے امی جان کہا کرتا تھا.... مجھے کوئی نہیں مار سکتا..........."

قریب تھا کہ نور احمد چکرا کر گر جاتا کہ اختر راٹھور نے اٹھ کر اس کو سنبھالا اور واپس لا بٹھایا۔ عین اس وقت دوست محمد داخل ہوا۔ اس کے ساتھ ہوٹل کا ملازم تھا جو چائے رکھ کر چلا گیا۔ دوست محمد

نے گفتگو کا آخری حصہ سن لیا تھا اور اب نور احمد کی شکل دیکھ کر اس نے اندازہ کر لیا کہ اسے بہت دق کیا گیا ہے چنانچہ اسے مزید پریشانی سے محفوظ رکھنے اور اصل پریشانی کا حل تلاش کرنے کی غرض سے اُس نے مختصراً سارا واقعہ سنا دیا۔ جسے سن کر حیدر گنجے کے سر میں سخت کھجلی ہونے لگی اور کمرے میں ہُو کا عالم طاری ہو گیا ــــــ سب چپ تھے ــــــــ خاموشی اتنی گہری تھی کہ سب کو ایک دوسرے کی سانسوں کی آواز قریب چلتی ہوئی آندھی کی طرح معلوم دیتی تھی۔

"کیا یہ سب سچ ہے؟" مولوی حمید نے حیرانی سے پوچھا۔ "ہم سب تمہیں نیک فرشتہ سمجھتے تھے۔ مجھے تم سے یہ توقع ہرگز نہ تھی۔ نور احمد تم نے بہت برا کیا۔"

"میں نے کچھ نہیں کیا ــــ میں نہیں جانتا یہ کیسے ہو گیا ــــ میرا کوئی قصور نہیں ــــــ" نور احمد نے عاجزی سے کہا۔

"کچھ کرنا اور کسے کہتے ہیں؟" مولوی حمید نے برہمی سے کہا۔ "ہر گنہگار اور ہر مجرم یہی کہتا ہے جو تم کہہ رہے ہو۔ تم چاہتے تو خود کو بے قابو نہ ہونے دیتے۔"

نور احمد کی بے بسی دیکھنے کے قابل تھی۔ اس کا چہرہ صاف کہہ رہا تھا۔ "کاش میں یہاں نہ آتا!"

"اس بحث سے کچھ حاصل نہ ہو گا۔" دوست محمد نے کہا۔ "حمید تم کچھ زیادہ ہی کٹرپن کا ثبوت دے رہے ہو اس معاملے میں تو زلیخا ایسے نام۔"

"بس ــ رہنے دو ــ نیک لوگوں کے ناموں کو اس معاملہ میں نہ لاؤ۔" مولوی حمید نے احتجاج کیا۔

"تمہارے اس غلط احتجاج پر تو یہ ذکر اور ضروری ہو گیا ہے۔ تمہیں سننا ہی پڑے گا تم جانتے ہو کہ زلیخا نے کیا کیا اور یہ جانتے ہو کہ خدا نے اسے معاف کر دیا۔ تم یہ بھی جانتے ہو کہ نور احمد نے دانستہ غلطی نہیں کی اور اس کے باوجود اس کی مدد کرنے کے بجائے اسے اور دکھ پہنچا رہے ہو۔ میں اس کو یہاں اس لئے لایا تھا کہ سب مل کر اسے اس مصیبت سے نجات دلائیں

تم دیکھتے نہیں وہ کس قدر شرمندہ ہے کتنا نادم ہے۔" دوست محمد نے اعتماد سے کہا۔

ان الفاظ کا حمید پر خاطرخواہ اثر ہوا اور وہ فرش کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "یہ کس قسم کی عورت ہے؟ یہ کیسی ماں ہے؟ یہ عورت ہے یا ڈائن؟ مائیں ایسی نہیں ہوتیں۔"

"دنیا میں ہر طرح کے لوگ ملتے ہیں۔" دوست محمد نے سمجھانا چاہا۔ "آئے دن اخباروں میں ایسی خبریں آتی رہتی ہیں کہ کوئی عورت چھ بچوں کو چھوڑ کر بھاگ گئی۔ اس مسئلے پر بحث کا وقت نہیں ہے کہ کوئی ماں ایسی کیسے ہو سکتی ہے۔ ہمارے سامنے اس وقت ایک ماں ہے جو ایسی ہی ہے اور ایک دوست ہے جو بے قصور ہے اور یہ واضح ہے کہ ان حالات میں بالو کا اپنی ماں کے پاس رہنا درست نہیں ہے۔" "گناہ بہرحال گناہ ہے۔" مولوی حمید نے قدرے نرمی سے کہا۔ "اور گنہگار کی رعایت کرنا بھی گناہ ہے۔ میں کہتا ہوں اگر مراد میاں کسی کام کے نہ تھے تو ان کی شادی ہی کیوں کی گئی؟"

یہی تو اصل سوال ہے۔" اختر راٹھور نے کہا۔ "اور اس کا جواب ہی بیگم مُراد کو ایک حد تک اور نور احمد کو بڑی حد تک قابلِ معافی ثابت کرتا ہے۔"

"یعنی؟"

"یعنی یہ کہ تم اصل حالات کو نظرانداز کر رہے ہو۔" اختر راٹھور پھر بولا۔ "تم اس عورت سے واقف نہیں ہو اور نہ ہی اس کے حالات کا علم رکھتے ہو، نہ ہی تم نے ان حالات کو جاننے کی خواہش کا اظہار کیا اور یکطرفہ کاروائی عمل میں لے آئے۔ ہماری بیگم مراد سے دُور کی رشتہ داری ہے۔ تعلقات تو نہ ہونے کے برابر ہیں مگر ہم ایک دوسرے کے حالات سے بخوبی واقف ہیں۔ بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں جن کا پوشیدہ رہنا ہی درست ہوتا ہے مگر حالات پردے اٹھا ہی دیتے ہیں۔ مُراد میاں واقعی صرف نام کے آدمی ہیں۔ لیکن کسی کے ماتھے پر تو نہیں لکھا ہوتا کہ مجھے فلاں بیماری ہے۔ اُس نے اپنے انداز میں ڈرتے ڈرتے شادی سے انکار کیا مگر کسی نے نہ سُنی۔ وہ چُپ ہو گیا۔ اُسے اُمید تھی کہ وہ ہومیوپیتھی کے ذریعے اپنا علاج کر لے گا۔ وہ ڈاکٹر اسی لئے بننا چاہتا تھا۔ شرم کے

مارے وہ کسی سے بات کرتا نہ تھا نہ ملتا تھا۔ اس کو صحیح رہنمائی بھی نہ مل سکی۔ ان حالات میں بیگم مُراد کا گمراہ ہو جانا گو اچھا نہیں ہے مگر اس میں کچھ زیادہ حیرت کی بات بھی نہیں ہے۔ اس مراد علی کو بھی داد دو جو چار عدد ایسے بچوں کو نہ صرف پال رہا ہے بلکہ ان سے محبت بھی کرتا ہے، جن سے اُس کا کوئی تعلق نہیں۔ شاید وہ یہ سب کچھ رضائے الہٰی سمجھ کر قبول کئے بیٹھا ہے۔ میں نے نہیں سُنا کہ اُس نے آج تک کسی سے کوئی شکایت کی ہو۔ شادی پر وہ زیادہ جرأت سے کام نہ لے سکا۔ اس پر افسوس تو کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس کے کردار کی فطری (یا غلط پرورش سے پیدا شدہ) کمزوری کو تم کیسے نظرانداز کر دو گے! — اور یہ تو ایک مثال ہے۔ نہ معلوم کتنے مُراد علی اس طرح نامُرادی کی زندگی گزارتے اور دوسروں کے بچے پالتے ہیں — ایک پردہ اُٹھ گیا اور تم بلبلانے لگے ہو۔ ذرا زندگی میں ڈوب کر دیکھو یہاں کیا ہو رہا ہے۔ اور کیا کیا برداشت کرنے اور کیا کیا معاف کرنے کی ضرورت ہے......"

"ایسی مثالیں بھی تو ملتی ہیں جب اس قسم کے حالات میں عورتوں نے انتہائی پاکیزگی اور عفت کی زندگی گُزار دی۔ کھلی چھٹی دے کر معاشرے اور اخلاق کی تباہی کے سامان پیدا کرنے کی اجازت بھی تو نہیں دی جا سکتی — جُرم کی سزا نہیں ملے گی تو جُرم کا احساس کیسے پیدا ہو گا؟" "میں یہ کب کہتا ہوں کہ جرم کی سزا نہ دی جائے۔" اختر نے کہا۔ "میں تو یہ کہتا ہوں کہ حالات کا مطالعہ بھی ضرور کیا جائے — پابندیاں لگائی جائیں، ضابطے بنائے جائیں لیکن جُرم کو عام زندگی اور مُجرم کے حالات سے کاٹ کر دیکھنا کہاں کا انصاف ہے۔ اور پھر جنس کا جذبہ کون نہیں جانتا کتنا ظالم ہے — جہاں اُسے ضبط میں رکھنا ضروری ہے وہاں بعض رعائتیں دینا بھی ضروری ہے بالخصوص اس وقت جب حالات بھی خاص ہوں — پھر فرد کے سلسلہ میں تم معاشرتی کمزوریوں اور ظلم کو کیوں بھُول جاتے ہو۔ یہ بھی خوب انصاف ہے کہ اخلاق کے نام کا لٹھ اُٹھایا اور آنکھیں بند کر کے دے مارا — کسی کا سر ٹوٹا کسی کا ہاتھ اور جناب کو اطمینان ہو گیا کہ گنہ گاروں نے اپنے کئے کی سزا پائی — اور لُطف کی

بات یہ ہے کہ سزا تجویز کرنے پر سب آمادہ ملیں گے لیکن حالات کو ٹھیک کرنے کا عزم کسی کے پاس نہیں — ایک بات کا جواب دو۔ یہیں اس معاملے کا فیصلہ ہو جائے گا — ہم میں ایسے کتنے ہیں جن کو اپنے جنسی جذبات پر ہمیشہ اس قسم کا ضبط رہا ہو جس کا تم مطالبہ کرتے ہو؟ اور جن سے کبھی کسی قسم کی جنسی غلطی کا ارتکاب نہ ہوا ہو......؟"

"اب خاموش کیوں ہو؟ — ...... خاموش رہنے کے سوا کر بھی کیا سکتے ہو —! تمہاری خاموشی تمہاری شکست ہے۔ پھر ایسی مثالیں تاریخ میں بہت ملتی ہیں۔ ہملٹ کی ماں، میری آف سکاٹ لینڈ اور دیومالاؤں کے زمانے میں ہیلن اور کلائی ٹمنسٹرا — مولوی صاحب ذرا اس دنیا میں رہ کر سوچو — اور نور احمد سے پوچھو کہ وہ کیا ارادہ رکھتا ہے —"

"میرا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔" نور احمد نے آہستہ سے کہا۔ "ایک خوفناک خیال کو دباتا ہوں تو دوسرا زیادہ خوفناک خیال سر اٹھا لیتا ہے — مجھے ڈر ہے کہ بانو بھی اپنی ماں کے نقشِ قدم پر نہ چلنے لگے۔"

"بانو بہت نیک لڑکی ہے۔" اختر نے کہا۔ "اگر تم اس کو فوری طور پر اس ماحول سے نکال لاؤ گے تو وہ محفوظ رہے گی۔ تاخیر نقصان دِہ ہو سکتی ہے کیونکہ خراب ماحول سے بچنا آسان نہیں ہے۔ اور اب شادی کے بعد اس کی زندگی اور خیالات میں تبدیلی آنا بھی آسان ہے۔"

"یہ ٹھیک ہے۔" دوست محمد نے تائید کی۔

"لوگ بہت سی باتیں جانتے ہیں۔" نور احمد نے کہا۔ "یہ بھی کہ مراد میاں بانو کے باپ نہیں ہیں"

"اس میں بانو کا کوئی قصور نہیں۔ ہمیں تو یہ دیکھنا ہے کہ وہ نیک ہو بس — تم اپنی مثال ہی لے لو۔ تم بھی تو خود کو بے قصور سمجھتے ہو — تم نے تو کوئی غلطی کی بھی ہے۔ بانو کو کسی طرح بھی مطعون نہیں کیا جا سکتا۔" اختر نے کہا۔

"لیکن اس کا باپ —" نور احمد نے کچھ اور کہنا چاہا۔

"تمہارا باپ کون ہے نور احمد؟" اختر راٹھور نے ٹوک دیا۔ "کیا تم یقین سے کہہ سکتے

ہو کہ تم واقعی امداد علی کے بیٹے ہو؟ اسی امداد علی کے جس کی ناک تمہاری ناک سے دوگنی بلند تھی اور جس کی پیشانی تمہاری پیشانی سے دوگنا کشادہ تھی؟ — نمعلوم فطرت کس کس کا پردہ رکھے ہوئے ہے۔ ایک پردہ اٹھ گیا ہے اور تم پریشان ہو رہے ہو؟"

"اختر!" نور احمد چیخا۔

"چلاتے کیوں ہو!" اختر نے سمجھانے کے انداز میں کہا۔ "زندگی میں حادثوں اور مصیبتوں کی گنجائش رکھنا ہی پڑتی ہے۔ انسانی مجبوریوں اور کمزوریوں کو ان کا حصہ دینا ہی پڑتا ہے دوسروں کو معاف کرنا اس لئے بھی ضروری ہے کہ دوسرے بھی تمہیں معاف کر دیں۔ یہاں کوئی فرشتہ نہیں ہے۔ اگر تم یہ نہیں سمجھتے تو مجھے اس بات کا ثبوت دو کہ تم واقعی امداد علی کے بیٹے ہو، اسی امداد علی کے، جس کا بڑا بیٹا شیر علی شیر کی طرح جری اور آزاد تھا۔"

نور احمد نے سر گھٹنوں میں چھپا لیا، جیسے رونے لگا ہو۔ اختر نے محسوس کیا کہ تیر خطا نہیں گیا۔ چنانچہ وہ پھر بولا۔

"بانو اب عملی زندگی میں قدم رکھ چکی ہے۔ اب اس کے جذبات یقیناً پوری طرح بیدار ہو چکے ہیں۔ شادی کا تجربہ کوئی معمولی تجربہ نہیں ہوتا۔ اس وقت ذرا سی بھی لاپروائی اس کو نقصان پہنچا سکتی ہے۔ اور پھر اس کا گناہ تمہارے سر ہو گا یا پھر اس مولوی حمید کے سر جو انصاف کا لٹھ آنکھیں بند کر کے گھمانے کا قائل ہے۔ ایک بار پھر سُن لو اور غور سے سُن لو، بیگم مراد کی شادی اس سے پوچھ کر نہیں کی گئی تھی۔ مراد کو اس کی ذات کا حصہ قدرت اور حالات نے یوں بنا دیا جیسے گھن دانۂ گندم کا بن جاتا ہے اور دیمک لکڑی کا.... وہ جب گل رُخ تھی تو اس کے حسن کا بڑا شہرہ تھا۔ میرے بھائی شجاعت راٹھور نے بہت چاہا کہ اس سے شادی ہو جائے لیکن کوئی سننے والا نہ تھا اور بزرگوں کے حکم سے سرتابی جرم تھا اور پھر اُس ظلم کا کیا علاج جو فطرت خود روا رکھتی ہے۔ شجاعت بھائی نے ایک بار گل رُخ کو بھگا لے جانے کا پروگرام بنا لیا تھا مخالفت کرنے والوں میں مَیں بھی پیش پیش تھا اور آج مجھے افسوس ہے کہ میں نے کیوں نہ

بھائی کی مدد کی — ہمارے چاروں طرف خطرات ہیں اور دکھ ہیں۔ ہمارا کام مسلسل یہ ہے کہ اپنی اور دوسروں کی زندگی کو رہنے کے قابل بنائیں۔ یہ صرف ایک معمولی حد تک ممکن ہے اور یہاں تک جانے سے گریز نہیں کرنا چاہیئے۔ . . . . قصہ مختصر ——— اب ان سب باتوں سے مقصود یہ سمجھانا ہے کہ بانو کی واپسی کا فوراً انتظام کرو۔"

عاشق مزنگی اب تک نہ معلوم کیسے خاموش پڑا تھا۔ اس سنجیدہ بحث میں لوگ اسے کچھ دیر کے لئے بھول سے گئے تھے اور دوست محمد کو تو پریشانی میں خیال بھی نہ رہا تھا کہ عاشق بستر میں گھسا پڑا ہے۔ اس نے اپنی موجودگی کا پھر احساس دلایا اور کفن پھاڑ کر (یہاں لحاف منہ سے ہٹا کر) بولا۔ ارے بھائیو، ہم نے کُل چار جماعتیں پڑھیں۔ پر اکل کوئی کتابوں سے آتی ہے... میاں نور احمد جی کیوں اپنا جی ہلکان کرتے ہو۔ اپن کے ساتھ روز ایسے معاملے ہوتے رہتے ہیں اور اپن خوش ہیں۔ اپنی سمجھ میں تمہاری رونی شکل آتی نہیں۔ تم بُرا مان جاتے ہو ورنہ جی چاہتا ہے کہ گرہ میں باندھنے لائق ایک بات کہیں۔"

سب اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ انہیں یہ یقین کم ہی تھا کہ عاشق کوئی سنجیدہ اور مفید مشورہ دے گا پھر بھی وہ سننے کو بے تاب تھے کہ آخر اس کے دماغ میں کون سی بات ہے۔

ادھر عاشق مزنگی نے سب کو اپنی جانب متوجہ پایا تو ہونٹ بھینچ کر بیٹھ رہا اور باقی لوگ جو انتظار کھینچ رہے تھے اس سے لطف اٹھانے لگا۔

دوست محمد کو اس وقت یہ حرکت اچھی نہ لگی وہ مکا تان کر اٹھا ہی تھا کہ عاشق مزنگی نے لہک لہک کر گانا شروع کر دیا:

اپنا تو ہے یہی اصول
تازہ باسی کرو قبول
کرو قبول —— کرو قبول

وہ جانتا تھا کہ اس مشورے کے بعد اس سے کیا سلوک ہو گا چنانچہ اس نے فوراً مضبوطی سے لحاف کو جسم کے گرد کس لیا اور دوست محمد کے گھونسے ہنس ہنس کر کھاتا رہا۔

"ذلیل — کمینہ —" نور احمد چلایا۔ "مجھے گناہ کی ترغیب دیتا ہے۔ میں تمہیں —" اور وہ خاموش ہو گیا۔

"کہہ دو مار ڈالوں گا۔" عاشق چھیڑنے سے باز نہ آیا۔ "مارنے والی صورتیں ہی اور ہوتی ہیں سالا اتنا کچھ کرنے کے بعد بھی فرشتہ بنا پھرتا ہے۔"

نور احمد کچھ نہ کہہ سکا اس کے ذہن میں ایک اور ہی ریکارڈ بج رہا تھا۔ "تم مجھے نہیں مار سکتے تم مجھے نہیں مار سکتے — مجھے کوئی نہیں مار سکتا......"

اس نے بے بسی سے حمید کی طرف دیکھا۔ حمید نے عاشق کو سختی سے ڈانٹا اور کہا۔ "اختر کی رائے درست ہے۔ تمہیں واقعی بانو کے بارے میں کسی قسم کے شبہے کو دل میں جگہ نہیں دینا چاہیئے اور اس کی واپسی کا فوری طور پر انتظام کرنا چاہیئے اور تمہیں اپنے گھر بھی فوراً پہنچ جانا چاہیئے۔"

(۱۲)

وہ ہوٹل میں واپس آیا تو دوستوں کے دیئے ہوئے مشورے اس کے ساتھ تھے اور وہ ان پر عمل پیرا ہونے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اس نے مزید سوچا اور محسوس کیا کہ ابھی اس میں اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ خود مراد میاں کے گھر جاتا اور بانو کی واپسی کا مطالبہ کرتا۔ چنانچہ اس نے بانو کے نام ایک خط اس مضمون کا لکھا کہ میں بعض مجبوریوں کی وجہ سے ادھر نہیں آ سکتا تم فوراً چلی آؤ۔

خط ڈالنے کے بعد اسے احساس ہوا کہ اس نے کتنی بے کار بات کی ہے وہ جانتا تھا کہ خط بانو کو نہیں ملے گا۔ پھر بھی ایک موہوم سی امید تھی کہ شاید کسی طرح وہ اس خط کے مضمون سے واقف ہو جائے۔ بیگم مراد اسے پڑھ کر کہیں رکھ کر بھول جائے اور بانو کی نظر پڑ جائے یا کوئی اور ایسی صورت نکل آئے اور بانو ماں سے بغاوت کر دے۔

اگلے دن وہ اپنے گھر واپس چلا گیا۔ وہی گھر تھا۔ کوئی تبدیلی اس کو نظر نہ آئی۔ دن بھر وہ بانو کا

انتظار کرتا رہا مگر وہ نہ آئی۔ اُس نے ایک اور خط لکھا۔ تین دن اور گذر گئے۔ پھر اُس نے تیسرا خط لکھا مگر بے سُود۔ تیسرا خط اُس نے انتہائی مایوسی کے عالم میں لکھا تھا۔ اُس رات وہ بستر پر لیٹا تو معمول سے زیادہ افسردہ تھا اور محسوس کر رہا تھا کہ وہ بانو کو بے حد چاہتا ہے لیکن اسے حاصل کرنے کے لئے راستے کے اس بڑے پتھر بیگم مُراد کو یا تو ہٹانا پڑے گا۔۔۔۔ یا پھر اس کو زینہ بنانا پڑے گا۔۔۔۔۔۔ اس فیصلے پر بھی وہ کئی ہفتے عمل نہ کر سکا اور اس اُدھیڑ بُن میں رہا کہ اپنے فیصلے کو عملی صُورت دے یا نہ دے اور اگر دے تو کیوں کر؟

آخر ایک روز اس نے دل مضبوط کیا اور بیگم مُراد کو خط لکھا اور درخواست کی کہ وہ اس سے اس کے گھر آکر ملے۔ کیونکہ وہ کچھ ضروری باتیں کرنا چاہتا تھا۔

نور احمد کو پُورا یقین نہ تھا کہ وہ آجائے گی لیکن اگلی شام جب وہ آگئی تو وہ زیادہ حیران نہ ہوا کیونکہ اسے اس عورت کے حوصلے کا تجربہ ہو چکا تھا۔

ہلکے سبز رنگ کے لباس میں وہ بڑی دلکش نظر آ رہی تھی۔ نور احمد نے سوچا اگر شجاعت اس عورت پر مرتا تھا تو کیا بُرا کرتا تھا۔ وہ دیکھ کر حیران ہوا کہ بیگم مُراد کے چہرے سے کسی قسم کی پریشانی عیاں نہ تھی۔ اُسے یوں لگا جیسے یہ عورت کبھی بوڑھی نہ ہوگی۔ وہ دونوں کچھ دیر آمنے سامنے خاموش بیٹھے رہے اور ایک دوسرے کو یوں بار بار دیکھتے رہے جیسے دو پہلوان ایک دُوسرے کی طاقت کا اندازہ کر رہے ہوں۔

"میں نے بانو کے نام تین خط لکھے۔"

"وہ مجھے مِل گئے تھے۔"

"وہ آپ کے لئے نہیں بانو کے لئے تھے۔"

"وہ میرا گھر ہے بانو کا نہیں۔ بانو مجھ سے ہے نہ کہ میں بانو سے ہُوں۔"

پھر ایک وقفہ خاموشی کا آ گیا۔ یہ وقفہ طویل ہونے لگا۔

نور احمد اپنی جگہ سے اُٹھ کر بیگم مُراد کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ بیگم مُراد خاموش بیٹھی رہی۔ نور احمد

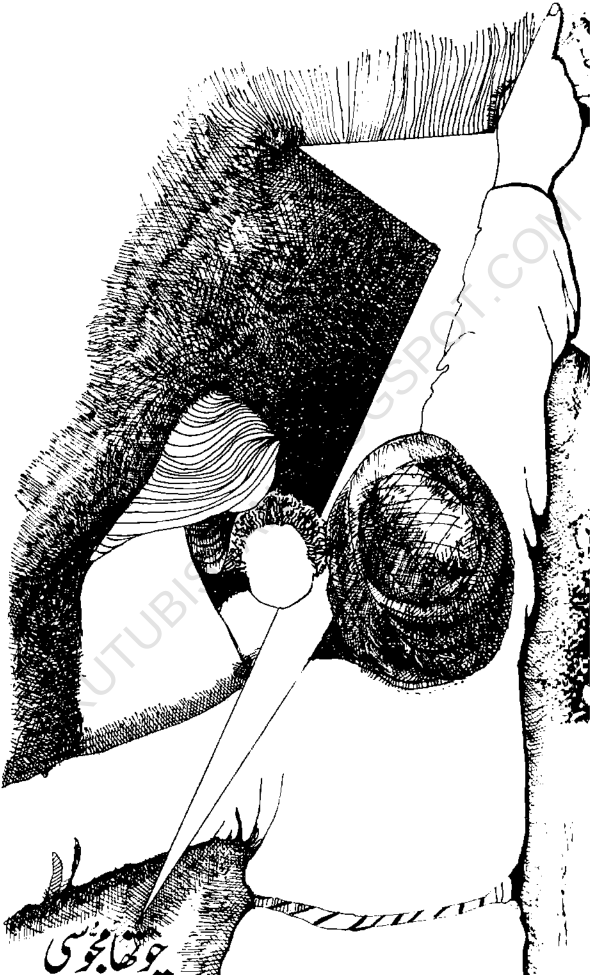
نے ایک قدم اور اٹھایا اور اس کے بالکل قریب ہو گیا۔ بیگم مُراد نے آنکھیں اُوپر اٹھائیں اور غور سے نور احمد کے چہرے کا جائزہ لیا۔ اُس کے چہرے پر عجب طرح کی دحشت برس رہی تھی جو اُس نے پہلے کبھی نہ دیکھی تھی۔ خوفزدہ ہونے کے باوجود وہ اسے خاموشی سے دیکھتی رہی اور منتظر رہی کہ وہ اگلا قدم اٹھائے۔

ایک خیال اس کے ذہن میں اُبھرا "کیا یہ واقعی مجھے مارنے کا ارادہ رکھتا ہے؟ کیا مجھے یہاں بلانے کا مقصد یہی تھا؟" اور پہلی بار اُس کے چہرے پر پریشانی کا ایک سایہ پھیل گیا۔ نور احمد کے دونوں ہاتھ اس کی گردن کی طرف بڑھے لیکن گردن سے ایک اِنچ اُدھر رُک کر واپس آ گئے۔ "یہ واقعی مجھے مار ڈالنا چاہتا ہے!" بیگم مُراد نے سوچا اور اس کی نظریں اب نور احمد کے ہاتھوں پر رُک گئیں۔

کتنے بے چین نظر آ رہے تھے وہ ہاتھ۔ انگلیوں میں کتنا خوفناک تناؤ تھا۔ جیسے گردن دبوچتے ہی جان قبض کر لیں گے۔ بیگم مُراد کی گردن سے کمر تک ایک کپکپی سی دوڑ گئی۔ نور احمد ایک دم اس کے سامنے فرش پر دوزانو بیٹھ گیا۔ اس کے ہاتھ پھر آگے بڑھے اور گردن کے بالکل قریب پہونچ گئے، بیگم مُراد کا جسم پسینے سے بھیگ گیا لیکن اس نے اپنے حواس قائم رکھے۔ پھر نور احمد نے چشم زدن میں اس کے دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں کو آپس میں یوں ملا دیا جیسے دیو داسیاں دیوتاؤں کے سامنے ملاتی ہیں اور انگلیوں کی پوروں کی حِنا کو چومنے لگا۔ پھر اس نے اس کی کلائیوں پر اپنے رُخسار ملے اور گردن اور کندھوں پر بوسوں کی بارش کر دی اور پھر اُس نے اسے اپنی جانب کھینچ لیا اور ان کے دماغ ریشمی لحافوں کی کئی تہوں کے نیچے دب کر سو گئے اور جسم جاگ اٹھے اور فرش پر ان دو جسموں نے نئی زندگی کی داستان لکھی — اور نیم بیہوشی کی حالت میں ایک جسم نے دوسرے سے کہا۔

"مُراد میاں سے طلاق لے لو۔"

اور دوسرے جسم نے جواب دیا۔ "نہیں — اس کی کوئی ضرورت نہیں!"


چوتھا مجوسی

میں نے سہا ہُوا قدم ایک بار پھر دروازے کی چوکھٹ سے باہر نکالا، یہ دیکھنے کے لئے کہ اب کیا ہوتا ہے۔ پھر وہی ہُوا، ستارہ اسی ایک مخصوص سمت میں بڑھتا ہُوا محسوس ہونے لگا، میں اور زیادہ سہم گیا۔

میں سوچنے لگا، مجھے دھوکا ہُوا ہے۔ صبح کا سورج خاصا بلند ہو چکا ہے۔ ہر طرف تیز روشنی پھیلی ہے ایسے میں آسمان پر ستارہ کیسے نظر آسکتا ہے۔ ایسا تو کبھی نہیں ہُوا۔ نہ کسی سے سنا نہ کہیں پڑھا کہ کبھی ایسا ہُوا ہو۔

ایک پاؤں جو چوکھٹ کے باہر تھا، ستارے میں تحرک کی وجہ سے تیزی کے ساتھ واپس آ گیا۔ آنکھیں بند کر کے میں دیر تک کھڑا رہا۔ یہاں تک کہ شام ہو گئی لیکن جب میں نے آنکھیں کھولیں تو وہی منظر سامنے تھا۔ ایک پہر دن گزر چکا ہو گا، سورج کی روشنی بہت تیز ہو گئی تھی اور وہ ستارہ اسی طرح اسی مقام پر چمک رہا تھا جہاں میں نے اُسے صُبح چھوڑا تھا۔

میں سفیدے کے اُس درخت کے بارے میں سوچ رہا تھا جو میرے گھر کے عقبی آنگن میں لگا ہے میں یہ سوچ رہا تھا کہ یہ درخت عقبی آنگن سے اُٹھ کر ادھر ڈیوڑھی کی طرف کیسے آ گیا۔ میری نظریں درخت کا

جائزہ لے رہی تھیں اور میں سوچ رہا تھا کیا یہ وہی درخت ہے؟ اگر یہ وہی درخت ہے تو یہاں کیوں کر آ گیا اور اگر یہ کوئی اور درخت ہے تو یہ پہلے یہاں کیوں نہیں تھا؟"

میری نظریں درخت کے تنے سے اوپر اٹھتی گئیں اور اس کی پھننگ پر آ کر رک گئیں۔ اسی پھننگ پر وہ ستارہ چمک رہا تھا۔

ستارہ بے چینی سے جھلملا رہا تھا جیسے کچھ کہنا چاہتا ہو۔

اچانک میں نے محسوس کیا کہ ستارہ واقعی کچھ کہہ رہا ہے اور میں اس کی زبان سمجھ رہا ہوں۔ میں نے اسے کہا "نہیں یہ ممکن نہیں۔ میں اپنا گھر چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گا۔ یہ ایک گوشۂ عافیت ہے میں اسے چھوڑ نہیں سکتا۔ اس چوکھٹ سے اُدھر کی دنیا سے میں اب بہت ڈرنے لگا ہوں۔ ایک بار پہلے میں اس گھر کو چھوڑ کر اُدھر نکل گیا تھا۔ پھر میں مدتوں اپنے گھر کا راستہ تلاش کرتا رہا۔ برسوں پریشان پھرتا رہا۔ میں یہاں سے چلتے ہوئے بہت کم اشیا ساتھ لے کر نکلا تھا اور بہت کچھ پیچھے چھوڑ گیا تھا۔ میرا خیال تھا ایسی جو کچھ یہاں چھوڑے جا رہا ہوں وہ سب بیکار اشیا ہیں۔ میں کبھی ان کی ضرورت محسوس نہیں کروں گا اور گھر کا کیا ہے جہاں چاہوں گا نیا گھر بنا لوں گا۔ میں اتنا عرصہ اس گھر سے دور رہا کہ پھر یہ بھی ٹھیک سے یاد نہ رہا کہ میں یہاں کیا کچھ چھوڑ گیا تھا۔ بس یہ بے چینی ہر وقت ساتھ تھی کہ جو کچھ میں پیچھے گھر میں بیکار سمجھ کر چھوڑ آیا ہوں وہی کچھ اہم تھا۔ میں بہت مشکل سے اپنے گھر واپس آیا۔ اب میں کہیں نہیں جاؤں گا۔ چوکھٹ سے اُدھر کچھ نہیں ہے۔ کچھ بھی نہیں ہے۔"

ستارے کی بے چینی بڑھ گئی اور اس کا یہ اصرار شدید تر ہو گیا کہ میں اس کے ساتھ چلوں۔

لیکن میں دروازے کو بند کر کے، اس کی کنڈی چڑھا کے، اس کے اس طرف یعنی ڈیوڑھی کے اندر اسے مضبوطی کے ساتھ اپنی کمر سے دبا کر بیٹھ گیا اور جب یوں بھی اطمینان نہ ہوا اور خوف کی ایک لہر جسم میں جاری رہی تو میں نے جیب سے رومال نکالا اور دونوں ٹانگوں کو ملا کر ٹخنوں سے ذرا اوپر رومال کس کے باندھ دیا۔

خوف بڑھتا ہی رہا کیوں کہ میں اب بھی ستارے کی قوت کو محسوس کر رہا تھا۔ آخر میں چلانے لگا "لوگو۔ لوگو۔ آؤ۔ دیکھو۔ کتنی عجیب بات ہے۔ دن کی تیز روشنی میں آسمان پر ایک ستارہ چمک رہا ہے۔ یہ ستارہ بول سکتا ہے

باتیں کر سکتا ہے۔ میں اس کی زبان سمجھتا ہوں، یہ مجھے باہر بلاتا ہے۔ لیکن میں ستاروں کے کھیل سے ڈرتا ہوں ـــــ میں تم ہی سے ہوں۔ لوگو ـــــ میں کہیں نہیں جانا چاہتا ـــــ مجھے بچالو، لوگو۔"

جواب میں بہت سی آوازیں آئیں۔ سب کا مفہوم ایک تھا:

"یوسف پاگل ہو گیا ہے۔"

"ہائے ہمارا یوسف پاگل ہو گیا ہے۔"

"افسوس خوبصورت اور ذہین یوسف پاگل ہو گیا ہے۔"

"پاگل ہو گیا ہے۔"

"پاگل ہو گیا ہے۔"

"نہیں لوگو ـــــ نہیں ـــــ دوستو، عزیزو ـــــ نہیں ـــــ تمہارا یوسف پاگل نہیں ہوا۔ وہ تو صرف اس ستارے سے ڈر گیا ہے ـــــ وہ تمہاری مدد کا طلبگار ہے۔"

"کس ستارے سے؟ کس ستارے سے؟" کئی آوازیں ایک ساتھ آئیں۔

"تو تم اس ستارے کو بھی نہیں دیکھ سکتے، یہ جو اتنی شدت اور بیقراری سے چمک رہا ہے؟ تو تم اسی لئے کہتے ہو کہ یوسف پاگل ہو گیا ہے؟ ـــــ مگر میں غلط نہیں کہہ رہا ہوں۔ یوسف پاگل نہیں ہوا اس کی نظر میں وسعت پیدا ہو گئی ہے۔ وہ تم سے بلند ہو گیا ہے۔ وہ زمین سے اوپر اٹھ گیا ہے۔ اب اس کی نظر دُور دُور تک پہنچ سکتی ہے۔ اُوپر اٹھ کر وہ چیزوں سے قریب تر ہو گیا ہے۔ وہ تم سے زیادہ دیکھتا ہے، تم سے زیادہ سنتا ہے، تم سے زیادہ جانتا ہے ـــــ ہاں ـــــ لیکن وہ ڈرا ہوا ہے۔ وہ جدائی کے زخم سہہ چکا ہے۔ وہ تم سے الگ نہیں ہونا چاہتا ـــــ آؤ لوگو ـــــ میرے قریب آؤ ـــــ میری مدد کرو ـــــ اس رہزن ستارے سے مجھے بچاؤ ـــــ میری باتیں سنو، پھر تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ تمہارا یوسف پاگل نہیں ہوا۔"

سب لوگ اندر گھس آئے لیکن دروازہ کھلا پا کر یوسف باہر نکل آیا۔ میں نے اسے بہت روکا لیکن ستارے کی قوت کا مقابلہ کرنا میرے بس کی بات نہیں تھی۔ میں نے چلا چلا کر کہا "رک جاؤ یوسف

رک جاؤ، کہیں مت جاؤ، واپس آجاؤ۔"

لیکن کون تھا جو میری صدا سنتا۔ میری آواز سے میرے کان گونج رہے تھے اور چاروں طرف سنسان صحرا تھا جہاں کوئی راستہ نظر نہیں آرہا تھا۔ نیچے ریت جلنے لگی تھی اور سر پر چمکتا ہوا سورج بہت گرم ہو گیا تھا اور جب میں چلتے چلتے تھک گیا اور مجھے پیاس ستانے لگی تو میں نے آنکھیں بند کرلیں۔ "مر ہی جانا ہے تو چلتے رہنے کی کیا ضرورت ہے اور جب دیکھنے کے لئے کچھ بھی نہیں تو آنکھوں کا کیا مصرف ہے۔ آنکھیں بند رہیں گی تو شاید صحرا کی اسیری کا احساس بھی کم ہو جائے گا۔"

میں نے مرنے سے پہلے ایک بار پھر یوسف کو پکارنے کا فیصلہ کیا۔ "یوسف!" اور صحرا، یوسف، یوسف .... کی صداؤں سے گونج اٹھا۔ میں نے کانوں میں انگلیاں دے لیں لیکن گونجتا ہوا صحرا تو پہلے ہی کانوں میں داخل ہو چکا تھا۔

پیاس کا احساس شدید تر ہو گیا۔ میں نے اس احساس کو نظرانداز کرنے کی کوشش کی لیکن پیاس تو صرف پانی سے بجھتی ہے!

میں نے آنکھیں کھول کر حسرت کے ساتھ جلتے آسمان کی طرف دیکھا۔ بادل کا ایک ٹکڑا نہ جانے کہاں سے اور کیسے آگیا اور جب وہ میرے بہت قریب آگیا تو میں نے کہا۔

"ماں تو نے تو کہا تھا میرا بیٹا بہت خوش قسمت ہوگا ــــ وہ دکھوں سے آزاد جیئے گا ــــ تم دیکھ رہی ہو ــــ تمہارا بیٹا پیاسا مر رہا ہے۔ ماں ــــ ماں ...."

میرا آگے بڑھا ہوا مایوس کمزور ہاتھ ایک جھٹکے سے گر گیا۔ اُسے تو اس دنیا سے رخصت ہوئے دس برس ہو چکے تھے۔ وہ اب یہاں کیسے آسکتی تھی!

میرے پاؤں جل رہے تھے اور میں چلا جا رہا تھا۔ میں اس قدر تھک گیا تھا اور مجھے پیاس اتنا ستا رہی تھی کہ میرا جی چاہا کہ تیز گرم دھوپ کی چادر اوڑھ کر جلتی ریت پر سو جاؤں۔ آرام دہ جلتی ریت پر کبھی نہ جاگنے کے لئے سو جاؤں!

میں رک گیا۔ میں نے ستارے کی طرف مایوسی اور نفرت سے دیکھ کر کہا "دشمن"!

اس نے میری آنکھوں میں پھیلی ہوئی حسرت کی دھند کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا ــــ حکم دیا "چلتے رہو"۔

"مجھ میں مزید چلنے کی ہمت نہیں ہے ــــ میں مرنا چاہتا ہوں"۔

"گھبراؤ نہیں۔ چلتے رہو"۔

لیکن میں بیٹھ گیا۔ گرم ریت پر میں نے ٹانگیں پھیلا دیں اور کمر پیچھے رکی ہوئی ہوا سے لگا دی۔ میں نے دونوں ٹانگوں کو ساتھ ملایا اور ٹخنوں سے ذرا اوپر رومال باندھنا چاہا۔ لیکن ٹانگوں کو اس جگہ پر پہلے سے بندھا پا کر ہاتھ واپس آگئے اور میں رومال سے ماتھے کا پسینہ پونچھنے لگا ــــ میں سوچنے لگا کہ یہ سب مصیبت یوسف کی وجہ سے مجھ پر نازل ہوئی ہے۔ میں اس کے لئے پریشان تھا۔ میں اُسے روکنے کے لئے گھر سے نکلا۔ میں نے اُسے آوازیں دیں۔ لیکن اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں پھر اسے روکنے کی کوشش میں آگے بڑھتا گیا اور پھر جب میں نے پلٹ کر دیکھا تو وہ ڈیوڑھی کا دروازہ اندر سے مضبوطی کے ساتھ بند کئے بیٹھا تھا۔ دروازے کی درزوں سے مجھے اس کی پیٹھ کا سفید لباس چمکتا ہوا صاف دکھائی دیا تھا۔ میں اس معمے کو سمجھنے سے قاصر تھا اور سوچنے لگا۔ اگر دروازہ بند تھا تو میں باہر کیسے آگیا اور اگر لوگ دروازہ کھول کر اندر آئے تھے تو کہاں گئے اور اگر یوسف باہر نکل گیا تھا تو یہ اندر کون بیٹھا ہے۔ اگر یوسف اندر بیٹھا ہے تو میں کون ہوں، اگر میں یوسف ہوں تو اندر کون بیٹھا ہے ــــ اور میں اس کے بغیر یہاں کیونکر زندہ ہوں۔ میں اُس سے الگ کیسے ہو گیا ہوں ــــ شاید لوگ ٹھیک کہہ رہے تھے کہ یوسف پاگل ہو گیا ہے۔ اگر یوسف پاگل نہیں ہوا تو میری پہچان کی قوت کہاں چلی گئی ہے؟ مجھے کیوں نہیں پتہ چلتا کہ یہ سب کیا کھیل ہے اور کون مکان کے اندر ہے اور کون باہر؟

میں نے ایک بار پریشانی کے عالم میں چلا کر بھی کہا تھا "کون مکان کے اندر ہے اور کون باہر"۔ اور دیر تک چاروں طرف سے ایک ہی صدا آتی رہی تھی۔

"کون مکان کے اندر ہے اور کون باہر؟"

میں ستارے سے رحم کا طالب تھا لیکن اس نے بیرحمی سے حکم دیا۔

"چلتے رہو۔"

"کتنا بے معنی سفر ہے۔ اس کا آغاز واضح ہے نہ انجام۔ اس کا کوئی مقصد سامنے ہے نہ فائدہ ——— ستارے مجھے اپنی غلامی سے آزاد کر دے۔ ستارے میں غلامی کا عادی نہیں ہوں ——— مجھے چھوڑ دے میں گھر جاؤں گا۔"

میں اٹھا اور واپس جانے کے لئے پلٹا لیکن وہاں کوئی راستہ نہیں تھا۔ میرے پاؤں کے نشانات بھی چند قدم آگے جا کر مٹ گئے تھے۔ واپسی کے راستے کے یقین کے لئے میں ادھر اُدھر بھاگنے لگا۔ ریت پر چاروں طرف ایک چھوٹے سے دائرے میں میرے قدموں کے نشانات بکھر گئے جن میں سمت کا احساس بالکل معدوم ہو گیا لیکن سورج سر پر تھا۔ میں کس جانب سے آیا تھا اور کس طرف جا رہا تھا۔ سب کچھ گڈمڈ ہو گیا تھا۔ واپسی کی سب راہیں مسدود ہو گئی تھیں۔

میں نے انتہائی غصّے اور مایوسی اور نفرت سے ستارے کی طرف دیکھا۔ وہ فتح کے احساس سے مسکرا رہا تھا۔ بولا "منزل قریب ہے چلتے رہو۔"

میں سر پر دوپہر کا بوجھ لئے چلتا رہا کیونکہ اب جیسے سورج کو زوال منظور نہیں تھا۔

وہاں دیکھنے کو کچھ نہیں تھا۔ کوئی چیز نہیں تھی جس سے ٹکرا جانے کا خطرہ ہوتا۔ اس لئے میں آنکھیں بند کر کے چلتا رہا۔ اندر اور باہر ایک ہی منظر تھا گویا میرا جسم آئینہ تھا جس میں میں صحرا کا عکس دیکھ رہا تھا یا پھر صحرا آئینہ تھا جس میں مجھے اپنا آپ نظر آ رہا تھا۔ یقین سے کبھی معلوم نہیں ہو سکا کہ کونسی بات درست تھی۔

کہیں سے ہوا کا ایک ٹھنڈا جھونکا آیا تو میں نے حیران ہو کر آنکھیں کھول دیں سامنے سبز درختوں کا ایک شہر تھا۔ یہ واقعی ایک سبز شہر تھا یا شاید مجھے اس پر شہر کا گمان اس لئے ہوا تھا کہ اسے دیکھ کر آبادی کا احساس پیدا ہوا تھا۔ ایک گھنا اور سرسبز جنگل تھا لیکن میں اس کی طرف یوں بڑھ رہا تھا جیسے ایک تھکا ماندہ مسافر صحراؤں اور جنگلوں سے گزر کر بالآخر شہر کو اپنے سامنے پاتا ہے۔ سبز درختوں کے اس شہر کے کہیں بیچ میں سے دھوئیں کی ایک لکیر اٹھتی ہوئی کچھ دور جا کر گم ہو گئی تھی۔ میں نے خشک ہونٹوں پر نیم خشک زبان پھیری اور سوچا کہ اب پیاس مٹ جائے گی کیونکہ درختوں اور سبزے کا تصور بھی پانی کے بغیر نہیں کیا جا

سکتا۔ میں نے نظریں اوپر اٹھائیں ——— ستارہ غائب ہو چکا تھا ——— اور میں تنہا رہ گیا تھا۔ مجھ پر اس طویل سفر کا خوف شدت سے طاری ہو گیا جو میں طے کر چکا تھا۔ ستارے کے غائب ہو جانے کے ساتھ واپسی کی رہی سہی امید بھی جاتی رہی لیکن سامنے نظر آنے والے سبز شہر کی موجودگی نے واپسی کی خواہش کو کمزور کر دیا تھا۔ اور بڑا خوف یہی تھا کہ کہیں صحرا میرے پاؤں میں کوئی زنجیر نہ ڈال دے اور اپنے گرم دامن میں مجھے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نہ لپیٹ لے۔ میں مرنا نہیں چاہتا تھا اور مجھے یہ یاد کر کے اپنے آپ سے شرم آ رہی تھی کہ میں نے کچھ دیر پہلے مرنے کی آرزو کی تھی۔

صحرا سے بچنے کی خاطر میں تیزی سے بھاگتا ہوا جنگل میں داخل ہو گیا۔ چاروں طرف اندھیرا تھا لیکن میں آگے بڑھتا چلا گیا۔ کچھ دیر بعد ایک جانب سے روشنی ابلتی ہوئی نظر آئی۔ میں روشنی کے منبع کے قریب پہنچ گیا۔ یہ ایک غار کا تنگ دروازہ تھا۔ روشنی اس میں سے سیلاب کی طرح باہر آ رہی تھی۔ غار کا دروازہ بہت تنگ تھا لیکن میں اس میں اترنے کے لئے بے تاب تھا۔ میں نے سوچا غار میں جانے کا کوئی راستہ ہو گا۔ اس راستے کی تلاش سے پہلے یہ جاننے کے لئے کہ اندر کیا ہے میں نے ذرا جھک کر غار کے کنارے پر دونوں ہاتھ رکھ دیئے۔ دروازہ فوراً کشادہ ہو گیا۔

غار کے اندر روشنی ہی روشنی تھی۔ سامنے چھت سے لٹکا ہوا میرا راہ نما ستارہ چمک رہا تھا ——— سفید چادر میں لپٹی ہوئی ایک عورت سر جھکائے پتھر کے ایک تخت پر مغموم اور خاموش بیٹھی تھی۔ اس کا صرف چہرہ ہی کھلا تھا۔ اس کی گود میں چھوٹا سا ایک بچہ تھا۔ بچہ ہنس رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر بچے نے بازو میری طرف بڑھا دیئے۔ میں نے اس کو بھی پہچان لیا تھا۔ یہ وہی تھی۔ میں غلطی نہیں کر رہا تھا۔ میں نے اُسے جدا ہونے سے پہلے کہا تھا کہ میں تمہارے بغیر بھی زندہ رہ سکتا ہوں ——— لیکن میں نے غلط کہا تھا ——— میں اُسے حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ یہ وہی تھی ——— ماتھے پر اس طرح صرف اُسی کی زلف گرتی تھی۔ میں اس کی جھکی ہوئی گردن اور کمر کی قوس سے بھی اسے پہچان گیا تھا۔

بچے کے بازو میری طرف پھیلے ہوئے تھے۔ پھیلے ہوئے ان ننھے مُنّے بازوؤں کا مقابلہ میرے بس کی بات نہیں تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر بچے کو اٹھا لیا۔ بچہ میرے سینے سے لپٹ گیا۔ عورت اسی طرح بیٹھی



بھی۔ میں نے سوچا "کیا اسے پتہ نہیں چلا کہ اس کا بچہ اس کی گود سے اٹھا لیا گیا ہے ؟"

کئی سوال ذہن میں گڈمڈ ہو گئے تھے۔ میں اس سے یہ بھی پوچھنا چاہتا تھا کہ وہ یہاں کیوں کر آئی تھی لیکن میں کوئی سوال کرنے کا حوصلہ نہ کر سکا۔ بچے کو گود میں لئے ہوئے میں اس کے قریب ہو گیا اور ڈرتے ڈرتے اپنا مُنہ اُس کے دائیں کان کے قریب لے جا کر میں نے کہا۔

"مریم —— میں آگیا ہوں!"

اور جب ہم تینوں غار سے باہر آئے تو باہر تیز بارش ہو رہی تھی۔

"تم نے خدا کا سایہ دیکھا ہے؟"

"خدا کا سایہ؟ احمق، سایہ تو جسم رکھنے والی مادی چیزوں کا ہوتا ہے۔ خدا کا سایہ کیسے ہو سکتا ہے!"

"تو تم نے نہیں دیکھا۔"

"کون دیکھ سکتا ہے؟ جس شے کا وجود ہی نہیں اسے کون دیکھ سکتا ہے۔"

"میں نے دیکھا ہے۔"

"تم نے دیکھا ہے؟"

"ہاں ـــــ میں نے خدا کو نہیں دیکھا لیکن اس کا سایہ دیکھا ہے۔"

یہ گفتگو اس کے اور اس کے پرانے دوستوں کے درمیان دیوار بن گئی تھی۔

△

"یہ سب لوگ یہاں کیسے آ گئے؟"

کھلے روشندان سے چاندنی کمرے میں داخل ہو کر سارے کمرے کو سخت اندھیرے کی گودی سے بچا رہی تھی۔ اس مدھم روشنی میں نادر نے کمرے کا جائزہ لینے کی کوشش کی۔ چاروں طرف شیطانی

روحیں ناچ رہی تھیں۔ روشندان سے رات کے آسمان کی تنہا آنکھ کمرے میں یوں جھانک رہی تھی، جیسے پہرے پر مامور ہو۔

"ابھی تو ایک پہر رات بھی نہیں گزری!" ——— نادر نے سوچا ——— "شیطانی روحیں تو آدھی رات کو آزاد ہوتی ہیں۔ شاید کمرے میں چاندنی کے سوا اور کوئی چیز باہر سے داخل نہیں ہوئی میں پریشان ہوں نا، یہ سب کچھ اسی لئے نظر آرہا ہے ——— مجھے سو جانا چاہیئے۔"

اُس نے آنکھیں بند کر لیں اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔ سونے کے لئے یہ اُس کی شاید آٹھویں یا دسویں یا بیسویں کوشش تھی جو ناکام رہی۔ آنکھیں بند کر لینے کے باوجود اسے سائے اپنے چاروں جانب رقص کرتے نظر آرہے تھے اور اب تو اُن کے نقرئی قہقہے بھی سنائی دینے لگے تھے اور ان کے جوان جسموں کی مہک بھی، پرانے، صرف ایک ہفتہ یا شاید ایک صدی پرانے نقشوں کی یاد تازہ کر رہی تھی۔ سونے کے لئے بستر پر لیٹنے سے پہلے یہ سب کچھ دور تھا۔ بہت دُور، لیکن اب یہ سب کچھ اس کے قریب تھا، اتنا قریب کہ اسے یہ جاننا بھی دشوار ہو رہا تھا کہ وہ کمرے کے اندر ہے یا کمرہ اس کے اندر!

اس نے پھر آنکھیں کھول دیں۔ کمرے کا غور سے جائزہ لیا۔ ایک مسکراہٹ اس کے چہرے پر پھیل گئی۔ ہر طرف تر و تازہ شگفتہ مسکراتے گاتے خوبصورت آشنا چہرے دکھائی دینے لگے۔

"لیکن یہ سب اندر کیسے آگئے؟"

اس نے دروازے کی طرف دیکھا۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ روشندان کی طرف نظر اٹھائی، روشندان بہت چھوٹا تھا۔

چہرے اس کے قریب آگئے۔ وہ بھول گیا کہ وہ بہت دکھی ہے۔ آج وہ ایک عجیب تجربے سے گزر رہا تھا۔ چہرے تعداد میں بہت تھے۔ لیکن ہر چہرہ اس کے چہرے سے مس کر رہا تھا اور وہ الگ الگ ہر چہرے کی مانوس نرمی اور گرمی محسوس کر رہا تھا۔

بائیں طرف دیوار کے ساتھ بچھی ہوئی چارپائی پر ایک جوان عورت سو رہی تھی۔ جسے نادر بالکل

فراموش کئے لیٹا تھا۔ عورت نے کروٹ بدلی، اور آنکھیں کھول دیں۔

"ارے تم ابھی تک جاگ رہے ہو نادر؟" ——— اس کی آواز میں سچّی محبت کی وہ کھنک تھی جو کبھی اصلی چاندی کے روپے میں ہُوا کرتی تھی۔

ہوا میں سرسراہٹ سی ہوئی۔ نادر نے گھبرا کر ایک لمبی سانس لی۔ کمرہ خیالی چہروں سے خالی ہو گیا۔ وہ یہ فیصلہ نہ کر سکا کہ یہ سب چہرے اس نے ایک سانس میں اپنے اندر اتار لئے ہیں یا رات کے آسمان کے چوکیدار نے انہیں پکڑ لیا ہے۔

"ہُوں ——— ہاں ——— نیند نہیں آرہی ——— یہ سب لوگ کہاں چلے گئے؟"

——— نادر جیسے کسی دوسری دنیا سے بول رہا تھا۔

"کون لوگ نادر؟ ——— اوہ نادر! تم اب ان لوگوں کو بھول کیوں نہیں جاتے! انہوں نے تمہیں چھوڑ دیا ہے۔ تم انہیں بھول جاؤ۔ وہ اب ہمارے کچھ نہیں لگتے ——— سوتیلی ماں اور چچا نے شادی کر کے ساری جائداد پر قبضہ کر لیا ہے ——— تم ایسے ظالموں کو بھول کیوں نہیں جاتے؟"

"لیکن یہ لوگ بند کمرے میں کیوں کر داخل ہو گئے تھے؟"

"انہیں تو تم گھر سے اپنے ساتھ ہی لے کر آئے ہو۔ گھبراتے ہو تو خواب دیکھنے لگتے ہو، اور انہیں اپنی یادوں سے نکال کر اپنے سامنے بٹھا لیتے ہو۔"

"خواب! ——— ہاں ——— یہ خواب ہی تھا ——— بیداری کا خواب!"

"نادر سونے کی کوشش کرو!"

"ہاں ——— مجھے سو جانا چاہیئے ——— نیند ——— نیند ——— اب آبھی جا!"

اُس نے نیم وا آنکھوں سے عورت کی طرف دیکھا اور بے صدا الفاظ میں کہا ———

"تم کتنی اچھی ہو، کتنی مہربان، ساری دنیا نے مجھے چھوڑ دیا ——— لیکن تم میرے ساتھ ہو۔"

اس نے محسوس کیا کہ وہ سو رہا ہے۔ سو گیا ہے ——— یہ جاننے کے لئے کہ وہ جاگ

رہاہے یا سو رہا ہے. اس نے آنکھیں کھولیں تو خود کو عورت کی چارپائی کے قریب کھڑا پایا ــــ ٹھنڈے پسینے کے قطرے سارے جسم پر رینگ رہے تھے اور وہ سوچ رہا تھا ــــ مَیں اس معاملے میں اتنا مجبور کیوں ہوں؟ ــــ مَیں اپنے ارادے پر قائم کیوں نہیں رہ سکتا؟ ــــ مَیں کہاں کھڑا ہوں، کس مقام پر آ گیا ہوں؟

سامنے بستر پر پڑا جسم اسے اپنی جانب کھینچ رہا تھا. وہ بالکل نہیں جانتا تھا کہ اس عورت کا نام کیا ہے. اسے صرف اتنا احساس تھا کہ سامنے ایک جوان جسم پڑا ہے اور وہ صدیوں سے بھوکا ہے اسے احساس ہُوا کہ اس جسم کا سر نہیں ہے لیکن اُس نے اس بات کی پرواہ نہ کی، کیونکہ جسم کے لئے سر کی ضرورت ہے نہ اہمیت. جسم جاگتا ہے تو سر سوجاتا ہے ــــ اُس نے چارپائی کو چھُوا، جسم حرکت میں آ گیا، اور خوف زدہ ہو کر اُٹھ بیٹھا اور ہلکی سی چیخ کے ساتھ دل پر ہاتھ رکھ کر بولا

" اوہ نادر، تم نے تو مجھے بری طرح ڈرا دیا ــــ تم سوئے نہیں اب تک؟ ــــ ارے تم تو کانپ رہے ہو اور یہ تمہارا ہاتھ کس قدر سرد ہو رہا ہے"!

چند لمحے وہ حیران کھڑا رہا، جیسے اُسے کچھ معلوم نہ ہو کہ کیا ہو رہا ہے. پھر اسے اچانک صورتحال کا احساس ہُوا اس نے اپنے سر کو جھکا کر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا، سر کو کئی جھٹکے دیئے اور اور کہا ــــ " سر ــــ اوہ ــــ سر"!

"کیا ہُوا تمہارے سر کو؟ درد ہے؟ ــــ خود کو نہ سنبھالو گے تو یہی ہو گا ــــ چلو تم لیٹو بستر پر، مَیں تمہارا سر دباتی ہوں تمہیں نیند آ جائے گی"۔

"نہیں نہیں ــــ اس کی ضرورت نہیں ــــ تم سو جاؤ ــــ مَیں بھی سو جاؤں گا ــــ مجھے نیند آ جائے گی ــــ آ جائے گی"۔

وہ اپنے بستر پر جا لیٹا. اُس نے آنکھیں بند کر لیں اور اپنے آپ کو یوں سلانے کی کوشش کرنے لگا جیسے ماں بچے کو سلاتی ہے ــــ

" سوجا ــــ سوجا ــــ نادر سوجا! ــــ نیند آ رہی ہے ــــ تجھے نیند آ رہی ہے ــــ روشندان سے باہر چاند چمک رہا ہے ــــ ساری دنیا سو رہی ہے، تیرا بخت بھی سو رہا ہے، پھر تو کیوں نہیں سوجاتا ــــ سوجا کمبخت ــــ سوجا ــــ سُن! ــــ کوئی آ رہا ہے ــــ دبے پاؤں ــــ کون آ رہا ہے؟ ــــ نیند آ رہی ہے ــــ نیند ...... نیند ......"

اُس نے آنکھیں کھول دیں. وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ کمرے میں کون آیا ہے ــــ نیند یا کوئی اور!

کمرہ جانے پہچانے حسین چہروں سے بھرا ہُوا تھا. ان کے جسموں کی مہک سے کمرہ معطر ہو گیا تھا. چہرے مسکرا رہے تھے اور سب گا رہے تھے، کوئی بے آواز گیت جس کی گونج سے سارا کمرہ بھر گیا تھا ــــ

نادر ــــ نادر!
تم نہیں سو سکتے،
ہم جاگ رہے ہیں، تو تم کیسے سو سکتے ہو،
ہم تم ہیں، تم ہم ہو، پھر تم ہمارے بغیر کیسے سو سکتے ہو،
تمہارا سونا جاگنا تو ہمارے ساتھ ہے،
ہاں ہاں ــــ ہمارے ساتھ ہے۔

گانے والی آوازیں بھی جانی پہچانی تھیں، اور پھر اس نے سب کو پہچان لیا. وہ ان سب کو اچھی طرح جانتا تھا. وہ ان جسموں کے حسن کو بہت قریب سے دیکھ چکا تھا ــــ "یہ فرحت ہے ــــ یہ نجمہ ہے ــــ یہ ــــ آہا ــــ یہ نگار ہے ــــ اور یہ کون ہے فرخندہ تم بھی! ــــ کتنی مدت کے بعد نظر آئی ہو ــــ کہاں تھیں ظالم! ــــ اور آج تمہیں تمہاری جابر ماں نے کیسے آنے دیا؟ ــــ اور یہ رخشی ہے. اس نے ایک شب بھی شوہر کے

ساتھ نہیں گزاری ـــ بڑی دلیر ہے ـــ اور یہ ...." اس نے سب نام دہرائے
پھر ایک ایک کر کے سب چہرے اس کے چہرے سے مل گئے، اور سب جسم اس کے جسم میں اتر گئے۔ کمرہ خالی تھا۔ لیکن اس میں تل دھرنے کو جگہ دکھائی نہیں دیتی تھی۔

چند لمحے اس نے نشے کی سی کیفیت میں گزارے۔ پھر اچانک اسے حالات کی تبدیلی کا احساس ہوا اور پھر ایک طویل بے صدا مکالمے سے کمرے کی فضا بھر گئی۔

" جاؤ ـــ جاؤ ـــ اب تم سے میرا کوئی تعلق نہیں رہا ـــ تم نے مجھے لوٹا ـــ جی بھر کر لوٹا ـــ اور جب میں قلاش ہو گیا، تو تم سب نے آنکھیں پھیر لیں۔ تمہیں دولت چاہیئے، اور وہ اب میرے پاس نہیں ہے۔ پھر کیوں آئی ہو میرے پاس! ـــ اب میری آنکھیں کھل گئی ہیں ـــ اب میں نے گناہ کا راستہ چھوڑ دیا ہے ـــ جاؤ ـــ جاؤ۔"

" ہاہاہا ـــ ہاہاہا ـــ ہاہاہاہاہا........" سارا کمرہ نقرئی قہقہوں سے گونج اٹھا قہقہے ایک ساتھ در و دیوار سے، اور خود اس کے جسم سے اُٹھ رہے تھے۔ پھر مترنم آوازیں آنے لگیں ـــ " کتنے سادہ ہو نادر! ـــ کیا تم نہیں جانتے کہ دیواریں ہمارے اور تمہارے درمیان حائل نہیں ہیں۔ کیونکہ ہم تم سے الگ نہیں ہیں۔ ہم تمہارے اندر ہیں جس طرح تم ہمارے اندر ہو ـــ یہ کیسے ممکن ہے کہ جو ہو چکا ہو اس کے بارے میں یہ یقین حاصل ہو جائے کہ وہ نہیں ہوا ـــ دروازے بند رکھو یا کھول دو، آنکھیں کھلی رکھو یا موند لو ـــ بات ایک ہی ہے جن آنکھوں سے تم ہمیں دیکھتے ہو وہ آنکھیں یہ نہیں ہیں۔ وہ آنکھیں تو تمہارے اندر ہیں اور وہ ہمیشہ کھلی رہتی ہیں۔"

" اوہ ـــ میں اپنی آنکھیں نوچ ڈالوں گا۔"

" عبث، بے کار۔"

"میں اپنا سر دیوار سے دے ماروں گا۔ میں اسے توڑ دوں گا۔ اگر یہ تمہارا گھر ہے تو میں اس کو تباہ کر دوں گا۔"

اس نے سر کو دونوں ہاتھوں میں لے لیا۔ سر کو ہاتھوں میں لیتے ہی اُسے خیال آیا کہ قریب ہی چارپائی پر ایک بے سر کا جسم پڑا ہے جو اُسے بلا رہا ہے ـــ وہ محسوس کر رہا تھا کہ زندگی تو جسم کا دوسرا نام ہے ـــ یہ سر کیوں جسم پر سوار رہتا ہے۔

" تم سائے ہو اور وہ حقیقت ـــ اب تم میری منزل نہیں ہو ـــ جاؤ ـــ جاؤ!"

آخری لفظ اس نے بلند آواز میں کہا، اور دوسری چارپائی پر پڑا ہوا جسم پھر اُٹھ بیٹھا۔

" نادر تم کیا کر رہے ہو؟ ـــ نادر کچھ میرا بھی خیال کرو! میں عورت ہوں، لیکن تم نے دیکھ لیا ہے کہ کس حوصلے سے کام لے رہی ہوں۔ تمہارا یہی حال رہا تو میں رو دوں گی۔"

" اوہ ـــ سر ـــ سر!" ـــ اس نے اپنے سر کو دباتے ہوئے کہا۔

" نادر ـــ تمہارا سر پھٹ جائے گا، تم پاگل ہو جاؤ گے، پھر ہم پر وہ تباہی آئے گی جو ابھی تک نہیں آئی ـــ تم کبھی اتنے کمزور نہ تھے نادر!"

" کچھ باقی نہیں رہا ـــ اب زندگی بے معنی ہے!"

" ذرا سنبھلنے کا فیصلہ کر لو تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تباہی انتہا پر پہنچ کر ایک نئی زندگی کا آغاز بن جاتی ہے۔"

" گھر چھوڑتے ہوئے میں سمجھتا تھا کہ میرا حوصلہ قائم رہے گا۔ لیکن میں غلطی پر تھا ـــ میں بے بس ہوں ـــ ہر لحاظ سے بے بس ہوں۔"

" تمہیں صرف نیند کی ضرورت ہے، چند گھنٹے آرام کر لو گے تو تمہارا حوصلہ بھی لوٹ آئے گا اور تم فتح یاب ہو گے۔"

" میں ہمیشہ فاتح تھا ـــ لیکن اب حالات بدل گئے ہیں ـــ اب شکستوں اور ذلتوں اور رسوائیوں کا دور آ رہا ہے ـــ اوہ ـــ!"

" نادر میرا صبر ختم ہو جائے گا۔ میں تمہارے سہارے یہاں تک آ گئی ہوں۔ تمہارا یہ حال رہا تو میں مر جاؤں گی ـــ میں اپنا گلا گھونٹ لوں گی ـــ اگر تمہیں نہ اپنا خیال ہے نہ میرا، تو مجھے

ساتھ کیوں لے آئے تھے ——— تم کہتے تھے تمہیں مجھ سے بہت پیار ہے ——— یہ کیسا پیار ہے نادر ———!"

"اوہ ———!"

"چلو ——— تم لیٹ جاؤ بستر پر۔ میں تمہارا سر دباتی ہوں۔ درد کم ہو جائے گا تو نیند ضرور آئے گی۔"

"نہیں ——— یہ مناسب نہیں ——— میں سو جاؤں گا۔"

عورت اس کا سر دبانے لگی۔

نادر نے آرام محسوس کیا۔ اس پر ہلکی سی غنودگی طاری ہو گئی ——— لیکن یہ غنودگی عارضی تھی عورت کے ہاتھوں کا لمس نیند کی راہ میں حائل ہو گیا تھا چند روز پہلے کی راتیں انگڑائی لے کر بیدار ہو رہی تھیں جانے پہچانے نشے پھر محسوس ہونے لگے تھے ——— چند روز پہلے کی تو بات تھی شباب و شراب کے بغیر اس کی کوئی شب نہ گزرتی تھی اور محرومی کے یہ چند روز جیسے پھیل کر صدیوں پر محیط ہو گئے تھے۔ وہ زندگی میں آنے والے اس انقلاب کے لئے تیار نہیں تھا اسی لئے زندگی میں رونما ہونے والی اس تکلیف دہ تبدیلی کو قبول کرنا اس کے لئے سخت دشوار تھا۔

"عورت!"

"عورت ———!"

"عورت ———!"

اب اسے صرف یہی ایک لفظ یاد آ رہا تھا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ سر کی طرف بڑھائے کہ عورت کو کھینچ کر پہلو میں لٹا لے ——— وہ نہیں جانتا تھا اس عورت کا کیا نام ہے اسے صرف یہ معلوم تھا کہ سرہانے ایک عورت بیٹھی محبت سے اس کا سر دبا رہی ہے۔ حالانکہ اس کے پاس سر ہے ہی نہیں جسم ہے ——— صرف جسم۔

"نادر ———!"

اپنا نام سن کر وہ ہوش میں آ گیا۔ اس کے ہاتھ واپس اپنی جگہ آ گئے۔

"نادر! ہم بے سہارا اور بے بس ہو گئے ہیں۔ لیکن ہم بے حوصلہ نہیں ہیں۔ یہ وقت گزر جاتے گا تم محنت کرو گے میں تمہاری مدد کروں گی۔ پھر خوشی کا زمانہ لوٹ آئے گا۔ زندگی میں یونہی ہوتا ہے۔ ہم چاہیں تو تباہی سے بچ سکتے ہیں تم نے اپنی عادتوں کو بدل کر اس بات کا ثبوت مہیا کر دیا ہے کہ تم خود پر قابو رکھتے ہو، اور یہ کامیابی کا آغاز ہے ——— سب کہتے تھے نادر بہت برا ہے بہت آوارہ ہے، وہ نہیں بدل سکتا لیکن اب سب دیکھیں گے کہ نادر بدل گیا ہے ——— نادر تم دو جنگیں ایک ساتھ لڑ رہے ہو، ایک دنیا سے، ایک اپنے آپ سے تمہیں دونوں میں کامیاب ہونا ہے۔ اب کوئی تمہیں آوارہ نہیں کہے گا۔ اب تم کبھی شراب نہیں پیو گے وہ عہد جو گزر گیا ضرور تمہیں نیکی کی راہ پر ڈال دے گا ——— اب تم نوابزادہ نادر علیخاں نہیں رہے۔ اب تم ایک عام آدمی ہو، غریب اور بے بس ——— میرے ہاتھ میں ایک قیمتی انگوٹھی ہے۔ کانوں میں قیمتی آویزے بھی ہیں، تم یہ سب کچھ بیچ دو ——— کل ہی اس دکان کا پیشگی کرایہ ادا کر دو جو تم نے آج دیکھی تھی۔ جو بھی کاروبار سمجھ میں آئے شروع کر دو۔ اس شہر میں تم اجنبی ہو، گھر سے سینکڑوں میل دور۔ یہاں تمہیں برا کہنے والا کوئی نہیں۔ تم اطمینان سے ایک نئی زندگی کا آغاز کر سکتے ہو۔ اور اگر ماضی نے دوبارہ پیچھا کیا تو اب وہ تجربہ تمہیں نقصان سے محفوظ رکھے گا جو ان چند دنوں میں حاصل ہوا ہے۔"

"اوہ!" ——— اسے بازوؤں کو واپس ان کی جگہ پر لانے میں بہت دشواری محسوس ہوئی جیسے بازو شل ہو گئے ہوں اور اسے ایک ساتھ ایسے واقعات یاد آ گئے جن میں گناہ کے لئے بڑھنے والے ہاتھ شل ہو جاتے ہیں۔

"تم ٹھیک کہتی ہو ثروت! ——— میں گمراہ ہو گیا تھا۔ اب میں بدل رہا ہوں۔"

یہ دیکھ کر کہ نادر کو قدرے سکون آ گیا ہے، ثروت واپس اپنے بستر پر جا لیٹی ——— لیکن نادر جاگتا رہا۔

پھر وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"تم اب بھی نہیں سوئے نادر؟" ـــــ ثروت نے پوچھا۔

"مَیں کیسے سوسکتا ہوں۔ تمہاری موجودگی میں مَیں کیسے سوسکتا ہوں .... عورت کی موجودگی میں نادر کیسے سوسکتا ہے ـــــ یہ اس کے مزاج کے خلاف ہے ـــــ" وہ یہ سب کچھ کہنا چاہتا تھا مگر نہ کہہ سکا۔

"اس حالت میں اب میں زیادہ دیر یہاں نہیں ٹھہر سکتا" ـــــ نادر نے سوچا۔ پھر ثروت سے کہا ـــــ "مَیں باہر جاتا ہوں، ذرا ٹہل کر آؤں تو شاید آرام سے سوسکوں۔"

"جلد لوٹ آنا نادر!" ـــــ ثروت نے کہا۔ وہ کہنا چاہتی تھی ـــــ "اکیلے میں مَیں ڈر نہ جاؤں۔" لیکن اس نے یہ نہ کہا۔

گلی میں اِکّا دُکّا لوگ ابھی تک نظر آ رہے تھے۔ نادر اُن سے بچتا ڈرتا چلنے لگا۔ یوں چلنا عجیب لگ رہا تھا۔ وہ خود کو بہت چھوٹا سا محسوس کر رہا تھا۔ اسے یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے ہر لمحہ اس کے سینے میں دبی ہوئی غلاظت کو دیکھ رہا ہے۔ عقب میں آنے والوں کی نظریں اسے اپنی کمر میں پیوست ہوتی معلوم ہوتی تھیں ـــــ ایک شخص ناک پر رومال رکھے جا رہا تھا۔ اُسے دیکھ کر نادر اپنے سینے کو سونگھنے لگا۔

اور وہ چلتا رہا۔

اُس نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور اندر ہی اندر رقم کی گنتی کی۔

"تقریباً دس روپے" ـــــ اس نے آہستہ سے کہا۔ اُس کی آنکھیں نم آلود ہو گئیں۔ اب کا جی چاہا وہ مر جائے۔

"دس روپے!" ـــــ اس نے رقم کو مٹھی میں زور سے بھینچ لیا۔ جیسے ڈرتا ہو کہ رقم کہیں گر نہ جائے۔

"سب ذلیل ہیں ـــــ خود غرض ـــــ کمینے ـــــ روپے کے بھوکے ـــــ سب لالچی کتے ہیں ـــــ" اس کے دل نے کہا۔

گذشتہ چند دن کے قیام میں وہ شہر کے ضروری راستوں سے واقف ہو گیا تھا۔ وہ اپنی منزل کی طرف بڑھتا رہا۔ راستہ رات کے وقت پہچاننا آسان تو نہ تھا۔ لیکن اس وقت خود پاؤں اس کی رہبری کر رہے تھے۔ پاؤں کی بھی آنکھیں ہوتی ہیں جو کبھی دھوکا نہیں کھاتیں۔

"مَیں نے کوئی عہد نہیں کیا ـــــ مَیں بُرا ہوں، آوارہ ہوں، مَیں نہیں بدل سکتا ـــــ مَیں، مَیں ہوں ـــــ مَیں نادر ہوں ـــــ نوابزادہ نادر علیخاں" ـــــ وہ اپنے آپ سے باتیں کر رہا تھا

"لیکن میں ادھر کس امید پر جا رہا ہوں؟ ـــــ نادر علیخاں جو نواب زادہ تھا، اب کہاں ہے! وہ لمحوں میں ہزاروں لٹانے والا ـــــ میں قلّاش ـــــ بدحال!" ـــــ اور اس نے رقم والی مٹھی کو اور زیادہ بھینچ لیا ـــــ لیکن مَیں مجبور ہوں۔ مَیں اس حالت میں واپس نہیں جا سکتا۔ ـــــ اصول اور ضابطے سب بیکار ہیں ـــــ مجھے سکون چاہیئے ـــــ مَیں کب سے سکون ناآشنا ہوں ـــــ برسوں سے! ـــــ میرے لئے کوئی نئی راہ نہیں ہے ـــــ میرا ایک ہی راستہ ہے، صرف ایک ـــــ مجھے سب کچھ کر گزرنا ہے ـــــ سب کچھ!"

ایک کھمبے کے سہارے کھڑا ہو کر وہ اردگرد کا جائزہ لینے لگا۔ کئی بالاخانوں کی کھڑکیوں اور روشندانوں سے روشنی اُبل رہی تھی۔ گھنگھروؤں اور نغموں کی دلنواز لہریں اٹھ رہی تھیں۔ کوئی چیز اس کے لئے اجنبی نہ تھی۔ وہ خوش تھا کہ منزل پر آ گیا تھا۔

اس نے ایک کھڑکی میں سجے ایک خوبصورت جسم کو دیکھا اور کہا ـــــ "یہ میرے لئے ہے" ـــــ اُس نے آگے بڑھنا چاہا، لیکن کھمبے نے اُسے پکڑ لیا تھا۔

"مَیں واپس نہیں جا سکتا ـــــ آگے بڑھنے میں ذلت ہو سکتی ہے۔ لیکن واپسی میں مکمل تباہی ہے ـــــ میرے لئے صرف ایک ہی راستہ ہے ـــــ ایک ہی ـــــ مَیں ایک آبشار ہوں ـــــ مَیں بلندی سے گر چکا ہوں۔ اس آبشار کے لئے واپسی نہیں ہے ـــــ مَیں نے بلندی پر اڑتے جہاز سے چھلانگ لگا دی ہے ـــــ جہاز گم ہو چکا ہے ـــــ دُور

جا چکا ہے اور میں چھاتے کے سہارے ان دیکھے اجنبی اور دشمن جنگلوں میں اتر رہا ہوں —— اُتر گیا ہوں —— ہر طرف ذلّت کا خطرہ ہے —— لیکن واپسی ناممکن ہے ——"

کھمبے نے اسے چھوڑ دیا۔ اُس نے گھوم کر دیکھا۔ کھمبے کے ہاتھ نہیں تھے۔

وہ تیزی سے آگے بڑھ گیا جیسے وہ ڈرتا ہو کہ آہستہ چلا تو کھمبا آگے بڑھ کر اُسے پھر جکڑ لے گا۔ یا کوئی اور حادثہ پیش آجائے گا۔

وہ تیزی سے سیڑھیاں چڑھ گیا۔

فرش پر بچھے ہوئے قالین پر گاؤ تکیئے کے سہارے بیٹھے اس نے عورت کا گانا سنتے ہوئے سوچا —— اگر اس نے کسی قسم کی مزاحمت کی تو تشدد کرنا پڑے گا۔"

عورت نے جان لیا تھا کہ یہ نوجوان بہت پریشان ہے لیکن وہ خود پریشان نہیں تھی۔ اس کی زندگی میں ایسے لوگ آتے جاتے رہتے تھے۔

گیت ختم ہو گیا۔ اس وقت تک نادر شراب کا وہ جام ختم کر چکا تھا جو اس کے سامنے رکھا گیا تھا۔ عورت نے اُسے ایک اور جام دیا، پھر ایک اور —— وہ سب پی گیا ——

"سگریٹ؟" —— عورت نے ایک سگریٹ اس کے لبوں میں پکڑا کر سلگا دیا۔

"اس ناچیز کے پاس آپ پہلی بار آئے ہیں؟" —— عورت نے یہ فقرہ سوالیہ انداز میں کہا، جیسے کہنا چاہتی ہو کہ "آپ کون ہیں؟"

نادر نے سوچا کہ سارا حال صاف صاف کہہ سنائے لیکن پھر خیال آیا یہ عورت آخر اس پر کیوں رحم کھائے گی۔ یہ تو بازار میں بیٹھی ہے۔ یہ اس کی دکان ہے۔ یہ اس کا کاروبار ہے۔

عورت نے اُس کے چہرے پر پھیلی ہوئی پریشانی کو دیکھ کر کہا۔

"آپ کچھ پریشان معلوم ہوتے ہیں —— آپ دکھی ہیں —— گھبرائیے نہیں، ہم آپ کے دکھ بانٹنے کے لئے ہیں۔ یہاں آپ کو سکون ہی سکون ملے گا۔ غمزدہ اور دکھی نوجوان یہاں آکر کبھی مایوس نہیں لوٹتے —— میں انہیں خوشی دیتی ہوں —— ان کے زخموں کا علاج

کرتی ہوں ——"

عورت کے ان الفاظ نے نادر کے دل میں حوصلہ پیدا کر دیا —— "جانتا ہوں مجھے آپ سے وہ بات نہیں کہنا چاہیئے جو کہنے والا ہوں —— لیکن مجبور ہوں —— آپ کے لئے یہ مجبوری بے معنی ہو تو بھی کہنے پر مجبور ہوں —— کیا مناسب ہے اور کیا نامناسب، میں ان حدوں سے گزر چکا ہوں۔ نواب تھا۔ قلاش ہوں۔ جائیداد سے محروم کر دیا گیا ہوں —— لیکن ایک روز اپنا حق واپس لے لوں گا —— میرے پاس اس وقت کچھ نہیں سوائے اس کے ——" اس نے جیب سے ساری رقم نکال کر عورت کے سامنے رکھ دی۔

عورت کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ غصّے کے اظہار کے لئے اُسے آواز نہیں مل رہی تھی —— "کتے، کمینے، تم یہاں کیا سمجھ کر آئے ہو —— ؟ تمہاری حالت سے مجھے کیا تعلق —— ؟ یہ بازار ہے —— یتیم خانہ یا خیراتی ہسپتال نہیں ہے تمہیں میری ہتک کرنے کا کیا حق تھا؟ —— ذلیل، کتے، کمینے —— نکل جاؤ یہاں سے —— ورنہ میں بلاتی ہوں مراد کو —— وہ تمہیں اٹھا کر باہر پھینک دے گا۔"

یہ تمام الفاظ اس کے سر میں ایک دوسرے سے ٹکرا ٹکرا کر ٹوٹ گئے۔ لیکن باہر نہ آسکے۔

نادر ہر صورت حال کیلئے تیار تھا —— "حالات اگر جرم پر مجبور ہی کر دیں تو کیا کیا جائے —— جو ہو گا دیکھا جائے گا —— ناکام نہیں لوٹوں گا۔" اس نے چاہا کہ کام تشدد کے بغیر ہی نکل جائے۔

"میں جانتا ہوں" —— وہ بولا —— "میں نے آپ کو تکلیف پہنچائی ہے لیکن جس طرح آپ مظلوم ہیں، اسی طرح میں بھی مجبور ہوں —— میرا حق ظالموں نے چھین لیا ہے، ایک روز یہ حق مجھے مل جائے گا —— میں آپ کا حق ضرور ادا کر دوں گا —— میں نے آج تک کسی کا حق نہیں رکھا —— آپ کے لئے یہ بات کوئی اہمیت نہیں رکھتی،

لیکن یہ میرے لئے موت اور زندگی کا سوال ہے ——"

عورت نادر کے لہجے سے متاثر ہوگئی۔ اُسے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ جھوٹ نہیں بول رہا۔ اُس نے غصے پر قابو پایا اور اس عجیب نوجوان میں دلچسپی لیتے ہوئے کہا —— "آپ گھر جا کر آرام کریں۔ سکون حاصل کرنے کا ایک ذریعہ نیند بھی ہے۔"

"نہیں، —— مَیں واپس نہیں جا سکتا —— اس حالت میں ان جذبات کے ساتھ واپس نہیں جا سکتا۔"

"آخر کیوں نہیں جا سکتے آپ واپس۔؟"

"میرے کمرے میں ایک عورت سو رہی ہے۔"

"عورت؟! —— اور آپ اسے چھوڑ کر یہاں آگئے!"

"ہاں —— وہ عورت بہت نیک ہے، بہت پاک۔ اسے مجھ پر بہت اعتماد ہے مَیں نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ مَیں بھی نیک بن جاؤں گا —— لیکن مَیں خود کو بدل نہیں سکتا —— اس حالت میں میرا واپس جانا اس کی اور میری یقینی تباہی ہوگا۔"

"وہ عورت بہت نیک ہے؟" —— عورت نے تلخ اور طنزیہ مسکراہٹ سے پوچھا "آپ اس سے بددل نہ ہوں —— مقصد آپ کو کچھ کہنا نہیں ہے۔ آپ کے لئے بعض باتوں کی کوئی اہمیت نہیں —— پھر آپ کا تو کاروبار ہے۔"

"ہاں —— مَیں کاروبار کرتی ہوں" —— وہ کہنا چاہتی تھی —— "یہ میری دکان ہے خیرات گھر تو نہیں ہے؟" —— لیکن الفاظ ہونٹوں پر آ کر رک گئے۔ اور وہ سوچنے لگی "کاروبار میں ادھار بھی تو چلتا ہے!"

اس دلچسپ خیال پر اسے ہنسی آگئی، اور اس نے دل میں کہا —— "چلو یونہی سہی ایک بار یہ بھی سہی!"

"مجھے منظور ہے!" —— اُس نے کہا اور تقریباً" دس روپے کی رقم مسکراتے ہوئے اٹھالی،

اور جب نادر واپس جانے کے لئے آہستہ آہستہ سر جھکائے سیڑھیوں کی طرف بڑھ رہا تھا، تو عورت مسکراتی ہوئی خدا حافظ کہنے کے لئے اس کے ساتھ تھی۔ دروازے پر پہنچ کر عورت نے سو سو روپے کے تین نوٹ نادر کے ہاتھ میں رکھ دیئے اور کہا ——

"آج ہم نے سودا بیچا نہیں خریدا ہے!"

وہ چند لمحے خاموش کھڑا رہا۔ پھر اُس نے تینوں نوٹ کوٹ کی جیب میں ڈال لئے اور تیزی سے نیچے سڑک پر اُتر گیا ——

△

نادر اپنے کمرے میں داخل ہُوا تو دیکھا کہ ثروت جاگ رہی ہے۔ وہ پریشان تھی لیکن اس نے پریشانی پر قابو پاتے ہوئے کہا —— "کہاں چلے گئے تھے؟ بہت دیر سے آئے ہو، میں تو گھبرا گئی تھی!"

"گھومتا ہُوا ذرا دور نکل گیا تھا۔ اس وقت باہر جانا بہت اچھا رہا" —— ثروت محسوس کر رہی تھی کہ نادر اب واقعی مطمئن ہے۔ اس کی دہشت ختم ہو چکی تھی۔ وہ اس تبدیلی پر خوش تھی —— "اتفاق سے ایک مہربان دوست سے ملاقات ہوگئی۔ بالکل غیر متوقع ملاقات تھی یہ۔ وہ مجھے اپنے گھر لے گیا۔ بڑی محبت سے پیش آیا۔ مَیں نے اسے اپنا سارا حال سنایا۔ وہ کوئی امیر آدمی نہیں ہے۔ پھر بھی اس نے میری مدد کی اور ہم دونوں کو تباہی سے بچا لیا —— یہ دیکھو! یہ تین سو روپے اس نے دیئے ہیں۔"

ثروت حیرانی سے روپوں کو دیکھنے لگی، جیسے اسے نادر پر یقین نہ ہو۔

"ارے چوری نہیں کی" —— نادر نے مسکرا کر کہا —— "یقین جانو اس نے یہ روپے مجھے زبردستی دیئے ہیں اور مَیں نے وعدہ کیا ہے کہ مَیں اس کا حق اسے ضرور واپس دوں گا۔"

ثروت مطمئن ہوگئی۔

نادر بستر پر جا لیٹا، اور لیٹتے ہی سو گیا۔ ثروت بھی سو گئی۔

△

اور بازار والی عورت اس رات بار بار اپنے آپ پر ہنستی رہی۔ اُسے اپنا فقرہ بھی بہت دلچسپ معلوم ہو رہا تھا:

"آج ہم نے سودا بیچا نہیں خریدا ہے۔"

"لوگ سنیں گے تو کیا کہیں گے ؟ ہنسیں گے مجھ پر!"

"لیکن میں لوگوں کو بتانے ہی کیوں لگی!"

"مگر اتنا دلچسپ واقعہ دوسروں کو سنائے بغیر کیسے رہوں گی!"

واقعہ اُسے بیحد دلچسپ بھی معلوم ہو رہا تھا اور مضحکہ خیز بھی لیکن وہ نادم نہیں تھی۔ بلکہ اسے یکسانیت کے ٹوٹنے کا احساس ہو رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے یہ شب اس نے گھر سے کسی کھلے مرغزار میں گزاری ہے۔

اس واقعے نے اسے ایک بڑے غیر مذہبی انداز میں غنی بنا دیا تھا۔ یہ واقعہ اپنی نوعیت میں واحد تھا، اس لئے وقت گزر جانے کے باوجود گرد کی تہیں اسے پوری طرح چھپا نہیں سکیں ــــ گو اب اس کی زندگی کا پھر وہی معمول تھا۔

△

"کیا پیئیں گے آپ؟" ــــ یہ سوال وہ ہر نئے آنے والے سے کرتی اور جب کوئی نو
جھینپ کر گھبرا کر چائے یا کافی یا شربت مانگتا، تو وہ ایک ماں کی طرح اس نوجوان بچے کے لا
اٹھاتی، یہاں تک کہ اس کی جھجک ختم ہو جاتی۔

△

"کیا پیئیں گے آپ؟" ــــ یہ سوال اس نے بارہا کیا تھا، اور اس سوال کا مطلب تھا
مہمان نووارد ہے۔ پہلی بار آیا ہے۔

"کیا پیئیں گے آپ؟" ــــ یہ سوال اس نے سامنے بیٹھے ہوئے حسین نوجوان پر
محبت بھری نظر ڈالتے ہوئے کیا اور سوچا ــــ کتنا وجیہہ ہے یہ نوجوان! اس کی یہ س

ہ وانی اور سیاہ چشمہ اس کی شخصیت کو حسین تر بنا رہے ہیں!

اس نے کئی نوجوانوں کے بارے میں یہ سوچا تھا، اسے جو نوجوان اب تک واقعی اچھے لگے یہ نوجوان بھی ان میں شامل تھا۔

"کیا پیئیں گے آپ؟" ــــ اس نے پھر پوچھا ــــ نوجوان اسے مسکراتے ہوئے دیکھے جا رہا تھا۔ بولا ــــ "کافی۔"

"کافی؟ ــــ واقعی؟" ــــ عورت کو یقین نہیں آ رہا تھا، کیونکہ یہ نوجوان عام نوجوانوں سے مختلف تھا۔ اس میں جھجک نہیں تھی۔ خوف نہیں تھا، گھبراہٹ نہیں تھی۔ اس کی مسکراہٹ اور اس کے چہرے سے بلکہ پوری شخصیت پر پھیلے ہوئے اطمینان سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کوئی کچا کھلاڑی نہیں ہے۔

"آپ کی حیرانی بجا ہے!" ــــ نوجوان نے کہا ــــ "لیکن اتفاق سے یہ بات درست ہے کہ میں شراب نہیں پیتا۔"

"سگریٹ ــــ؟"

"ہاں سگریٹ ضرور پیوں گا۔"

"مُراد!" ــــ عورت نے کہا۔

مُراد ایک طشتری میں سگریٹ لایا۔ نووارد نے سگریٹ سلگا کر، سو روپے کا ایک نوٹ طشتری میں رکھ دیا۔

"مُراد میاں! یہ تمہارے لئے ہے، صرف تمہارے لئے۔ اس میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہے۔"

مُراد بہت خوش تھا۔

اور جب عورت نے غزل چھیڑی تو اس کی آواز کا ترنم بہت اثر انگیز تھا اور رقص میں اس کے جسم کی ہر لچک سے مسرت کی لہریں اٹھ رہی تھیں۔

"تم بہت اچھا گاتی ہو، بہت اچھا رقص کرتی ہو۔ تم بہت اچھی ہو"!

"حضور کی عنایت ہے"!

"ذرا قریب آجاؤ۔ میں تمہیں غور سے دیکھنا چاہتا ہوں"

عورت اُس کے پہلو میں آبیٹھی۔ وہ مطمئن تھی کہ آج کی رات دھن برسے گا۔ اس نے مرا کو بلاکر کہا ـــــ "آج کی رات اور کوئی نہیں آئے گا"

"تمہارے پاس آنے والے سب لوگ شراب پیتے ہیں؟"

"ہاں، جو نہیں پیتا وہ جلد ہی پینے لگتا ہے"۔

"میں نے شراب نہ پینے کا عہد کر رکھا ہے۔ تمہارا کیا اندازہ ہے، کیا میں اپنا عہد نبھا سکوں گا؟"

"آپ کی شخصیت بتا رہی ہے کہ آپ کامیاب ہوں گے"

"تم بہت ذہین ہو"

"آپ کی ذرہ نوازی ہے ـــــ میں ابھی تک اپنے عظیم مہمان کے نام سے ناواقف ہوں"!

"نام؟ نام میں کیا رکھا ہے! پھر تم ایک ہو اور تمہارے پاس آنے والے مہمانانِ شب لاتعداد، تم کس کس کا نام یاد رکھ سکتی ہو۔ تمہیں آج نام بتا بھی دوں تو کل بھول جاؤ گی ـــــ اور اگر کچھ عرصہ یاد بھی رکھو، تو کیا فرق پڑ جائے گا ـــــ میں آج اتفاق سے یہاں آیا تھا۔ کوئی یقین نہیں کہ پھر بھی کبھی تم سے ملاقات ہو گی ـــــ سو، میں حامد ہوں یا محمود، کیا فرق پڑتا ہے"!

عورت زخمی پرندے کی طرح تڑپ اٹھی، اور پھر یکلخت جیسے کسی خوف سے اپنے آپ میں سمٹ سی گئی۔ وہ محسوس کر رہی تھی کہ وہ بہت حقیر ہے۔ جیسے وہ کسی بلندی سے اچانک گر گئی ہو۔ وہ اداس ہو گئی ـــــ "ہاں آپ درست فرماتے ہیں۔ یہاں حامد اور محمود میں کوئی فرق نہیں ہے۔ یہاں باپ بھی آتا ہے اور بیٹا بھی۔ یہاں آنے والے کا کوئی نام نہیں ہوتا۔

وہ سب ایک سے ہوتے ہیں۔ سب مرد ہوتے ہیں۔ صرف مرد، ان میں انسان کوئی نہیں ہوتا"

"تمہیں یقین نہیں آئے گا کہ میں ایک انسان کی حیثیت میں یہاں آیا ہوں اور صرف چند غزلیں سن کر چلا جاؤں گا"

بے یقینی کی عجیب سی کیفیت میں وہ غزلیں سناتی رہی ـــ نوجوان رخصت ہونے لگا تو عورت کے قدموں میں نوٹوں کی گڈی رکھ کر بولا "میں تمہارے احسان کی قیمت ادا نہیں کر سکتا۔ پھر بھی دس ہزار روپے کی یہ حقیر رقم قبول کر لو"

عورت کا گلا خشک ہو گیا، اسے نہ آنکھوں پر اعتبار آ رہا تھا نہ کانوں پر۔ نوجوان دروازے تک پہنچ چکا تھا تو اس نے اُسے ہاتھ پھیلا کر روکا اور کہا "آپ نے مجھے اس قابل نہیں جانا کہ اپنا نام بتائیں لیکن میں چاہتی ہوں کہ میرا نام آپ کی یاد کا حصہ بنا رہے ـــــ مجھے ـــــ"

"میں جانتا ہوں ـــــ" نوجوان نے عورت کی بات کاٹ کر کہا "میں سب کچھ جانتا ہوں تمہیں مجھ سے بہتر اور کون جان سکتا ہے!"

عورت اس خوف سے کانپ گئی کہ وہ اب اس کو بتائے گا کہ تم ایک طوائف ہو ـــ طوائف!

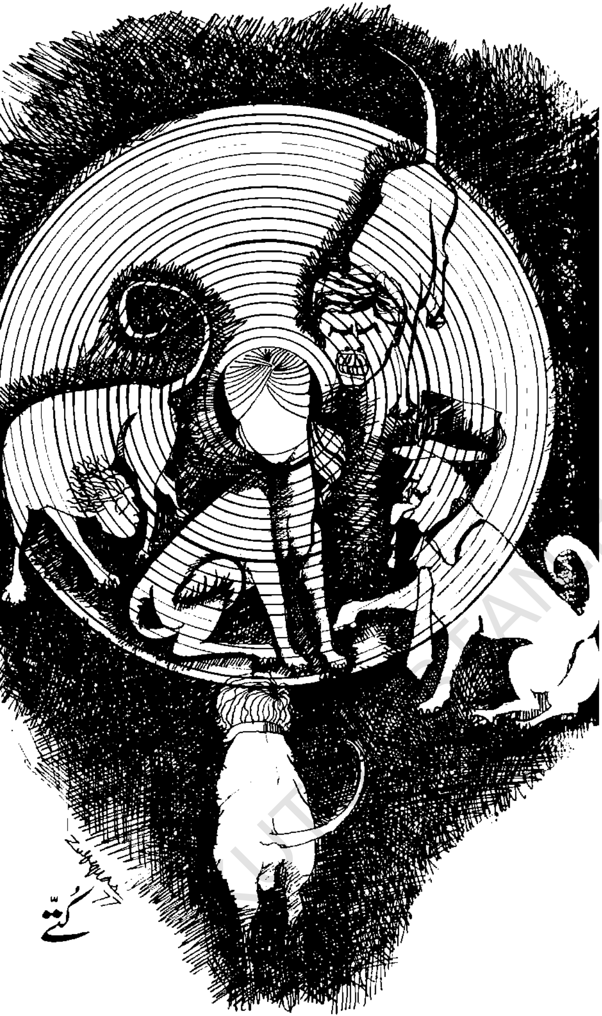
"تم خدا کا سایہ ہو ـــ ظلِّ الٰہی" نوجوان نے کہا "میں نے یہ بات اپنے ایک نیک دوست کو بتائی تھی وہ آج تک مجھ سے ناراض ہے"

"ظلِ الٰہی!؟" عورت نے احساسِ ندامت سے کہا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ نوجوان ایک طوائف کو یہ نام دے کر بہت بڑا گناہ کر رہا تھا۔

"شائد تمہیں یاد ہو" نوجوان نے کہا "بہت پرانا واقعہ ہے۔ ایک خستہ حال نوجوان تمہارے پاس آیا تھا۔ تم نے اسے تباہی سے بچایا تھا ـــ یاد کرو اس نے تمہیں بتایا تھا کہ وہ اپنے گھر میں ایک نوجوان عورت کو چھوڑ کر آیا ہے"

"آیا تھا!" عورت کو یہ سب کچھ یاد آ رہا تھا "آیا تھا!"

"وہ نوجوان عورت اس نوجوان مرد کی بہن تھی!"



گلی سے اٹھنے والے شور نے اُسے حیرت اور خاموشی کے سمندر سے نکالا اور ساتھ ہی مُراد، ایک خون آلود خنجر ہاتھ میں لیے اور ایک فاتحانہ شان چہرے پر بکھیرے کمرے میں داخل ہوا۔ وہ محسوس کرنے لگی جیسے وہ پتھر میں بدل گئی ہے لیکن وہ گلی کا شور بھی سن رہی تھی اور مراد کی فاتحانہ تقریر بھی۔

"ایک طوائف کو ظلِ الٰہی کہتا تھا — وہ جہنمی تھا — میں نے اسے جہنم واصل کر دیا۔ میں نے اسے اس کے گناہ کی سزا دے دی ہے — اِب اس کی گندی زبان کبھی خدا کی بجز... نہیں کر سکے گی۔"

عورت گھبرا کر کھڑکی کی طرف بھاگی نیچے گلی میں لوگ جمع تھے جو سب اپنے انداز میں ایک ہی بات کہہ رہے تھے وہ مراد نے بہت اچھا کیا ہے۔ اس نے ایک گنہگار کو اس کے گناہ کی ٹھیک سزا دی ہے۔ مراد زندہ باد، مراد زندہ باد"

پھر سب لوگ بکھر گئے اور گلی کے تمام کتے لاش کے گرد جمع ہو گئے۔

عورت یہ منظر دیکھتی دیکھتی اور یہ سوچتی سوچتی بے ہوش ہو کر گر گئی کہ خدا کی طرف سے نازل ہونے والے عذاب اور کرم میں پہچان کا شعور اسے کبھی حاصل ہو بھی سکے گا یا نہیں!!

لڑکیاں گھر شادی ہونے پر چھوڑتی ہیں لیکن پروین کو اپنا اپنے پیارے پاپا کا گھر، پاپا کے اس دنیا سے رُٹھ جانے پر چھوڑنا پڑا۔ یہ کوئی شادی تو نہ تھی کہ ماں باپ کے گھر سے رخصت ہوتے وقت وہ قیمتی جہیز ساتھ لے کر جاتی۔ اس کا اسے ہوش ہی کب تھا ــــ مگر ڈولی اُسے اتنی عزیز تھی، اس قدر پیاری تھی کہ جب وہ چچا کے گھر پہنچی تو ڈولی اس کی گود میں تھی۔

اب اس واقعہ کو دس ماہ ہونے کو آئے تھے۔

ممی تو اسے قطعاً یاد نہیں تھیں۔ ماں باپ کی یہ اکلوتی بچی ابھی دو برس کی بھی نہ ہوئی تھی کہ ممی اِس جہانِ فانی سے بہت دور جا بسی تھیں۔ ہاں ممی کا ذکر اس نے بارہا سنا تھا۔ پاپا اکثر اُن کی تسبیح پڑھا کرتے تھے اور گھر کی پرانی خادمہ اُن کے ذکر سے کبھی نہ تھکتی تھی۔ ان کی کتنی ہی تصویریں پاپا کے البم میں محفوظ تھیں اور وہ دو بڑے سائز کی تصویریں جو پاپا نے اپنے کمرے میں سجا رکھی تھیں اتنی پیاری تھیں کہ دیکھو تو بس دیکھتے ہی رہو۔ پروین نے بارہا چاہا کہ ممی کی ان تصویروں میں جان پیدا ہو جائے مگر یہ کسی کے بس کی بات نہ تھی۔ تصویر بہرحال تصویر ہے۔ اس میں رنگ ہو سکتا ہے، حُسن ہو سکتا ہے، زندگی تو نہیں ہو سکتی۔ تصویر کی انتہائی تعریف

یہ ہے کہ یہ تصویر تو بس جیسے منہ سے بولنے لگی ہے گویا اصل تعریف یہاں بھی زندگی کی حرکت کی ہے رنگوں کی نہیں کہ محض رنگ تو بے جان چیزیں ہیں۔

اُس شے کا غم جو اپنی ہونے کے باوجود کبھی اپنے قبضے میں نہ رہی ہو اتنا شدید نہیں ہوتا جتنا اس شے کے چھن جانے کا ہوتا ہے جو برسوں اپنے پاس رہ چکی ہو اور دل کو بےحد عزیز بھی ہو۔ بچہ بے جان کھلونوں سے کھیلتا ہے۔ چند لمحے یا چند دن ان کو اپنے پاس رکھتا ہے تو ان سے اس قدر مانوس ہو جاتا ہے کہ کسی کھلونے کے ٹوٹ جانے یا گم ہو جانے پر وہ گھنٹوں بلک بلک کر روتا ہے۔ ماں کو تو یوں سمجھو کہ پروین نے دیکھا ہی نہ تھا۔ بھلا دو سال کی بچی کو کیا یاد رہ سکتا ہے کہ اس کی ماں کون تھی، کیسی تھی۔ لیکن پاپا تو ایک عمر اس کے ساتھ رہے تھے۔ ان کے جانے کا جس قدر بھی غم ہوتا، کم تھا۔

وہ چچا کے گھر آئی تو پاپا کی موت کا روح فرسا منظر اپنے ذہن محفوظ لائی تھی۔ گھر بھر میں کہرام مچا تھا یہ اس کی باقاعدہ زندگی کا اولین اور عظیم ترین صدمہ تھا اور اب اس کے بعد کوئی اور صدمہ، صدمہ نہ تھا۔ جب لوگ اس کے پیارے پاپا کو کندھوں پر اٹھائے لئے جا رہے تھے تو اُسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اُس کے آرام سکھ اور چین کا جنازہ لئے جا رہے ہوں۔

گھر کی حالت بالکل ابتر تھی۔ وہاں سوائے اس کے اور اس کی پرانی آیا کے کون تھا جو گھر کا خیال رکھتا مگر پروین کو اس بات کا ہوش ہی کہاں تھا۔ پھوپھی روتی دھوتی آئی تھی مگر جلد ہی شاید اِس خیال سے کہ گمشدہ چیزوں کا غم کرنا بےکار ہے خود کو سنبھال کر موجودہ اشیاء میں دلچسپی لینے لگی اور قبل ازیں کہ کوئی گھر کی طرف دھیان دینے کے قابل ہو، سلائی کی دونوں مشینیں، ریڈیو، چاندی کا پاندان اور وہ ڈنر سیٹ جو پروین کے پاپا نے ابھی ابھی منگوایا تھا اور جو ابھی استعمال میں بھی نہ آیا تھا، اپنے ہاں چلتا کئے ——————

خالہ ذرا دیر سے پہنچیں۔ جہاں دیدہ عورت تھیں۔ سمجھ گئیں کہ پھوپھی کوئی کارِ نمایاں سرانجام

دے چکی ہیں۔ صاف صاف کہنا مناسب نہ سمجھا اس لئے جملہ عورتوں کو یکجا کر کے عربی کے الفاظ سے پُر اُردو میں ایک تقریر کی جس میں دُنیا کی بے ثباتی کے احوال کے بعد انہوں نے بتایا کہ یتیم بچوں کے مال کو ہاتھ لگانا حرام ہے —— اور پھر انہوں نے بغیر کسی چیز کو ہاتھ لگائے ملازمہ کے ذریعے اپنی بہن کے تمام قیمتی ملبوسات و زیورات اپنے گھر پہنچا دیئے۔ ان کا جواز یہ تھا کہ ان کے بہنوئی کے خاندان کے لوگ ان کی بہن سے متنفر تھے اس لئے صرف وہ خود ہی اس قابل تھیں کہ بہن کی یادگاروں کی حفاظت کر سکیں۔ کہتے ہیں کہ جب بھی انہیں اپنی بہن یاد آتی وہ اس کے ملبوسات و زیورات زیب تن کر کے سہیلیوں سے ملنے چلی جاتیں تاکہ غم غلط ہو جائے اور یہ یاد ان کو اکثر ستاتی رہتی تھی۔

پروین بظاہر سب کچھ دیکھ رہی تھی لیکن فی الحقیقت اس کی آنکھیں اور کان اور تمام دوسری حسیات پاپا کے خیال کے علاوہ ہر دوسرے خیال کے لئے مُردہ ہو چکی تھیں۔ آنکھیں منتظر تھیں کہ وہ پھر چلتا پھرتا، ہنستا بولتا نظر آئے اور کان چاہتے تھے کہ "پینو بیٹی" "پینو بیٹی" کہنے والے لب پھر صدا آشنا ہو جائیں!

خادمہ نے اُسے گھر کے حالات سے باخبر کرنا چاہا مگر اس عالم بے خبری - سے رہائی اس کے بس کی بات نہ تھی۔

اِس اثنا میں پروین کے چچا کو بھی اس سانحے کی اطلاع ہو چکی تھی وہ دور رہتے تھے اس لئے ذرا دیر سے پہنچ سکے اور گھنٹوں بھائی کی قبر سے لپٹ لپٹ کر روتے رہے اور جب انہوں نے پروین کو سینے سے لگایا تو جو لاوا دونوں جانب سے پھوٹا تھا قلم اُسے بیان کرنے سے قاصر ہے۔ وہ آخر مرد تھے انہوں نے خود کو سنبھالا اور پروین کو تسلی دینے لگے۔

پروین نے صرف سُن ہی رکھا تھا کہ اس کا ایک چچا ہے لیکن اُسے کبھی دیکھا نہ تھا دونوں بھائی ایک دوسرے سے کشیدہ خاطر تھے اور آپس میں تعلقات بالکل منقطع تھے اصل

میں پروین کے پاپا نے ایک اجنبی عورت سے شادی کرلی تھی۔ خاندان کے سبھی لوگ مخالف تھے۔ چچا نے خاص طور پر بھائی کے اس اقدام کو بُرا محسوس کیا تھا۔ وہ دن تھا اور بڑے بھائی کی موت کا دن، انہوں نے پھر ایک دوسرے کا مُنہ نہیں دیکھا۔ پھوپھی بہن تھی کبھی کبھار مل لیتی تھی اور اب کوئی سولہ برس کے بعد بھائی بھائی کے گھر آیا تھا مگر ملنے نہیں بلکہ بھائی کی بیٹی کو جو تنہا رہ گئی تھی، سہارا دینے۔ پروین نے جب چچا کو پہلی بار دیکھا اور اُس کی زبان سے بھی وہی "بیٹو بیٹی" کے الفاظ سنے تو اسے یوں لگا جیسے پاپا پھر زندہ ہو گئے ہوں لیکن یہ محض خیال تھا جو زیادہ دیر ساتھ نہ دے سکا۔ پاپا کی موت اتنی تلخ حقیقت تھی کہ اس سے توجہ ہٹانا ناممکن تھا۔۔۔۔

دو دن رُک کر چچا نے بھائی کے تمام معاملات کو سمیٹا اور پروین کو لے کر اپنے گھر آگئے چچی کو پروین کے آرام کا بڑا خیال تھا۔ ان کے کوئی بیٹی نہ تھی صرف پانچ بیٹے تھے چنانچہ انہوں نے کوشش کی کہ اپنی وہ تمام محبت جو ابھی تک بیٹی کے ارمان میں محفوظ رکھی تھی اُسے دے دیں۔ ان دونوں بزرگوں کی محبت کے زیر اثر پروین ایک حد تک خود کو سنبھالنے میں کامیاب ہو ہی گئی ـــ لیکن پاپا ہر وقت اس کا محبوب ترین موضوع تھے۔ اِدھر کسی نے ان کا ذکر چھیڑا، اُدھر وہ ہمہ تن گوش ہوئی جیسے اس کو اپنا محبوب ترین موضوع مل گیا ہو۔

ممی کے انتقال کے بعد پاپا نے شادی نہ کر کے جو عظیم قربانی دی تھی اس کی عظمت کا احساس پروین کو ہو چکا تھا۔ پاپا صرف پاپا نہ تھے وہ تو اس کی ممی بھی تھے بچپن کا زمانہ جو صرف پاپا کے زیر سایہ گذرا تھا اُسے خوب یاد تھا اور چچی کے ہاں ماضی کے اوراق اُلٹتے رہنا ہی اس کا سب سے بڑا مشغلہ تھا۔

وہ چھوٹی سی تھی تو پاپا کے لائے ہوئے بے شمار کھلونوں سے کھیلتی رہتی تھی بے جان کھلونے اس کا دل لبھاتے تو وہ کتنے پیار سے ہنستے تھے اور پھر کبھی کبھی ایک دم وہ اُداس بھی ہو جاتے تھے۔ پروین کو اس تبدیلی کے معنی اب سمجھ آرہے تھے ـــ کبھی کبھی وہ پلاسٹک

کی مُرغی، چینی کی بلی یا لکڑی کے گھوڑے کو کہتی، "بھاگو"، اور وہ کھلونا ذرا بھی حرکت نہ کرتا تو اُسے بہت غصہ آتا۔ چینی کے کئی طوطے اس نے ہوا میں اڑانے کی کوشش میں توڑ دیئے تھے شاید وہ لاشعوری طور پر اس بات کی خواہشمند تھی کہ گھر کی خاموش فضا میں ایک ہنگامہ پیدا ہو جائے اسے باہر جاکر کھیلنے کی اجازت نہیں تھی۔ پاپا کا خیال تھا کہ یوں بچوں کا اخلاق بگڑ جاتا ہے گھر میں ممی کے نہ ہونے کی وجہ سے خواتین اور لڑکیوں کی آمد تقریباً بالکل بند تھی۔ کبھی کبھی اس کی پھوپھی یا خالہ آجاتی تھیں۔ بس۔ ایسے میں ہمیشہ اس کا جی چاہتا تھا کہ اس کے سب کھلونے کبوتر، مرغ، گھوڑے، بکرے، ہاتھی زندہ ہو کر اس کے ساتھ کھیلنے لگیں۔ بے جان کھلونوں سے بیزاری کا اظہار اس روز زیادہ ہوا جب پاپا نے اُسے ایک زندہ بلی لادی اس کا نام اُس نے "لُوسی" رکھ لیا کیونکہ کہانیوں میں اُس نے یہی نام پڑھا تھا۔ اس کے لئے وہ ایک کھلونا تھی جس میں جان پڑ گئی ہو ـــ وہ دوسرے کھلونوں کی طرح سرد نہ تھی۔ اس میں زندگی کی حرارت تھی۔ جب وہ اس کو اپنی رانوں پر بٹھاتی تو وہ اپنی نرم اور گرم کمر اس کے پیٹ سے لگا دیتی یہ اسے بہت بھلا لگتا۔ وہ خود بھی تو ایسے ہی پاپا کی گود میں بیٹھی رہا کرتی تھی۔ پھر پاپا اس کے لئے پنجرے میں بند ایک طوطا بھی لے آئے۔ اب اس نے ایک بار پھر چاہا کہ اس کے باقی کھلونے بھی جاندار بن جائیں۔ اس نے انہیں مار مار کر حکم دیا "بولو، کھیلو، کودو، اِدھر آؤ اُدھر جاؤ"۔ مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئے۔ آخر اس نے تمام کھلونے الماری میں اور آتشدان پر سجا دیئے، جیسے وہ سب تصویریں ہوں، پیاری مگر بے جان، ممی کی تصویروں کی طرح!

لیکن وہ بے فکر نہ ہو سکی تھی بلکہ ان کھلونوں میں جان ڈالنے کے ذرائع سوچتی رہتی تھی۔ تھک ہار کر اُس نے پاپا سے ذکر کیا تو وہ بہت ہنسے اور پھر انہوں نے بتایا کہ جان ڈالنا صرف اللہ میاں کے ہاتھ میں ہے۔ وہ مٹی سے انسان بنا دیتا ہے۔ وہ جسے چاہے زندگی عطا کرسکتا ہے اور جس سے چاہے چھین سکتا ہے۔ پروین نے یہ بات گرہ میں باندھ لی اور رات سونے سے قبل اس نے دیر تک گڑگڑا کر دعا کی کہ اس کے تمام کھلونوں میں یا

کم از کم چڑیوں، طوطوں اور لکڑی کے بڑے گھوڑے میں ضرور جان پڑ جائے. سونے سے قبل اس نے طوطوں اور چڑیوں کو پنجروں میں بند کر دیا اور گھوڑے کے گلے میں رسّی باندھ دی تاکہ زندہ ہو کر وہ کہیں غائب نہ ہو جائیں، لیکن صبح اپنی دعا کو بے اثر پا کر اُسے سخت دُکھ ہوا.....

ایک روز یوں ہُوا کہ طوطے کا پنجرہ کھلا رہ گیا اور وہ سبز پوش کمرے میں ٹہلنے لگا اچانک اس نے طوطے کی ٹائیں ٹائیں اور پھڑ پھڑاہٹ سنی اور دوسرے ہی لمحہ دیکھا کہ وہ بے چارا پسی کے دانتوں میں دُبا دم توڑ رہا تھا. اُسے بہت رنج ہوا. اس نے پسی کو بہت مارا. کئی دن وہ پُسی سے ناراض رہی لیکن پھر صلح ہو گئی. صلح کو ابھی چند روز ہی گزرے تھے کہ پُسی خون میں لت پت ایک چوہا دانتوں میں دبائے اس کے سامنے آموجود ہوئی. اب پروین کو پُسی سے سخت نفرت ہو گئی. اس نے پُسی کو خوب مارا اور گھر سے نکال دیا لیکن وہ پھر واپس چلی آئی مگر پروین کو اب اس کی معیت ہر گز گوارا نہ تھی. اس نے پاپا سے کہہ کر اسے کسی ایسی جگہ پہنچا دیا جہاں سے وہ پھر واپس نہ آسکی.

پُسی سے جدائی کے بعد اس کی توجہ ایک بار پھر کھلونوں کی جانب مبذول ہوئی لکڑی کا بنا ہوا اونچے کوہان والا اونٹ جو پاپا صرف چند روز پہلے لائے تھے کتنا پیارا تھا جیسے بس قدم اٹھانے ہی والا ہو. چینی کی بلی اور چوہے جو ساتھ ساتھ رکھے تھے. پُسی کی جلاوطنی کے بعد دُور دُور کر دیئے گئے. لیکن اس کے ذہن میں عجیب سا خوف کچھ یوں طاری رہا کہ چند ہی روز بعد اس نے بلّی کو اٹھا کر گودام میں ڈال دیا — بڑی مشکل یہ تھی کہ اب وہ اتنی چھوٹی نہ رہی تھی کہ بے جان کھلونوں سے بہل سکے. بالخصوص اپنے مرحوم طوطے اور پُسی کی معیت میں کچھ وقت گذار کر یہ بات مشکل تر ہو گئی تھی. کھلونوں میں اس کی توجہ کا سب سے بڑا مرکز آنکھیں گھمانے والی گڑیا تھی. گو اس کا جسم بے جان تھا مگر آنکھوں میں تو جان تھی اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اس کی آنکھوں کی جان کو اس کے پورے جسم میں پھیلا دے گی. اس نے

سن رکھا تھا کہ خوراک پہلے پیٹ میں جاتی ہے اور وہاں سے جسم کے ہر حصے میں پہنچ جاتی ہے. چنانچہ اس نے طے کیا کہ گڑیا کی جان آنکھوں میں سے نکال کر اس کے پیٹ میں ڈال دے گی. لیکن اس کوشش میں گڑیا کی آنکھیں بھی بے جان ہو گئیں. گڑیا مر گئی اور وہ کئی روز تک اُداس رہی.

پاپا اُس کے شوق کو پہچان گئے تھے. وہ اس کے لئے چابی سے چلنے والے کئی کھلونے لائے اُسے یہ کھلونے بہت اچھے لگے اور یوں چند برس اور بیت گئے.

پھر وہ وقت بھی آگیا جب کھلونوں سے کھیلنے کے دن بہت پیچھے رہ گئے اور چابی سے چلنے والی اور جاندار چیزوں کا فرق اچھی طرح واضح ہو گیا. اب پاپا اس کے لئے ایک چھوٹا سا پیارا پلّا لائے جو رفتہ رفتہ بڑا ہو کر ایک بڑی پیاری کُتیا بن گیا. یہی ڈولی تھی. یہ نام اُسے پاپا نے ہی دیا تھا. ڈولی پروین کو بے حد عزیز تھی. وہ اسے کم ہی نظروں سے اوجھل ہونے دیتی تھی — اور اب تو یہ پاپا کی نشانی بن کر رہ گئی تھی اس لیے پاپا کی چھوڑی ہوئی چیزوں میں اسے وہ سب سے زیادہ پیار کرتی تھی.

بچی کو جانوروں سے کوئی پیار نہ تھا لیکن سب سے بڑے بیٹے مُجیب نے اُسے کتوں کو برداشت کرنا ضرور سکھا دیا تھا. پروین سے اس نے کہا تھا "میرے مُجّو کو بھی کتوں سے بڑا پیار ہے." مُجیب کو مُجّو اس نے یوں کہا تھا جیسے مُجّو کوئی بچہ ہو.

مجیب کو پیار سے مُجّو ہی کہا جاتا تھا. وہ فوج میں کپتان تھا اور صرف عید کے عید گھر آتا تھا فوج سے باہر اس کا جی ذرا کم ہی لگتا تھا. عمر تیس کے لگ بھگ تھی مگر ابھی تک شادی نہ کی تھی ماں کو اپنے کپتان بیٹے پر بڑا ناز تھا. اس کے خیال میں وہ ولی تھا ورنہ دوسرا بیٹا اسد ماں باپ کی اجازت کے بغیر ہی دو شادیاں پرائی بھی کر چکا تھا اور اب تیسری کا تہیہ کئے بیٹھا تھا کپتان بیٹے کی ایک بہت بڑے سائز کی تصویر بڑے کمرے میں لگی تھی جس میں موٹے موٹے ہونٹوں، گھنی مونچھوں اور بھاری جسم والا کپتان مجیب دو السیشی کتوں کی زنجیریں تھامے وردی

پہنے کھڑا تھا۔ کتے آگے کو زور مار رہے تھے اور زنجیریں لوہے کی سلاخوں کی طرح تنی ہوئی تھیں۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے دو السیشن کتے ایک بل ڈاگ کو گھسیٹنے کی بے کار کوشش کر رہے ہوں۔ یا جیسے پرانے یونان کا کوئی سورما، دو منہ زور گھوڑوں کی لگامیں تھامے رتھ پر کھڑا ہو۔

پروین جب اس گھر میں آئی تھی اس وقت صرف سب سے چھوٹا بیٹا سعید خضر ہی گھر پر تھا اس کی عمر چوبیس برس کی تھی۔ وہ ماں کا بے حد لاڈلا تھا اور زیادہ وقت گھر پر ہی رہتا تھا۔ شاہزادوں کے ناز و انداز والا یہ البیلا نوجوان شاعر بھی تھا اور ابھی تک اپنے سپنوں کی شاہزادی کی تلاش میں تھا اس کا خیال تھا کہ جہاں اس کا دل عشق کی تنویر کا گہوارہ تھا وہاں وہ بھٹکی ہوئی دنیا کے لئے خضرِ راہ بھی بن سکتا تھا۔ جبھی تو اس نے اپنا تخلص خضر رکھا تھا۔

پروین کو اس کی باتیں بہت بھلی لگتی تھیں اور وہ اس کی رفاقت میں خاصا سکون بھی پاتی تھی وہ جب اپنے ارادوں کی دنیا کے دروازے اس پر کھولتا تو وہ ایسا محسوس کرتی جیسے باغِ عدن سے عطر بیز ہواؤں کے جھونکے آ رہے ہوں۔ شکل و صورت کا وہ اتنا پیارا تھا کہ بارہا اُسے یہ گمان گزرا کہ اس کے بچپن کا کوئی گڈا جاندار ہو گیا ہے اور وہ بڑا ہو کر سعید خضر بن گیا ہے۔ کئی بار اس کا جی چاہا کہ بچپن کے اس کھلونے کو اٹھا کر ہوا میں اُچھال دے مگر اس خیال پر وہ صرف مسکرا کر رہ جاتی۔ اس کے سوا اور وہ بھی کیا سکتی تھی۔

اسد کپتان مجیب سے بھی چار ہاتھ آگے تھا۔ یعنی کبھی کبھی وہ عید کی ملاقات بھی گول کر جاتا تھا۔

اس کے علاوہ چچی کے دو بیٹے اور تھے! افتخار اور امجد۔ افتخار افریقہ میں کوئی بڑا کاروبار کرتا تھا اور سال کے سال ایک اچھی بڑی رقم ماں کو روانہ کر دیتا تھا۔ وہ ہر سال آنے کا وعدہ کر کے بھول جاتا تھا۔ امجد بھی بچپن سے ہی سب کا لاڈلا رہا تھا اور اب جوانی میں بھی وہ کوئی فکر یا گھر کا کوئی کام کرنے کا قائل نہ تھا۔ اس لئے سب اس کو پیار سے امجد حرامخور کہتے تھے۔ وہ صرف باپ کے سیر و تفریح اور شکار کو ہی اپنی زندگی کا مقصد سمجھتا تھا۔ پہاڑوں کی سیر اس کا محبوب مشغلہ تھا کیونکہ

یوں سیر و تفریح اور شکار کے تمام لطف ایک ساتھ حاصل ہو جاتے تھے۔ وہ کسی تہوار پر گھر سے غیر حاضر نہیں ہوتا تھا۔ اسے خوشی کی کسی تقریب کی اطلاع مل جاتی تو وہ جہاں بھی ہوتا سب کام چھوڑ کر اس تقریب میں شرکت کے لئے آ موجود ہوتا۔ اس کی بھی ایک تصویر بڑے کمرے میں آویزاں تھی۔ بندوق کی نالی کندھے کے عقب سے آ کر اس کے بائیں رخسار کو چھوتی ہوئی سر سے اوپر نکل گئی تھی۔ تصویر میں وہ بھی ڈولی کی طرح نرم و نازک سا لگا۔ اس نے ڈولی کو گود میں لے کر بھینچا تو اسے تصویر پر ترس آنے لگا کہ کہیں بیچارہ بندوق اٹھاتے اٹھاتے تھک نہ جائے اور پھر وہ مسکرا دی۔ اس کی یہ عادت ہو گئی تھی کہ جو چیز یا بالخصوص جو شخص اسے پسند آتا وہ اس کا مقابلہ اپنے بچپن کے کسی کھلونے سے ضرور کرتی تھی اور یہ مقابلہ اسے اتنا دلچسپ معلوم ہوتا کہ اُس نے کبھی اس عادت کو ترک کرنے کے بارے میں نہیں سوچا۔

پروین کو یہاں آئے ابھی زیادہ عرصہ نہیں گذرا تھا کہ سعید خضر کو محسوس ہونے لگا جیسے اس کے اشعار ملک و قوم اور معاشرہ و سیاست کے موضوعات سے دُور ہوتے جا رہے ہیں اور غزل کی وہ پرانی روایت جسے اس نے فرسودہ اور بے کار سمجھ کر درخورِ اعتنا نہ سمجھا تھا اس کے ذہن اور قلم پر قبضہ کئے جا رہی ہے۔ اُسے پیانو بجانا خوب آتا تھا لیکن اب سے پہلے وہ پیانو پر صرف غالب کی غزلیں گایا کرتا تھا کیونکہ اس کی اپنی نظمیں ایک خاص مقصد کے تحت لکھی گئی تھیں جن کا پیانو پر گائے جانا ممکن نہ تھا۔ مگر اب وہ غزلیں کہتا تھا اور اپنی ہی غزلیں پیانو پر گاتا تھا کئی بار اُسے یوں محسوس ہوا کہ اگر وہ اپنی غزل پیانو پر نہیں گائے گا تو پاگل ہو جائے گا۔ اور اسے یہ بوجھ ہلکا کرنا ہی پڑتا تھا۔ دل میں وہ جانتا تھا کہ وہ غزلیں پیانو پر کیوں گاتا ہے، کہ اس کی توجہ معاشرتی موضوعات سے کیوں ہٹ گئی ہے اور کہ اب اس کے قلم پر کس کی حکمرانی ہے لیکن وہ کوئی بات کہتے ہوئے ڈرتا تھا۔ یہ ڈر بھی رفتہ رفتہ کم ہو گیا۔ آخر اُس نے اپنے جی میں ایک فیصلہ کیا اور موقع کی تلاش میں رہنے لگا۔

پروین کو خضر بھلا لگتا تھا مگر صرف ایک کھلونے کی طرح جسے اٹھا کر طاق میں یا آتشدان

پڑھ کر دور سے بھی دیکھا جا سکے اس کے لئے وہ ڈولی سے کم اہم تھا۔ لیکن اس کا سب سے زیادہ وقت گذرتا بھی اسی کے ساتھ تھا کیونکہ وہ زیادہ گھر پر ہی رہتا تھا۔ وہ اکٹھے ناشتہ کرتے تھے۔ اکٹھے کھانا کھاتے تھے اور ایک دوسرے کو لطیفے سناتے تھے۔ پروین اس کے چھوٹے موٹے کام بھی بخوشی کر دیتی تھی۔ لیکن جب بھی اس نے ڈولی کو اپنے ساتھ کہیں لے جانے کی خواہش ظاہر کی پروین راضی نہ ہوئی۔ ڈولی سے اس کو اتنا پیار کیوں تھا یہ جاننا اب کچھ مشکل نہیں رہا۔ گذشتہ واقعات نے اُسے باپ کی طرح عزیز بنا دیا تھا ایک بار اُس کے انکار پر سعید خضر بہت رنجیدہ ہوا۔ پروین کو ترس آگیا اور اس نے ڈرتے ڈرتے ڈولی کو اس کے ہمراہ بھیج دیا۔ ڈولی تو چلی گئی لیکن وہ خود متفکر ہو گئی۔ وہ بار بار کھڑکی سے باہر دیکھتی یوں جیسے کوئی ماں اُس ننھے بچے کے لئے فکرمند ہو جاتی ہے جو تنہا باہر نکل گیا ہو۔ آخر خضر واپس آگیا۔ پروین نے دیکھا کہ دو خونخوار سے کتے دور کھڑے ڈولی کو یوں دیکھ رہے تھے جیسے اُسے کھا جانا چاہتے ہوں — سعید خضر پر پروین کی بے چینی واضح ہو گئی تو اس نے پھر کبھی ڈولی کو پروین سے جدا کرنے کی خواہش نہیں کی۔ اور شاید اب اُسے یہ رعایت دوبارہ مل بھی نہ سکتی کیونکہ پروین کو ڈر تھا کہ کہیں وہ کتے ڈولی کی جان بھی یوں نہ نکال دیں جیسے اُس نے بچپن میں اپنی گھومتی آنکھوں والی گڑیا کی جان نکال دی تھی۔

عید قریب تھی۔ پروین کو اس بات کی بے حد خوشی تھی کہ وہ دوسرے بھائیوں سے بھی ملے گی۔ اُسے اپنے بھائیوں سے ملنے کا بہت اشتیاق تھا۔ اس نے وہ گیت سنے تھے جن میں بہنیں اپنے بھائیوں سے پیار کا اظہار کرتی ہیں ایسی کہانیاں پڑھی تھیں جن میں بھائی بہنوں کی سب سے بڑی خوشی بن جاتے ہیں۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ اس کا بھی کوئی بھائی ہوتا اور اب جو ایکدم کئی بھائی ملے تھے تو وہ بڑی خوش تھی۔

ایک روز وہ کپتان مجیب کی تصویر کے سامنے کھڑی تھی۔ اُسے اپنا چینی کا بُل ڈاگ یاد آرہا تھا اور اس مشابہت پر ایک شرارت آمیز مسکراہٹ اس کے لبوں پر پھیل

گئی تھی۔ اچانک سعید خضر بھی وہاں آنکلا۔ یہ منظر دیکھ کر خضر کچھ ایسا پریشان ہوا کہ خود پر قابو کھو بیٹھا

"تمہاری طبیعت بھی ایک عجوبہ ہے" اس نے کہا "یا تو جانوروں سے پیار کرتی ہو یا تصویروں سے یا پھر غیر حاضر لوگوں میں دلچسپی لیتی ہو۔ اپنی امی کو یاد کرتی ہو، پاپا کو ڈھونڈتی ہو اور پوچھتی ہو کہ مجیب بھائی کب آئیں گے، کہیں افتخار بھائی نے شادی تو نہیں کر لی افریقہ میں، اسد گھر میں کیوں نہیں رہتے۔ امجد کو آپ لوگ حرامخور کیوں کہتے ہیں۔ یہ سب بھائی کب آئیں گے۔ میں ان سے ملنا چاہتی ہوں —" اس کی سانس اُکھڑنے لگی تھی۔

"اس میں جلنے کی کیا بات ہے" پروین نے خضر کا سلسلہ گفتگو توڑتے ہوئے کہا "وہ نہیں یہ اچھا نہیں لگتا۔"

"تو تمہیں کیا اچھا لگتا ہے؟ کیا اچھا لگتا ہے تمہیں؟" خضر ایکدم جذباتی ہو گیا۔ جیسے تحمل کو بھول گیا ہو۔ "کیا اچھا لگتا ہے تمہیں؟ — یہ ڈولی؟ یہ ڈولی؟ یہ جانور، کھلونے، تصویریں السیشی کتے اور یہ بُل ڈاگ، یہ جنگلی جانور، کپتان مجو جس کی تصویر کو دیکھ کر تمہارا جی کبھی نہیں بھرتا؟"

پروین حیران تھی کہ خضر کی تمام نرمی ایکدم کہاں غائب ہو گئی تھی۔ اس کا چہرہ زرد ہو گیا تھا اور نقوش میں تناؤ پیدا ہو گیا تھا۔

"کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ ذرا اپنا چہرہ تو دیکھو" اس نے سہمے ہوئے انداز میں کہا۔

"میرا چہرہ؟" خضر نے غصہ اور شدت جذبات سے اور زیادہ مغلوب اور زرد ہوتے ہوئے کہا۔ "میں جانتا ہوں میرے چہرے کو کیا ہوا ہے۔ یہ تم ہو جو کچھ نہیں دیکھ رہی ہو، جس کی آنکھیں بند ہیں۔ مگر تمہیں کیا، تمہیں تو دلچسپی ہے جانوروں سے یا جانور نما انسانوں سے — لیٹی، ڈولی، السیشی کتے، بُل ڈاگ مجو، یہ ہیں تمہارے محبوب، تمہیں انسانوں سے کیا واسطہ!"

اتنا کہہ کر اچانک اس کے لہجے میں پھر نرمی آگئی شاید اس لئے کہ اس کے اِن الفاظ کو سن کر پروین ایکدم زرد ہو گئی تھی۔ "کاش تم شاعر کے دل میں جھانک سکتیں پروین! کاش تم

جان سکیں کہ خضر کے شعروں میں کون چھپا بیٹھا ہے! کاش تمہیں معلوم ہو سکتا کہ خضر کو بھی آج ایک راہنما کی ضرورت ہے! — میں نے اپنے جذبات کو کتنی دیر دل کے نہاں خانے میں قید رکھا مگر یہ سرکش گھوڑے آخر بے قابو ہو ہی گئے ——————

— آج خضر گمراہ ہے — کاش تم اسے راستہ دکھا سکو!"

خضر کی آواز میں اتنا کرب تھا کہ پروین خوفزدہ ہو گئی۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہے اور کیا کرے۔ آخر اس نے ڈولی کو اٹھا کر سینے سے یوں لگا لیا جیسے اب وہ خود مامون و محفوظ ہو گئی ہو!

ابھی وہ سنبھل بھی نہ پائی تھی کہ خضر کے چہرہ کی نرمی ایک بار پھر شکست کھا گئی اور وہ بولا "خضر کو تمہاری ضرورت ہے اور تم خضر سے زیادہ اس کتیا کو چاہتی ہو — اس کو سینے سے لگائے پھرتی ہو — اس ڈولی کو —" اور اس نے ڈولی کی طرف یوں ہاتھ بڑھایا کہ پروین اور زیادہ ڈر گئی۔ خضر اسے بہت خوفناک نظر آنے لگا بالکل ٹیپی کی طرح — پروین ایسی گھبرائی کہ اس کی گرفت ڈھیلی ہو گئی اور ڈولی آزاد ہو کر کمرے سے باہر بھاگ گئی اور سعید خضر کا آگے بڑھا ہوا ہاتھ اس کے سینے پر آ رکا۔ اُسے یوں محسوس ہونے لگا جیسے وہ کوئی چوہیا ہے اور خضر بِلا وہ سمجھتی تھی کہ اس میں چلنے کی بھی ہمت نہیں لیکن کسی نہ کسی طرح وہ وہاں سے بھاگ ہی نکلی اور اپنے کمرے میں پہنچ کر تکیے میں مُنہ دے کر دیر تک روتی رہی — اسے یوں لگا جیسے وہ خضر سے نفرت کرنے لگے گی۔

رات کو اُسے بخار ہو گیا۔ خضر کسی کام کا بہانہ کر کے کئی روز گھر سے غائب رہا۔ جب وہ واپس آیا تو بہت خاموش، افسردہ اور شرمندہ سا تھا۔ پروین کا بخار تو جلد ہی جاتا رہا لیکن وہ بڑی سہمی سہمی سی نظر آتی رہی۔

ابھی یہ واقعہ تازہ ہی تھا کہ اچانک اسد آ پہنچا۔ وہ ہمیشہ غیر متوقع طور پر آتا تھا اور پھر اسی طرح اچانک رخصت بھی ہو جاتا تھا۔ وہ بادل کا ایک بڑا ٹکڑا تھا جو آتے ہی پھیل کر سارے

گھر پر چھا جاتا تھا اور برس کر واپس چلا جاتا تھا۔ خاموش بیٹھنا اس کے لئے گناہ تھا۔ پروین سے تو اس نے زیادہ باتیں نہیں کیں لیکن اپنی ماں کا دماغ خوب چاٹا گیا۔ اس کا زیادہ وقت یہ ثابت کرنے میں صرف ہوا کہ وہ دو عورتیں جنھیں وہ بیویاں بنا کر چھوڑ چکا تھا اس کے اہل نہیں تھیں اور کہ گذشتہ تجربات کی روشنی میں اب وہ اس قابل ہو گیا تھا کہ انتخاب میں کوئی غلطی نہ کرے۔ ماں نے پیار آمیز غصہ میں جواب دیا "مجھے تو شاید زندگی بھر اپنی پسند کی بیوی نہ مل سکے گی!" مگر اسد نے مُسکرا کر کمرے کے اندر داخل ہوتی ہوئی پروین کی طرف دیکھ کر کہا "آپ غلط سوچ رہی ہیں امی اب کے میں نے بڑی اعلیٰ ہستی منتخب کی ہے۔"

پروین نے یہ بات سُن لی اور اس کے بڑھتے ہوئے قدم دروازے کی چوکھٹ پر ہی رُک گئے۔ وہ اسد بھائی سے ملنے چلی تھی لیکن ابھی وہ اُسے بھائی کہنے بھی نہ پائی تھی کہ نفرت کا بیج اس کے دل میں ڈال دیا گیا تھا۔ وہ حیران تھی کہ یہ کس قسم کے بھائی تھے جن کا کردار ٹیپی کا کردار تھا۔ بھائیوں سے ملنے کی خواہش کی شدت کی جگہ اب ایک دبے ہوئے احساسِ خوف نے لے لی تھی۔

امجد آیا تو گھر کی رونق میں بڑا اضافہ ہوا۔ پروین نے اسے ڈرتے ڈرتے دیکھا وہ واقعی پیارا تھا۔ بالکل ڈولی کی طرح نرم، تیز اور چالاک۔ اس نے سیاہ چشمہ آنکھوں سے اُتارا اور مسکرا کر پروین کی جانب سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے اپنا ہاتھ اپنی ممی کی طرف بڑھایا۔

"پروین — پروین — تمہاری تایازاد بہن" ماں نے تعارف کروایا۔

"تایازاد بہن!" امجد نے بات کاٹ دی "آہا — آہا — بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر — یقین جانیے — اتنی — اتنی (اس نے یوں ہاتھ پھیلائے جیسے پورے کرۂ ارض کو ہاتھوں میں تھام لینا چاہتا ہو) میرا مطلب ہے — کہ السلام علیکم!" اور اس نے مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھا دیئے۔

پروین گھبرا گئی۔

"امی!" امجد چلایا۔ "یہ کیسی تایازاد بہن ہے، نہ سلام، نہ سلام کا جواب، نہ مصافحہ نہ بات!"

"پروین، ہاتھ ملالو بیٹیا، یہ تمہارے بھائی ہیں،" امجد کی چچی نے کہا۔

"امجد حرامخور!" غیرارادی طور پر پروین کے مُنہ سے نکلا۔ گھر میں جب بھی کسی نے امجد کا نام لیا ساتھ حرامخور کا استعمال ضرور ہوا۔ پروین کے کان اس کے اتنے عادی ہو گئے تھے کہ اب غیرشعوری طور پر یہ خطاب اُس کی زبان پر آ گیا۔

"دیکھا امی، یہی ہے میری آپ کی لڑائی،" امجد نے مصنوعی غصّے کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "یہ بھی کوئی انصاف ہے کہ ہر شخص کو آپ پہلے ہی میری بے عزتی کرنے پر تیار رکھتی ہیں آخر لوگ کیا کہیں گے — اور یہ ہماری نئی نویلی پیاری سی بہن کیا سوچے گی؟"

"تو کیا تُو حرامخور نہیں ہے؟" اسد نے سوال کیا۔

پروین کو اس سوال پر ہنسی آ گئی۔ امجد کو شور مچانے کا ایک اور موقعہ ملا۔ "امی لو دیکھو یہ محترمہ ابھی سے مابدولت پر ہنسنے بھی لگیں۔ ظلِّ سبحانی کے ساتھ یہ سلوک! میں نے بھی اگر ان محترمہ کو اپنے جیسا حرامخور نہ بنایا تو نام بدل لوں گا۔"

"تو کیا حرامخور کی جگہ کام چور یا بے شرم رکھو گے؟" اسد نے پھر چٹکی لی۔

"بھیّا،" امجد نے کہا "کاش آپ مجھ سے ایک سال بڑے نہ ہوتے۔ کاش ہم دونوں جڑواں بھائی ہوتے پھر میں آپ کو آزادی سے اِن باتوں کا مزا چکھاتا۔"

"تو مجھے برابر کا ہی سمجھ لے۔"

"اچھا؟"

"ہاں"

"اچھا؟"

"ہاں"

"پھر سوچ لیجیئے، معاملہ خطرناک ہے۔"

"سوچ لیا ہے، بس باتیں مت بنا۔"

"لیجیئے، پھر سنبھلیئے — سنبھلیئے،" یہ الفاظ کہتا ہوا امجد، اسد کے گلے سے لپٹ گیا اور دونوں قہقہے لگاتے ہوئے باہر صحن میں چلے گئے۔

"دیکھا تم نے پروین، کتنے اچھے ہیں میرے بچے، کتنے زندہ دل ہیں!" ماں نے نہال ہوتے ہوئے کہا۔

پروین کو اس بات کی بہت خوشی تھی کہ کم از کم امجد نے اُسے دوبار بہن کہا تھا۔ اس کے دل کو بڑی تقویت ملی۔ امجد کا رتبہ اس کے دل میں بڑھ گیا۔

بہت دیر نہ ہوئی تھی کہ امجد واپس آ گیا اور بڑی بے تکلفی کے انداز میں پروین سے گویا ہوا۔

"پروین — تمہارے بھائی بے ڈکار کو بہت بڑی شکست دے کر آیا ہوں۔"

"بھائی بے ڈکار؟" پروین نے حیرانی سے سوال کیا۔

"ہاں، ہاں، تم نہیں جانتیں؟ — یہ بھی کمال ہے کہ ہمارے بارے میں تو آپ کو ہماری سب خرابیوں سے آگاہ کر دیا گیا اور دوسروں کے بارے میں آپ کو کچھ نہیں بتایا گیا — بہرحال یہ کام اب میں کئے دیتا ہوں — یہ جو اسد بھائی ہیں نا یہی ہیں بھائی بے ڈکار اس لئے کہ یہ دو بیویاں بغیر ڈکار لئے ہضم کر گئے ہیں اور اب تیسری کی فکر میں ہیں ان سے بچ کے رہنا۔"

"جی!" پروین کی زبان سے صرف یہ ایک لفظ نکلا اور کشیدہ کاری کا فریم اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر جا پڑا۔

اس واقعہ کے بعد وہ پھر چپ سی ہو گئی۔ اگلی صبح وہ ابھی خود پر قابو پانے کی کوشش میں ہی مصروف تھی کہ امجد نے اس سے سوال کیا "پروین، تم نے کبھی پہاڑ کی سیر کی ہے؟"

"جی — نہیں۔"

"تو پھر تم نے کچھ بھی نہیں دیکھا،" امجد نے منہ بنا کر فیصلہ دیا "عمُو کے انتقال سے تم افسردہ

ہو۔ تمہاری صحت خراب ہو رہی ہے۔ تم چُپ سی رہتی ہو۔ امی سے اجازت لے کر تم میرے ساتھ پہاڑ کی سیر کو چلو۔ میری طرح حرامخور بنو، شکار کھیلو، خوش رہو، تفکرات سے دُور بھاگو پھر دیکھو کیسی عمدہ بنتی ہے تمہاری صحت۔ یہ سب لوگ مجھ سے جلتے ہیں اسی لئے مجھے حرامخور کہتے ہیں۔ اصل میں یہ سب مجھ ایسا بننا چاہتے ہیں۔ حرامخور بننے میں بہت مزا ہے۔ سرسبز لہلہاتے کھیت، گنگناتے پہاڑی نالے، فردوسی وادیاں — ان سب سے ایسی مسرت حاصل ہوتی ہے کہ تم گھر بیٹھ کر اس کا اندازہ نہیں کرسکتیں۔ تمہاری خاموشی اور افسردگی اگر چند ہی روز میں غائب نہ ہو جائیں تو میرا نام بدل دینا — میرا مطلب ہے امجد حرامخور کی بجائے کوئی اچھا سا نام دے دینا، مثلاً امجد دانشمند یا امجد باشعور وغیرہ وغیرہ۔"

پروین کی غیر معمولی پریشانی اور خاموشی کا سبب تو دراصل وہ واقعہ تھا جو اس کے اور خضر کے درمیان پیش آچکا تھا لیکن چچی کا خیال تھا کہ عید قریب آنے کی وجہ سے اُسے باپ زیادہ یاد آرہا تھا اور اسی لئے وہ زیادہ اُداس ہو رہی تھی۔

پروین اب زندگی کے حقائق کے روبرو کھڑی تھی اور یہ تصادم رومانی خیالات کے لئے پیامِ موت تھا۔ یہ نوجوان توانا بھائی جنہیں اس نے شروع میں اپنے کھلونوں کی طرح سمجھا تھا فی الحقیقت اس کے کھلونوں کی طرح بے جان اور بے طاقت نہیں تھے بلکہ اپنی مرضی دوسروں پر حاوی کرنے کی قوت رکھتے تھے۔ غصہ آنے پر وہ کھلونوں کو اٹھا کر پھینک سکتی تھی۔ انہیں توڑ سکتی تھی۔ انہیں آتشدان پر سجا سکتی تھی پُسی کو مار مار کر گھر سے نکال سکتی تھی مگر اب صورتِ حال بالکل برعکس تھی اور وہ خود کو اس گھر کے افراد کے ہاتھوں میں کھلونا بنا پا رہی تھی، بالخصوص خضر والے واقعے نے تو اسے بہت خوفزدہ کر دیا تھا۔ شادی کے بارے میں اس نے پہلے کبھی نہ سوچا تھا لیکن اب وہ محسوس کر رہی تھی کہ ان بھائیوں میں سے ہی کوئی نہ کوئی کبھی نہ کبھی اسے یوں دبوچ بھاگے گا۔ جیسے اس کی پُسی نے اس کے طوطے کا لقمہ بنا لیا تھا...

امجد نے خود ہی امی کو اپنے ارادے سے آگاہ کر دیا "امی۔ میں پروین کو پہاڑ پر لے جاؤں گا۔ . . . سچ سچ سچ — ذرا دیکھو تو کتنی دُبلی ہو رہی ہیں یہ۔ صحت کس قدر گر گئی ہے۔ رنگت کتنی زرد ہو رہی ہے۔ آپ نے بڑی بے پروائی دکھائی امی جان! —— کاش آپ مجھے پہلے ہی اطلاع کر دیتیں تو میں کب کا آکر انہیں لے جاتا — مگر اب بھی کیا بگڑا ہے۔ میں انہیں پہاڑوں کی سیر کراؤں گا۔ پھر دیکھنا چند ہی روز میں ان میں کتنی آب و تاب آجاتی ہے — امی میں ان کو بالکل اپنے جیسا حرامخور بنا دوں گا —— ہیں —" اور وہ مسکرا کر امی کے جواب کا انتظار کرنے لگا۔

"ہاں ہاں لے جانا — مگر ابھی کوئی جلدی نہیں ہے" چند لمحوں کے توقف کے بعد امی نے جیسے ٹالنے کو کہا۔

"نہیں نہیں، میں کہیں نہیں جاؤں گی۔ میں ٹھیک ہوں — مجھے کچھ نہیں ہوا ہے۔ میں یہاں بہت آرام سے ہوں" پروین نے بے ساختہ کہا۔ کچھ دیر کو اسے یُوں محسوس ہوا جیسے امجد میں خضر کی روح حلول کر آئی ہے اور وہی اس کی زبان سے اپنا مدعا بیان کر رہی ہے اس کا چہرہ اور زرد ہو گیا۔ وہ بہت گھبرا گئی۔ اُسے وہاں بیٹھ رہنا مشکل لگا تو اپنے کمرے کی طرف بھاگ اُٹھی اور وہاں جا کر پھر تکیے میں سر دے کر رونے لگی....

چچی اور چچا دونوں کو یقین تھا کہ پروین کی یہ حالت عید کی آمد اور باپ کی جدائی کے غم کی وجہ سے ہے لیکن وہ سیدھے سادے بزرگ اس کی ذہنی حالت کا بالکل اندازہ نہ کر سکے۔ چچی سمجھتی تھیں کہ پروین خضر کی معیت میں خوش رہتی ہے اس لئے انہوں نے خضر کو پروین کی افسردگی دور کرنے پر مامور کیا لیکن وہ کسی کام کا بہانہ کر کے یہ کہہ کر غائب ہو گیا کہ اسد بھیا، اور امجد بھیا جو ہیں اور اب مجیب بھائی بھی تو آجائیں گے۔

چچا نے پروین کو بار بار روتا دیکھا تو ان کا جی بھر آیا۔ انہوں نے دستِ شفقت اس کے سر پر پھیرتے ہوئے اُسے سمجھانا شروع کیا "روؤ نہیں بیٹو بیٹی، یوں تو باپ

باپ ہی ہوتا ہے لیکن تم یہ مت سمجھنا کہ تمہارا باپ مر گیا ہے۔ میں تمہارا باپ ہوں۔ تم یوں سمجھو کہ تمہاری ماں بھی زندہ ہو گئی ہے اور تمہیں کتنے اچھے اچھے جوان بھائی مل گئے ہیں۔ تم مجھے بابا اور چچی کو امی کہا کرو۔ تم ہماری بیٹی ہو۔ تم یوں سمجھو کہ تمہارے باپ کی روح نے اپنا لباس یعنی جسم بدل لیا ہے اور اب میرے جسم میں آ گئی ہے۔ اٹھو ہنسو بولو، خوش رہو۔"

ان الفاظ کے ساتھ چچا کی اپنی آنکھیں بھی ڈبڈبا آئیں اور وہ منہ پھیر کر اپنے کمرے میں چلے گئے جہاں غالباً وہ چچی کا دامن آنکھوں سے لگا کر کچھ دیر روتے رہے کیونکہ جب وہ باہر نکلے تو ان کی آنکھیں اور چہرہ سرخ ہو رہے تھے اور چچی کا دامن بھیگا ہوا تھا اور وہ اداس سی نظر آ رہی تھیں۔ پھر چچی نے پروین کو سمجھانا شروع کیا۔ پروین سوچنے لگی شاید یہ دونوں بزرگ ٹھیک ہی کہہ رہے ہوں اور اس کی اداسی کا سبب صرف باپ سے جدائی ہی ہو اور دوسرے واقعات محض بہانہ بنے ہوں۔ مگر یہ دوسرے واقعات کچھ اتنے سنگین تھے کہ اس کا ذہن یہ دلیل قبول نہ کر سکا۔

اگرچہ بھائی کی موت کی وجہ سے یہ عید عید نہ تھی پھر بھی چچا کا حکم تھا کہ سب بچے عید پر گھر میں جمع ضرور ہوں گے۔ وہ جو کسی نے کہا ہے کہ اک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق، ٹھیک ہی تو کہا ہے۔ ان بیٹوں کی آمد سے گھر میں بہت رونق آ گئی تھی۔ لیکن جب عید سے دو روز قبل کپتان مجیب بھی آ گئے تو گھر میں اس وقت وہ شور مچا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ سب لوگ خوشی سے شور مچا رہے تھے۔ پروین کے ذہن میں خیال کی ایک لہر آئی کہ خوشی کے اظہار کے لئے شور مچانا ضروری ہے۔ اس کا جی چاہا کہ وہ ایک لرزہ خیز قسم کا قہقہہ لگائے مگر فوراً اسے خیال آیا کہ یہ تو دیوانگی کا عمل ہو گا اور وہ اپنے ارادے سے باز رہی۔

وہ سوچنے لگی "کہیں میں واقعی پاگل تو نہیں ہو گئی جو ان سب لوگوں کی باتیں مجھے عجیب

معلوم ہو رہی ہیں۔ یا کہیں ایسا تو نہیں کہ میری تنہائی کی زندگی اور تربیت نے مجھے غلط احساسات خیالات کا شکار بنا دیا ہے۔ میں پاگل تو ہرگز نہیں ہوں۔ میں ٹھیک ہوں۔ یہ میرے ہاتھ ہیں، یہ پاؤں ہیں۔ میں چیزوں میں تمیز کر سکتی ہوں۔ سوچ سکتی ہوں، ابھی ابھی میں نے اپنا قہقہہ دبا کر فرزانگی کا ثبوت دیا ہے۔ پاگل انسان خود پر قابو کب پا سکتا ہے۔ تو پھر میرے خیالات ہی غلط ہیں۔ اسی لئے میں پریشان ہوں ———

——— لیکن مجھے اس بات کا بھی تو یقین نہیں ہے ——— اگر یہی حالت کچھ دیر اور قائم رہی تو پھر میں ضرور پاگل ہو جاؤں گی۔ ——— لیکن ——— لیکن ———

——— لیکن ایسا نہیں ہونا چاہئے ——— میں خود کو سنبھالتی ہوں ——— اب میں خوش رہنے کی کوشش کروں گی ———" اور یہ کہہ کر وہ مسکراتی ہوئی آئینے کے سامنے جا رکی۔ اس نے محسوس کیا جیسے اس کی مسکراہٹ بھی اس کا تمسخر اڑا رہی ہو۔

یہ صحن کا شور تھا جو پروین کو کمرے سے باہر کھینچ لایا تھا۔ اس کے سامنے صحن کے دروازے کے قریب بڑے کمرے والی ایک تصویر بہت بڑی ہو کر کھڑی تھی اور وہ بے ہنگم قہقہے لگا رہی تھی۔ یہ ایک بُل ڈاگ تھا جو بڑے سائز کے دو السیشن کتوں کی زنجیریں تھامے کھڑا تھا۔ کتے آگے کو زور مار رہے تھے اور زنجیریں لوہے کی سلاخوں کی طرح تنی ہوئی تھیں۔ امجد ٹین کا ایک ڈھول بنا کر فوجی انداز سے پیٹ رہا تھا اور اسد دونوں ہاتھوں کا بگل بنا کر منہ سے بجا رہا تھا اذ پیپ پیپ ——— پیپ پیپ ——— کی آوازیں لگاتار پیدا کر رہا تھا۔ کچھ دیر تو پروین کو محسوس ہوا جیسے واقعی کوئی فوجی دستہ صحن میں آ اترا ہے۔۔۔ کپتان صاحب اوپر کے ہونٹ پر موٹی موٹی مونچھیں سنبھالے شور انگیز قہقہے لگا رہے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ مونچھیں اب گریں اور اب گریں پروین یہ فیصلہ نہ کر سکی کہ اگر وہ مونچھیں گر گئیں تو وہ آگے بڑھ کر انہیں زمین سے اٹھا کر بڑے بھائی کے سپرد کرے یا نہیں۔

"ہاہاہا — ہوہوہو — ہوہو — دھم دھما دھم — پیپ پیپ — دھال دھال — دھال دھال" کے شور میں چچی نے پروین کا ہاتھ تھاما اور مجیب کے پاس لے جاکر اس کا تعارف کروادیا۔

"پروین! ہاہاہا — او — پروین — ہوہوہو — ہاہاہا — گھڑگھڑ بھابھابھا —" پروین حیران تھی کہ یہ کس قسم کے قہقہے ہیں۔ کیا فوجی ایسے ہی قہقہے لگاتے ہیں اور پھر ایک گلے سے اتنی متعدد آوازیں، اتنے متعدد قہقہے کیونکر نکل سکتے ہیں — اچانک کپتان صاحب نے ہاتھ بڑھا کر پروین سے وہ زوردار مصافحہ کیا کہ وہ لرز کر رہ گئی۔ ساتھ ہی السیشی کتوں نے بھی خوشی سے دیوانہ وار قہقہے لگانے شروع کر دیئے۔ وہ ایسی گھبرائی کہ چیخ کر چچی کے پیچھے جا چھپی۔

"ہاہاہا — ہمارے کتوں سے ڈرتی ہے — ہوہوہو — گھڑگھڑ بھابھابھا — تم کیا لڑکی ہے — یہ کاٹتا نئیں — ایں — دیکھو ٹائگر، ہیلو لیپرڈ — یہ پروین بھی تمارا مالک ہے — ایں — ویل — تم ان سے ٹھیک بی ہیو (BEHAVE) کرنا — ایں TEASE نئیں کرنا — ایں — ہاہاہا — ہوہوہو — بھب بھب بھب — لو ان سے ہاتھ ملاؤ — ایں — دوستی کرو — او ڈرتی ہے — ہاہاہا — ہوہوہو — بھب بھب بھب — گھڑگھڑگھڑ"

کپتان صاحب نے کتوں کی زنجیریں کھول دیں۔ پروین اور زیادہ چچی کے قریب ہوگئی۔ کتوں نے سب کے پاؤں سونگھنا شروع کیئے۔ اسد کا ڈھول اور امجد کا بگل برابر فوجی انداز میں بج رہے تھے۔ آخر کپتان بھائی آئے تھے۔ کوئی مذاق نہ تھا شایان شان استقبال ضروری تھا۔

چچی اپنی جگہ حیران تھیں اور خوش بھی "او مجو کے بچے، سنبھال اپنے کتوں کو" انہوں نے پیار بھرے غصے سے کہا۔ "ارے پکڑ انہیں۔ پریشان کیئے دے رہے ہیں بے چاری پروین کو۔"

مجو کے بچے پر کوئی اثر نہ ہوا البتہ کتے خود ہی زمین سونگھتے اندر کمروں کی جانب چل دیے اور پروین نے ایک بار آرام کا سانس لیا۔ مگر یہ سانس ابھی پورا بھی نہ ہوا تھا کہ کپتان نے ایک زوردار ہاتھ اس کے کندھے پر مارتے ہوئے کہا "او تم ڈرو نئیں ہمارے کتے صرف دشمن کو کاٹتے ہیں — ایک بار اُور ملٹری میں ایک ENEMY سے DIFFERENCE ہوا — اینڈ دی فاٹ AND WE FOUGHT ہمارے دوست کتے سات تے — اُنوں نے FRONT سے وہ ATTACK مارا کہ ENEMY کو HOSPITAL جانا پڑا — مگر یہ دوست کو کچھ نئیں بولتا — اُور ملٹری میں عورت لوگ کتے سے نئیں ڈرتا۔ تم چل کر دیکھو — وہ ان سے EMBRACE کرتا پیار کرتا — اور فوج میں تمارا FEAR ختم ہو جائے گا — ایں — ہاہاہا — ہوہوہو — بھڑبھڑبھڑ —"

پروین کو یوں لگا جیسے وہ کسی پاگل خانے میں کھڑی ہو جہاں ہر پاگل اپنی ڈفلی بجا رہا ہے تاکہ نو وارد بھی ان جیسا پاگل ہو جائے۔

عین اس وقت ڈولی کے چلانے کی آواز آئی جسے سنتے ہی پروین بے قرار ہو کر اپنے کمرے کی طرف بھاگی۔ برآمدے کے سرے پر ہی وہ رک گئی۔ دونوں السیشی کتے ڈولی کے درپے تھے اور وہ بے چاری دم پچھلی ٹانگوں میں دبائے حیران گوشۂ عافیت کی تلاش میں سرگرداں تھی

"انہیں روکیئے — میری ڈولی — یہ اُسے مار ڈالیں گے — چچی جان انہیں روکیئے،" پروین نے خوفزدہ ہو کر کہا۔

"ہوہوہو — THEY WILL NOT HARM HER — ہاہاہا — DONT FEAR وہ تو دوستی کرتا ہے — LOVE کرتا ہے — دیکا فوجی کتنی جلدی دوستی کرتا ہے

اور تم ڈرتا ہے ——— ایں ——— ہاہاہا ——— ہوہوہو ——— بھب بھب بھب" اور کپتان، سراسیمہ پروین کو، معنی خیز نظروں سے دیکھنے لگا۔

اچانک ڈولی جان کی امان کی تلاش میں بھاگتی ہوئی باہر کے دروازے کے قریب پہنچی تو پروین نے آگے بڑھ کر فوراً دروازہ ایک لمحے کے لئے کھول دیا۔ ڈولی سیدھی باہر نکل گئی۔ دروازہ بند ہوگیا اور عجیب کے کتے اپنے پنجوں سے دروازے کو نوچنے لگے۔ اب کپتان صاحب نے اپنی امی کی چیخ و پکار پر دھیان دیا اور کتوں کو دوبارہ زنجیروں میں باندھ دیا گیا۔ اور جب تک کپتان اپنے کمرے میں داخل نہیں ہوگیا اسد اور امجد کا فوجی بینڈ برابر مصروفِ کار رہا۔

پروین بھی اپنے کمرے میں جا بیٹھی۔ وہ بہت تھکی تھکی سی ہو رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی طوفان آیا تھا جو گذر گیا۔ وہ خواب کی سی کیفیت میں آنکھیں موندے بڑی دیر تک بیٹھی رہی۔

نہا دھو کر کپتان صاحب مع اپنی امی کے برآمدے میں آ بیٹھے اور نیم غنودگی کی حالت میں پروین نے ان کی گفتگو کا ایک حصہ سنا۔

"مجّو بیٹا" پروین کی چچی کہہ رہی تھیں "تم کتنے بھی بڑے ہو جاؤ، کپتانوں کے بھی کپتان بن جاؤ، میرے لئے تو بچے ہی رہو گے۔ پچھلے سال بھی تم نے وعدہ کیا تھا کہ شادی کر لو گے۔ مگر ٹال گئے اور ایک اتنی اچھی لڑکی ہاتھ سے جاتی رہی۔ جب تک بڑے بھائی کی شادی نہ ہو جائے چھوٹے سمجھتے ہیں کہ انہیں ابھی شادی کرنے کا کوئی حق نہیں۔ اسد تو خیر بے شرم ہے، اپنی مرضی کرتا ہے۔ تمہاری عمر بھی بڑھتی جا رہی ہے، اب میں تمہارا کوئی اعتراض نہیں سنوں گی۔ تم اتنے بڑے افسر ہو، جس لڑکی کی طرف اشارہ کرو گے تمہاری ہو جائے گی ——— اور اب تمہارے اپنے گھر میں ایک چاند اُترا ہے، میں تو کہتی ہوں تم اس چاند کو اپنا لو ——— دیکھو پروین کتنی اچھی لڑکی ہے، میں نے اس سے

اچھی لڑکی اب تک نہیں دیکھی۔ تمہارا بیاہ ہو جائے تو پھر چھوٹے میرے سامنے نہیں بول سکیں گے۔"

"ڈیل ممی ——— ہم نے سوچ لیا ——— بلکہ ——— بلکہ فیصلہ کر لیا ——— پروین ہم کو بہت FINE لگی ——— بہت سویٹ ——— ہاہاہا ——— ہوہوہو ———"

"جیتے رہو بیٹا، تم نے جی خوش کر دیا" یہ الفاظ چچی کے تھے۔ اس کے بعد شاید اس نے بیٹے کی بلائیں لی ہوں گی۔ لیکن پروین اور کچھ نہ سن سکی۔ اس کا دل ڈوبتا رہا اور وہ یہ جاننے کی کوشش کرتی رہی کہ کیا ہونے والا ہے اور اسے کیا کرنا چاہیئے لیکن وہ کسی نتیجہ پر نہ پہنچ سکی۔ وہ چاہتی تھی کہ اس گھر سے بھاگ جائے مگر اسے یوں لگا جیسے اب ایک بُل ڈاگ دروازے پر پہرہ دے رہا ہے اور وہ کہیں نہیں جا سکتی۔

یہ واقعات صبح کے تھے۔ ڈولی دوپہر تک واپس نہ آئی۔ پروین سخت فکرمند تھی۔ چچی اپنے بیٹوں کے ساتھ اس قدر مصروف تھیں کہ کسی کو بھی ڈولی کا خیال نہ آیا۔ پروین بار بار کھڑکی سے باہر دیکھتی رہی مگر دیر تک ڈولی کی صورت نظر نہ آئی اور جب اچانک وہ نظر آئی تو پروین کا غم اور بڑھ گیا۔ پروین نے دیکھا کہ ڈولی بھاگی آ رہی ہے اور کئی آوارہ کتے اس کا تعاقب کر رہے ہیں۔ وہ گھر کے قریب آئی مگر اس سے قبل کہ پروین نیچے جا کر دروازہ کھول سکے آوارہ کتے اس کے سر پر آ موجود ہوئے اور وہ پھر کسی جانب بھاگ نکلی۔

پروین نے خادمہ کو یہ منظر دکھایا اور اسے حکم دیا کہ ملازم اور مالی کے ذریعے ڈولی کو تلاش کروا کر گھر لے آئے۔ خادمہ "اچھا جی" کہہ کر معنی خیز انداز سے مسکراتی ہوئی چلی گئی

تلاش کے باوجود ڈولی نہیں مل سکی۔

پھر شام ہو گئی۔ مگر ڈولی گھر نہیں آئی۔

چچا بھی اب گھر آ گئے تھے۔ پروین کی پریشانی کو دیکھ کر اب سب کو تشویش ہوئی کپتان صاحب کا خیال تھا کہ ڈولی گم نہیں ہو سکتی۔ ضرور واپس آ جائے گی۔

آج پروین کو پاپا اس قدر یاد آئے کہ وہ زار زار رونے لگی۔ ڈولی ان کی یادگار تھی وہ پاپا کا آخری تحفہ تھی۔ ان کا دیا ہوا آخری کھلونا تھی، زندہ جیتا جاگتا کھلونا۔ اور جب اس نے شام کے کھانے میں شرکت سے انکار کیا تو چچی نے پہلے تو پیار سے سمجھایا اور پھر غصے سے کہا "توبہ، کوئی جانوروں سے بھی ایسا پیار کرتا ہے کہ ان کی خاطر بزرگوں، بھائیوں اور کھانے اور ہر چیز سے روٹھ کر رونے لگے!"

یہ بات ایک تلوار تھی جو پروین کے دل کو کاٹتی ہوئی گذر گئی۔ اس کی سسکیاں تیز تر ہوگئیں اور آنکھوں کی جلن بڑھ گئی۔

کھانا بڑھا دیا گیا۔ سب لوگ اپنی اپنی خوابگاہوں کو چلے گئے آخر پروین کو بھی نیند آ گئی ــــ

غم نے نیند میں بھی اس کا پیچھا نہ چھوڑا۔ اس نے خواب میں بھی ڈولی کو دیکھا۔ وہ خود کھڑکی کے سامنے کھڑی تھی۔ ڈولی تیزی سے کمرے کی سمت بھاگی آ رہی تھی مگر کئی تیز رفتار کتے اس کا تعاقب کر رہے تھے۔ شاید یہ وہی منظر تھا جو اس نے دن میں ایک بار دیکھا تھا اور جواب خواب بن کر سامنے آ گیا تھا ــــ ڈولی اور کتوں کا گروہ گھر کے قریب ہوتے جا رہے تھے وہ خوش تھی کہ اب ڈولی گھر آ جائے گی۔ وہ اور قریب آ گئی اور جب وہ بہت قریب آ گئی تو پروین نے غور سے دیکھا کہ وہ ڈولی نہیں تھی ــــ اس کی صورت تو بالکل بدل چکی تھی ــــ وہ تو ــــ وہ تو وہ خود تھی ــــ پروین یہ دیکھ کر بڑی حیران ہوئی کہ وہ تو وہ خود تھی جو گھر کی جانب بھاگی آ رہی تھی ــــ اس نے اپنی پیشانی پر ہاتھ رکھا۔ پیشانی پسینے سے بھیگ رہی تھی ــــ شاید بھاگ بھاگ کر یہ حالت ہوگئی تھی۔ اس نے محسوس کیا کہ یہ واقعی وہ خود تھی جو کسی گوشۂ عافیت کی تلاش میں سرگرداں تھی۔ اس کا جی چاہا کہ اُسے دروازہ کھلا مل جائے مگر وہ تو بند تھا اور کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ باہر دروازے کے قریب موجود ہے۔ اس نے دروازے کے قریب

ہو کر گھوم کر دیکھا۔ کپتان عجیب کے دونوں السیشی کتے اس کا پیچھا کر رہے تھے مگر ان کے علاوہ کچھ اور کتے بھی تھے وہ ان کتوں سے بہت خوفزدہ تھی۔ چنانچہ اور تیز بھاگنے لگی۔ کتوں کی رفتار بھی تیز ہوگئی اور وہ اس کے قریب آ گئے۔ اس نے پھر گھوم کر دیکھا۔ تعاقب کرنے والوں میں ایک بل ڈاگ بھی تھا۔ غور سے دیکھنے پر اُسے معلوم ہوا کہ یہ کپتان عجیب خود تھے۔ دوسرے تعاقب کرنے والوں کے چہرے بھی اُسے شناسا معلوم ہوئے ــــ اس نے دماغ پر زور دیا ــــ یہ تو ــــ یہ تو اسد اور خضر اور امجد تھے۔

پھر وہ سب اتنا قریب آ گئے، گویا حملہ کر دیں گے۔

(۲)

چیخ کی آواز سُن کر ساتھ والے کمرے سے چچی اور خادمہ بھاگی آئیں۔ پروین کا جسم پسینے میں تر تھا اور وہ بُری طرح کانپ اور ہانپ رہی تھی، جیسے نامعلوم کتنی دور سے بھاگی چلی آ رہی ہو۔ چچی نے اُسے سر سے پاؤں تک اپنے ہاتھوں سے ٹٹولتے ہوئے پریشانی کے ساتھ پوچھا "کیا ہوا بیٹی؟ کیا بات ہے؟ پروین بیٹی خیر تو ہے؟ کیا خواب میں ڈر گئی ہو؟"

"جی ــــ جی ــــ وہ ــــ وہ ــــ" پروین نے کانپتی ہوئی آواز میں صرف اتنا کہا۔

"وہ؟ وہ کیا بیٹی؟" چچی نے پیار سے پوچھا۔

"وہ ــــ وہ ــــ کتے ــــ کتے" پروین نے یوں ڈرتے ہوئے کہا جیسے کوئی گالی دے رہی ہو۔

△


ہم نشینی
کا
عذاب

دروازے سے کمرے میں داخل ہو کر جب میں دروازہ بند کرتا ہوں تو دل ہی دل میں کہتا ہوں:

" اے دروازے، میرے محسن، میں تیرا ممنون ہوں"۔

کمرے کی ایک کھڑکی ہے اور ایک دروازہ۔ میں دروازے سے ڈرتا ہوں اور کھڑکی پر جان دیتا ہوں۔ شروع میں میں بالکل نہیں جانتا تھا کہ ایسا کیوں ہے لیکن اب جان گیا ہوں مجھے اس علم سے فائدہ ہوا ہے یا نقصان، میں طے نہیں کر سکتا۔ ہاں کبھی کبھی دل کہتا ہے کہ میں اس علم سے بے بہرہ رہتا تو اچھا تھا۔ مجھے یہ علم اسد اور آصف کی تنقید سے حاصل ہوا ہے۔ میرے یہ دوست میری بھلائی کے خواہاں ہیں۔ اس لئے اس علم کو میرے لئے باعثِ سکون ہونا چاہیئے تھا۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ ہاں اب مجھے یہ معلوم ہو گیا ہے کہ کمرے میں آکر میں یہ کیوں محسوس کرتا ہوں کہ بچہ ماں کی گود میں آدبکا ہے۔ یا چوزہ مرغی کے پروں میں چھپ گیا۔

دروازہ مجھے کمرے سے باہر جانے پر مجبور کرتا ہے۔ اس لئے میں دروازے کے لئے احساسِ ممنونیت رکھنے کے باوجود اس سے خوفزدہ رہتا ہوں لیکن کھڑکی کے لئے میں متضاد احساسات

نہیں رکھتا، اس سے تو میں صرف محبت کرتا ہوں۔

اسد کہتا ہے کہ میں کم حوصلہ ہوں اور زندگی سے کٹا ہُوا ہوں اس لئے الگ تھلگ رہتا ہوں مگر یہ کیوں ہے کہ میرے کمرے میں آکر مجھے اپنا رشتہ باہر کی دنیا سے استوار معلوم ہوتا ہے مجھے تو اس رشتے کا احساس ہی کمرے میں داخل ہونے کے بعد ہوتا ہے۔ میں باہر کی دنیا کو صرف اسی وقت دیکھ سکتا ہوں جب میں اپنے کمرے میں ہوتا ہوں اور جب میں کمرے سے باہر ہوتا ہوں تو سہما سہما صرف اپنے بارے میں خوف کی سوچ سوچتا رہتا ہوں۔ کمرے سے باہر یوں لگتا ہے جیسے بیرونی دنیا کا دباؤ مجھے اپنے ہی اندر دھکیل دیتا ہے اور کمرے میں آکر میں آزاد ہو جاتا ہوں۔

دروازہ عرفِ عام میں بابِ آزادی کہلاتا ہے لیکن میں دروازے سے ڈرتا ہوں اور باہر کی دنیا سے بھاگ کر اپنے کمرے میں آجاتا ہوں۔ تو کیا میں آزادی سے ڈرتا ہوں؟ میں تو مسلسل آزادی کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہوں اور باہر سے اندر کی طرف آزادی کی تلاش میں ہی رجوع کرتا ہوں۔ جب میں اپنے اردگرد گھٹن محسوس کرتا ہوں تو اپنے اندر چھپ کر بیٹھ جاتا ہوں اور خود کو آزاد محسوس کرنے لگتا ہوں۔ اسد کمرے کو قید خانے سے تشبیہ دیتا ہے اور باہر کی آزاد فضاؤں کا عاشق ہے لیکن میرے لئے باہر کی دنیا کے ضابطے اور پابندیوں کے جال اور افراتفریوں کا عالم وجہِ آزار ہیں۔ میں تو بالکل آزاد رہنا چاہتا ہوں اور اسی لئے عشق تک کا قائل نہیں ہوں کیونکہ جیسا کہ کسی نے کہا ہے عشق اپنی بقا کے لئے متعلقہ فرد کی آزادی کو اپنی خوراک بناتا ہے اور زندہ رہتا ہے۔ اسد میرا دوست ہے۔ ہماری دوستی کی بنیاد مشترک خصوصیات پر نہیں بلکہ متضاد عادات پر ہے وہ زیادہ وقت گھر سے باہر گزارتا ہے میں گھر کے اندر گزارتا ہوں۔ ہم تمام تضادات اور اختلافات کے باوجود دوست ہیں اور یہ دوستی اس وقت تک قائم رہے گی جب تک ہماری طبیعتوں میں تضاد قائم ہے۔ اسے سینما دیکھنا، ٹینس کھیلنا، سیر کرنا اور دوسری ایسی ہی دلچسپیوں میں مصروف رہنا پسند ہے جبکہ میں اس کی ہنگامہ پسند طبیعت سے بھی بیزار ہوں ہوں۔ مجھے تنہائی پسند ہے

اور میں شطرنج کھیلتا ہوں۔ جب وہ آدھی رات کو صرف سونے کے لئے گھر آتا ہے تو میں اس کی آمد پر خوش ہوتا ہوں اور جب وہ دفتر سے واپس آکر فوراً ہی ٹینس کھیلنے چلا جاتا ہے تو مجھے اور زیادہ خوشی ہوتی ہے۔ اگر وہ میری ہی طرح ہر وقت کمرے میں رہنے لگے تو میرے لئے ناقابلِ برداشت ہو جائے۔ اس کی تنقید سے پہلے میں اپنے آپ میں مگن رہتا تھا لیکن اب اس نے مجھے میری اپنی دریافت پر مامور کر دیا ہے اور اب دوسری مجبوریوں میں ایک مجبوری یہ بھی ہے کہ میں بیٹھا خود کو تلاش کرتا رہوں۔ " لیکن کیا میں واقعی گم ہو گیا ہوں؟ اور کیا فرد خود کو دریافت کر سکتا ہے؟"

"آنکھوں والو! میں گم ہو گیا ہوں۔ کیا تم نے مجھے کہیں دیکھا ہے؟ میں اپنی تلاش میں نکلا ہوں، میری مدد کرو۔" یہ باتیں بہت مضحکہ خیز معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن میں نے ایسی باتیں کی ہیں۔ اپنی گمشدگی کا احساس مجھے گھر سے باہر رہ کر ہی ہوتا ہے۔ کمرے میں یہ احساس نہیں ہوتا۔ کمرے میں بیٹھے ہوئے تو یوں محسوس کرتا ہوں کہ میں نے خود کو ہی نہیں ساری دنیا کو پا لیا ہے یہ کمرہ جیسے کسی روح کا ہاتھ ہے جو مجھے اشیاء کے ڈھیر سے جس میں میں گم ہو جاتا ہوں ڈھونڈ نکالتا ہے۔

میرا یہ کمرہ اوپر کی منزل میں ہے نیچے دکانیں ہیں۔ یہ مختصر سی عمارت سڑک کے عین کنارے پر واقع ہے۔ پختہ سڑک کا یہ آخری سرا ہے۔ دائیں جانب یہ سڑک شہر کو جاتی ہے۔ لیکن آگے بائیں جانب اور سامنے کھیت ہی کھیت ہیں۔ ہاں سامنے دائیں ہاتھ چھدری سی آبادی ہے کھڑکی سے یہ سارا منظر اچھی طرح دکھائی دیتا ہے۔ باہر کی دنیا کی وہ وسعتیں ہنگامے اور تبدیلیاں جو گھر سے باہر میرے لئے باعث عذاب ہیں کھڑکی سے بڑی دلکش معلوم ہوتی ہیں اور باہر کی دنیا بڑی متنوع نظر آتی ہے۔ کھڑکی میں ہر وقت کوئی نہ کوئی دلکش تصویر آویزاں دکھائی دیتی ہے۔ یہ کھڑکی آزادی اور مسرت کی دنیا کا صدر دروازہ ہے۔ بادل کا ایک ٹکڑا بھی سامنے سے گزرتا ہے تو مجھ سے سرگوشی کر کے جاتا ہے۔ میں اس روزن سے موسموں کی آوازیں سنتا ہوں اور ان کے رنگ

دیکھتا ہوں۔ یہ کھڑکی ایک اسٹیج ہے۔ یا پھر سینما کا پردہ جس پر ہر وقت زندگی کا کوئی نہ کوئی کھیل کوئی نہ کوئی ڈرامہ ہوتا رہتا ہے۔ اسد کو ان میں سے کوئی چیز بھی نظر نہیں آتی۔ "مجھے یقین ہے تم غلطی پر ہو بلکہ تمہارے دماغ میں کچھ خرابی پیدا ہو گئی ہے ——" وہ مجھے کہتا ہے۔ میں اس لئے چپ رہتا ہوں کہ میرے پاس یقین کی وہ دولت نہیں جو اس کو میسر ہے۔ عین ممکن ہے اس کی رائے درست ہی ہو۔ وہ کہتا ہے، میں زندگی میں ڈوبنے کا حوصلہ نہیں رکھتا۔ اور زندگی کو محسوس کرنے اور جاننے کے لئے اس میں ڈوبنا ضروری ہے۔ وہ کہتا ہے میں زندگی کو نظر انداز کر کے زندگی کا عکس دیکھتا ہوں۔ مجھے شئے نہیں شئے کا تصور عزیز ہے۔ لیکن سمندر یا دریا کا نظارہ اس میں ڈوب کر تو نہیں ہو سکتا!

کیا میں واقعی زندگی سے کٹ گیا ہوں؟ کیا انسان جیتے جی زندگی سے کٹ سکتا ہے کیا ایسا نہیں ہے کہ جو کچھ بھی ہے اور جس صورت میں بھی ہے وہ سب زندہ ہے اور زندگی سے مربوط ہے؟

زندگی کے سمندر کے سامنے میں ایک قطرہ ہوں اور اگر دنیا صحرا ہے تو میں ایک ذرۂ ریگ ہوں۔ میں قطرے کو سمندر سے اور ذرے کو ریگستان سے الگ رکھنا چاہتا ہوں کیونکہ جب تک قطرہ سمندر سے اور ذرہ ریگستان سے الگ ہے اس کی اپنی ہستی کا طلسم قائم ہے۔ سمندر قطرے کو کھا جاتا ہے اور صحرا ذرے کو۔ یہ صورت حال احساس کے لئے عذاب کی صورتحال ہے اسی لئے میں اس صورتحال سے ڈرتا ہوں۔ لیکن ڈرتا تو میں اسد سے بھی ہوں۔ اسد میں ہجوم کی تمام خصوصیات موجود ہیں۔ اس میں اتنی قوت ہے کہ اگر میں اسے اپنے بہت زیادہ قریب آنے دوں تو وہ مجھے کھا جائے گا جیسے سمندر قطرے کو کھا جاتا ہے۔ میں نہیں جانتا ایسا کیوں ہوتا ہے لیکن میں مرنا نہیں چاہتا۔ میں مٹنا نہیں چاہتا۔ میں ہونے کا احساس رکھتا ہوں اور میں اس احساس کو قائم رکھنا چاہتا ہوں۔ میرے لئے کائنات کا وجود اپنے وجود سے ہے میں نہیں ہوں تو کچھ نہیں ہے۔ باوجود اس حقیقت کے کہ قطرہ ختم ہو جاتا ہے اور سمندر قائم رہتا

ہے۔ اور پھر جو قطرہ نکلتا ہے وہ پہلا قطرہ کبھی نہیں ہوتا —— کبھی نہیں!

میں ایک عجیب اور پیچیدہ صورت حال کا اسیر ضرور ہوں لیکن یہ اسیری ہی میری بقا کی ضامن ہے۔ مچھلی پانی میں اسیر ہے۔ لیکن یہ اسیری ہی اس کی زندگی ہے اس لئے مجھے اپنی صورتحال کا دکھ نہیں ہے —— میں ایک چھوٹی سی مچھلی ہوں اور یہ کمرہ میرا بحر اوقیانوس ہے۔

ہونے اور نہ ہونے کا مسئلہ مجھے پہلے پریشان نہیں کرتا تھا لیکن اب کرتا ہے شئے بھی نظر آتی ہے اور عکس بھی۔ شئے بھی ہے اور عکس بھی ہے لیکن یہ روشنی کا کھیل ہے۔ اندھیرے میں شئے قائم رہتی ہے اور عکس مٹ جاتا ہے لیکن یہ کیا احساس ہے جو بتاتا ہے کہ شئے میرے وجود سے باہر قائم رہتی ہے جبکہ عکس میرے وجود کے اندر قائم رہتا ہے اور پھر شئے مٹ جاتی ہے لیکن عکس قائم رہتا ہے۔ وہ کبھی نہیں مٹتا۔ اگر عکس خواب کی طرح ہے تو یہ بھی یقین سے کیسے کہا جا سکتا ہے کہ شئے بھی عکس نہیں ہے یا خواب نہیں ہے؟ شاید میری زندگی بھی ایک خواب ہے۔ میں کوئی خواب ہی دیکھ رہا ہوں، طویل اور مسلسل اور جو کچھ دیکھ رہا ہوں وہ اشیا نہیں بلکہ اشیا کے عکس، علامتیں اور اشارے ہیں۔ یا شاید خواب میں نہیں دیکھ رہا ہوں، اسد دیکھ رہا ہے، آصف دیکھ رہا ہے یا کوئی اور چوتھی ہستی یہ خواب دیکھ رہی ہے اور یہ ہستی چوتھی نہیں بلکہ پہلی ہے اور ہم سب اس ہستی کے خواب کے بہت سے کرداروں میں سے چند کردار ہیں۔

میری زبان سے اس قسم کی باتیں سن کر اسد مجھے یوں دیکھتا ہے۔ جیسے کوئی غبی شاگرد اپنے فلسفی استاد کو دیکھتا ہے۔ وہ مجھے کنوئیں کا مینڈک کہتا ہے۔ میں احتجاج کرتا ہوں تو وہ مجھے بتاتا ہے کہ کنوئیں کا مینڈک نہیں جانتا کہ وہ کنوئیں کا مینڈک ہے اور مجھے یہ دلیل خاصی وزنی معلوم ہوتی ہے۔ وہ مجھے یہ بھی سمجھاتا ہے کہ گاؤں کے گندے جوہڑ کی چھوٹی چھوٹی مچھلیاں سمجھتی ہیں کہ جوہڑ ہی ساری دنیا ہے۔ سامنے سبزے کا سمندر لہراتا ہے تو میں نہ صرف سوچتا بلکہ بعض اوقات اسد یا آصف سے پوچھتا ہوں ——

اسد کہتا ہے "تم نہیں ڈوب سکتے تم ڈوبنے کا حوصلہ نہیں رکھتے" اصل میں وہ میری بات نہیں سمجھتا۔ میں تو یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اسے دیکھنا ہی بہتر ہے۔ اسے دیکھنے کو ڈوبنا کہہ لیں تو ٹھیک ہے لیکن وہ ڈوبنے کے یہ معنی نہیں لیتا۔

اور سامنے ایک مکان کے صحن میں جو سنہری رنگت والی ایک جوان لڑکی کام کرتی نظر آتی ہے وہ اسد کو کیوں اچھی نہیں لگتی اور مجھے کیوں اچھی لگتی ہے۔ میں اس میں بہت دلچسپی لیتا ہوں اسے دیکھ کر خوش ہوتا ہوں پھر اسد کیوں کہتا ہے کہ میں زندگی سے کٹا ہوا ہوں؟

یہ لڑکی کون ہے؟ اس کا کیا نام ہے؟ میں یہ نہیں جانتا اور نہ مجھے یہ جاننے کی ضرورت ہے۔ میں اسے دیکھتا ہوں اور دیکھنے کے لئے نام جاننے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ سونے کی طرح دمکتی ہے اس لئے میں اسے سونا کہنے لگا ہوں۔

اسد اور آصف کہتے ہیں کہ میں اس سے عشق کرتا ہوں۔

لیکن یہ غلط ہے۔ میں اس سے عشق نہیں کرتا۔ میں کسی سے عشق نہیں کر سکتا۔ میں آزاد رہنا رہنا چاہتا ہوں، زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ عشق میں مکمل غلامی ہے اور مکمل موت ہے۔ عشق میں امر ہونے والی باتیں سب رومانی جھوٹ ہیں عشق تو آگ ہے اور عشق کرنے والا اس میں جل کر ختم ہو جاتا ہے۔ باقی نہیں رہتا۔ نہ ہونے یا باقی نہ رہنے کا احساس کرب انگیز ہے۔ ہوتے ہوئے نہ ہونے کا احساس کیونکر دل میں جگہ پا سکتا ہے! لیکن میں بارہا اس صورت حال کا اسیر بھی ہوا ہوں۔

سونا بہت توانا اور صحت مند ہے۔ وہ گھر کے سب کام کرتی ہے۔ گائیں بھینسیں اس کے دم سے زندہ و سلامت ہیں۔ وہ کپڑے دھوتی ہے۔ صحن کی صفائی کرتی ہے اور بڑی بڑی بدوضع چارپائیوں کو دھوپ میں ڈال کر ایک وزنی لٹھ سے خوب پیٹتی ہے اور ہنستی جاتی ہے دھوپ میں اس کے جسم کے عریاں حصے سونے کی طرح دمکتے ہیں۔ اسے دیکھ کر مجھے ایک مشہور انگریزی

فلم میکناز گولڈ (MACCANA'S GOLD) یاد آجاتی ہے جس میں دہکتا سونا دور سے لوگوں کو کھینچتا ہے اور لوگ ایک دوسرے کے دوست بن کر اس کی طرف بڑھتے ہیں لیکن اس کا قرب ان سب کی تباہی کا باعث بن جاتا ہے۔ آصف اس لڑکی کی صحت کا مداح ہے۔ لیکن اسد کچھ نہیں کہتا صرف مسکراتا ہے اور یہ مسکراہٹ مجھے بے معنی سی مضحکہ خیز سی بے موقع سی معلوم ہوتی ہے۔

ایک رات سونا میرے خواب میں آئی۔ وہ تنہا نہیں تھی۔ اس کے ساتھ اس کا وزنی لٹھ بھی تھا اور صبح کو میں یہ سوچتا ہوا بیدار ہوا کہ کیا خواب یا کسی کے خواب کا کوئی کردار بھی خواب دیکھ سکتا ہے۔

اسد اور آصف مجھ پر بہت ہنسے اور کہتے رہے کہ عشق میں تیزی آرہی ہے۔

ایک روز بارش ہوئی تھی سونا کے گھر کا صحن کیچڑ سے بھر گیا تھا۔ ایک گائے کچھ یوں پھسلی تھی کہ اسے اٹھنا محال تھا۔ اس وقت یا تو کوئی مرد گھر پر نہیں تھا یا پھر سب کو سونا کی قوت پر اعتماد تھا کیونکہ سونا آستینیں چڑھائے پائینچے اُڑسے گائے کے پیٹ تلے ہاتھ دیئے اوپر کو زور لگا رہی تھی اور پھر چند ہی لمحوں بعد گائے اپنے پاؤں پر کھڑی احساس ممنونیت سے اسے دیکھ رہی تھی میں نے اسد اور آصف کو یوں داد طلب نظروں سے دیکھا جیسے یہ کارنمایاں خود میں نے سرانجام دیا ہو!

(میں نے ایسا کیوں محسوس کیا؟)

اسد کے مضبوط بازوؤں کے توانا پٹھے پھڑپھڑانے لگے اور وہ آستینیں چڑھا کر ہاتھ اپنے بازوؤں کے پٹھوں پر پھیرنے لگا۔

اور وہ دن کتنا عجیب تھا جب عین دوپہر کے وقت سونا میرے کمرے میں چلی آئی تھی میں اس کی جرأت پر حیران رہ گیا تھا۔ یوں بھی ہو سکتا ہے یہ تو میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ وہ بے تکلفی سے چارپائی پر بیٹھ گئی۔ مجھے اس کی موجودگی سے خوف آنے لگا، باوجود

اس کے کہ جتنی دیر وہ کمرے میں رہی کمرہ گندم کی سوندھی سوندھی پُرکشش خوشبو سے مہکتا رہا لیکن مَیں گندم کے سحر سے واقف تھا اور نہیں چاہتا تھا کہ اپنے کمرے کی جنت سے نکال دیا جاؤں۔ مَیں چاہتا تھا کہ سونا فوراً واپس چلی جائے۔

ابھی مَیں گفتگو کے لئے الفاظ تلاش ہی کر رہا تھا کہ باہر سے ایسے آواز جیسے کوئی بچہ کتے کی نقل کر رہا ہو۔ اس آواز کو سن کر وہ اُٹھ کھڑی ہوئی اور جاتے جاتے تیزی سے کہہ گئی۔

"پھر آؤں گی۔"

مَیں نہیں چاہتا تھا کہ وہ پھر آئے لیکن مَیں نے اسد سے کہہ کر دودھ اس کے ہاں سے بندھوالیا۔

اس واقعہ نے آصف کو پریشان کر دیا۔ اس نے مجھے سمجھایا کہ مَیں خطرے میں نہ کودوں اور یہ نہ بھولوں کہ سونا کے چار پانچ پہلوان قسم کے بھائی بھی ہیں۔

اسد مسکراتا ہُوا اپنے بازوؤں کے پٹھوں پر ہاتھ پھیرتا رہا۔ اور ریکٹ اُٹھا کر دروازے کی طرف بڑھا اور دروازے سے نکلتا ہوئے کہتا گیا۔

"سونا پھر آئے تو اسے یہیں روک لینا۔"

چند روز بعد اسد آصف کے ساتھ کوئی فلم دیکھنے گیا تھا کہ سونا آگئی۔ شام کے دھندلکے رات کی تاریکی میں بدل رہے تھے۔ کمرے میں بجلی کا بلب روشن تھا۔ میں آرام کرسی میں دھنسا ایک کتاب پڑھ رہا تھا۔ باہر آسمان پر ستاروں میں روشنی آگئی تھی۔

سونا کچھ مضطرب سی نظر آ رہی تھی۔ اُس نے آتے ہی میرا ہاتھ تھام لیا اور کہا

"اُٹھو، چلو!"

"چلوں؟ کہاں؟؟" مَیں نے حیرانی سے پوچھا۔

"اُدھر کھیتوں میں، اونچی اونچی گھاس میں۔ وہاں صرف ہم دونوں ہوں گے۔" اُس نے میرا

بازو زور سے کھینچا اور میں کرسی میں تھوڑا سا اس کی طرف لڑھک گیا۔

باہر دھندلکوں میں ڈوبے ہوئے کھیتوں کی سِحرکشش کا زور ٹوٹ گیا تھا لیکن یہ لڑکی چاہتی تھی کہ میں اس کے ساتھ مل کر اس منظر میں ڈوب جاؤں جو میں ہر روز کھڑکی سے دیکھتا ہوں۔ موت کا فرشتہ اگر فرشتہ ہے تو یقیناً خوبصورت ہے۔ مَیں نے محسوس کیا کہ موت کا فرشتہ سونا کی طرح خوبصورت ہو گا لیکن مَیں مرنا نہیں چاہتا تھا۔ مَیں نے کہا "کمرہ زیادہ اچھی اور محفوظ جگہ ہے۔ وہاں پر تو ابھی اندھیرا گھپ ہونے والا ہے۔ وہاں تو ہمیں ایک دوسرے کا وجود بھی نظر نہیں آئے گا۔"

"جیسے تمہاری مرضی۔" اس نے کہا۔ "دروازہ اور کھڑکی بند کر دو۔ تم اس کھڑکی سے روز مجھے ستاتے ہو۔ مجھ پر جادو کرتے ہو، مجھے بلاتے ہو۔ میں آگئی ہوں جادوگرسیاں۔ اس ستانے کا پورا بدلہ لوں گی۔"

میں سمجھتا تھا وہ کیا کہہ رہی تھی پھر بھی مَیں نے خود سے پوچھا۔ "یہ کیا چاہتی ہے؟ کیا عشق ایسا ہوتا ہے"؟

وہ مجھے غلط سمجھی تھی۔ مجھے اپنے آپ سے شرم آ رہی تھی۔

مَیں حوصلہ مجتمع کر رہا تھا تاکہ اسے کہہ سکوں کہ وہ فوراً واپس چلی جائے۔ لیکن میں کچھ دیر تک کچھ نہ کہہ سکا۔ مجھے خاموش اور پریشان دیکھ کر اس نے کہا۔ "کیا بات ہے بابو کھوئے کھوئے کیوں ہو؟"

"مجھے ڈر لگتا ہے۔" میرے منہ سے سچی بات نکل گئی

"ایسے گبھرو جوان ہو کر ڈرتے ہو؟ کس سے ڈرتے ہو؟ کیوں ڈرتے ہو؟ تمہیں شرم نہیں آتی؟ مجھے دیکھو، میں کسی سے نہیں ڈرتی۔ عورت ہوں پھر بھی نہیں ڈرتی۔ بھائیوں کا تھوڑا سا ڈر ہے سو وہ سب شہر گئے ہیں۔ کل لوٹیں گے۔ تم بھی آج اکیلے ہو بابو۔ اس دن کی بڑی راہ دیکھی ہے!"

میرے پاس ان باتوں کا کوئی جواب نہیں تھا پھر بھی اسے کہنا چاہتا تھا "میں نے تمہیں کبھی نہیں ستایا، کیا کسی کو دیکھنا ستانا ہوتا ہے؟ میں نے تمہیں کبھی نہیں بلایا۔ کیا دیکھنا بلانا ہوتا ہے؟ آخر تم مجھ سے کس بات کا بدلہ لو گی؟ تم چاہتی ہو کہ مجھے ادھر کھیتوں میں لے جا کر بالکل تنہا کر دو، مجھے ختم کر دو، مجھے کھا جاؤ۔ تم نے مجھے سیّاں کہا ہے لیکن یہ کیا عشق ہے تم نے گندم کے بہت سے دانے کھا لئے ہیں لیکن میرے بدن پر تمہارے بدن کا کوئی قرضہ نہیں ہے۔ اے حوا میں آدم نہیں ہوں۔ اگر تم چاہتی ہو کہ میں تمہیں نہ دیکھوں تو نہیں دیکھوں گا میں تمہارا بندۂ بے دام نہیں ہوں۔ میں تو تمہیں دیکھنا بھی نہیں چاہتا۔ وہ تو کوئی اور سونا ہے جسے میں صحن میں کام کرتے دیکھتا ہوں، میں تمہیں نہیں دیکھتا تمہیں تو میں نے آج پہلی بار دیکھا ہے تم کیسی عورت ہو؟ تم سے زیادہ تو مجھے شرم آتی ہے۔ تمہارا حسن کہاں گیا؟ تم سے زیادہ تو میں دلکش ہوں، تم اتنی بدصورت کیسے ہو گئی ہو؟" میں یہ سب کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن صرف اتنا کہہ سکا۔ "میں تم سے ڈرتا ہوں۔"

"بابو مذاق کرتے ہو!" اس نے خوش ہو کر کہا۔

"نہیں مذاق نہیں کرتا۔" میں نے بولنے کا عزم کر لیا تھا "سنو، اگر میں بجلی کے اس بلب کو وہاں سے اتار کر تمہاری گود میں رکھ دوں اور تمہیں اس چارپائی سے اٹھا کر چارپائی کو تمہارے سر پر بٹھا دوں تو تم کیا کہو گی؟"

میں نے انتظار کیا کہ وہ کچھ جواب دے لیکن وہ انگلی دانتوں میں دبا کر ہنستی رہی بالکل بیوقوفوں کی طرح۔ اور میں نے طے کیا کہ اسے بات صاف صاف سمجھائے دیتا ہوں۔ اشارے کنائے وہ نہیں سمجھے گی۔ "دیکھو، ہر چیز اپنی جگہ پر سجتی ہے۔ تمہاری جگہ تمہارا گھر ہے۔ تم اپنے گھر کے صحن میں کام کرتی ہوئی اچھی لگتی ہو میں اس سے آگے کبھی نہیں بڑھا کیونکہ میری بھی ایک جگہ ہے اور مجھے وہیں رہنا چاہیئے۔ میں تمہیں دیکھتا ضرور ہوں لیکن بلاتا نہیں۔ جو چیزیں مجھے اچھی لگتی ہیں وہ سب اس کمرے سے باہر ہیں۔ تم گھر جاؤ اور کبھی گھر سے یوں اپنا آپ لٹانے کے لئے نہ نکلنا۔"

میں ابھی بہت کچھ کہنا چاہتا تھا۔ لیکن اس کے چہرے کا بدلا ہوا رنگ دیکھ کر چپ ہو گیا اور وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کے چہرے کی نرمی ختم ہو گئی تھی۔ زخمی شیرنی کی طرح وہ مجھے نظروں ہی نظروں میں تول رہی تھی۔ شرم اور غصے سے اسے بولنا مشکل ہو گیا تھا۔ یا شاید یہ شرم نہیں شرمندگی تھی۔ میرے لئے اس کا غصہ اور شرمندگی ناقابل برداشت تھے۔

پھر میں نے ایک جرأت مندانہ اقدام کیا۔ میں نے سوچا میں مرد ہوں۔ مجھے مردوں جیسا کام کرنا چاہیئے۔

میں نے اسے اٹھا کر کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔ میں نے اس کے جسم کے زمین پر گرنے کی آواز بھی سنی۔ لیکن وہ نہ چیخی نہ چلائی۔ اب مجھ میں یہ ہمت نہ تھی کہ میں کرسی سے اٹھ کر کھڑکی سے باہر جھانکوں اور دیکھوں کہ نیچے سڑک پر پڑی وہ کیسی نظر آ رہی ہے۔ میں اٹھنے کی ہمت پیدا کر رہا تھا کہ ان الفاظ نے مجھے اپنی جانب کھینچ لیا۔

"تم بدھو ہو بابو"

اس وقت میں یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ میں نے جس بلا کو اپنے قریب سے اٹھا کر باہر پھینک دیا تھا وہ اب بھی اپنی جگہ پر ہی میرے اس قدر قریب کیسے موجود تھی اور یہ کیسے ہو گیا تھا کہ اس کے جسم پر خراش بھی نہ لباس پر مٹی تو کیا اسے بالکل چوٹ نہ آئی تھی اور پھر بھاگ کر زینے کے راستے اوپر چڑھ آئی تھی؟ میں نے طے کیا کہ میں اسے اٹھا کر پھر باہر پھینک دوں گا۔ لیکن میں ایسا نہیں کر سکا کیونکہ میں تو کھڑکی سے کافی ادھر شروع سے ہی کرسی میں دھنسا بیٹھا تھا۔ میں تو ایک لمحے کے لئے بھی نہیں اٹھا تھا۔ پھر وہ کون تھا جس نے سونا کو اٹھا کر کھڑکی سے باہر پھینکا تھا یا وہ کون تھا جسے میں نے اٹھا کر باہر پھینک دیا تھا؟ اب مجھے یوں لگا جیسے میں صورت حال کو سمجھ گیا ہوں۔ اور مجھے کتنی ہی ایسی چیزوں کا خیال آیا۔ جنہیں میں نے اپنے کمرے سے اور زندگی سے نکال دیا تھا لیکن وہ وہیں اپنی پرانی نشستوں میں موجود تھیں۔

اس کی آواز نفرت کی آواز تھی۔

اب وہ فوراً نیچے اتر گئی اور میں کرسی میں اور زیادہ دھنس گیا جیسے طوفان کی لہریں کسی بے ہوش جسم کو کنارے پر ڈال جاتی ہیں۔

آصف کو ڈر تھا کہ اب میری زندگی کو بھی خطرہ لاحق ہو جائے گا۔ وہ چاہتا تھا کہ میں یا تو سونا سے شادی کرنے کی کوشش کروں یا مکان بدل لوں۔

اسد فوراً غصے میں آ گیا۔ تم نے اسے کیوں جانے دیا؟ میں نے کہا تھا وہ پھر آئے تو اسے روک لینا۔ تم بڑے بدنصیب ہو۔ تم نے گھر آئی لکشمی کو ٹھکرایا ہے۔ وہ تم سے ضرور بدلہ لے گی۔"

"تم مجھے جانتے ہو اسد۔ میں جس طرح اس کھڑکی سے اور دلکش چیزوں کو دیکھتا ہوں اسی طرح اس لڑکی کو بھی دیکھتا ہوں۔ میں نے اسے کبھی نہیں بلایا۔ میں نے کبھی کوئی خواہش نہیں کی۔ میں اسے کیسے روک سکتا تھا۔"

"تم کیوں خواہش نہیں کرتے؟ تم اسے شرافت کہتے ہو۔ لیکن تم نے دیکھ لیا کہ سونا تمہیں کیا سمجھتی ہے۔"

"تم نہیں سمجھتے۔ میرا اپنا مزاج ہے۔ اپنا کردار ہے۔ میں اپنے وجود کو صرف اس مزاج اور کردار کے واسطے سے ہی جانتا ہوں۔ ایسا نہ ہو تو میں ہونے کے احساس سے بھی محروم ہو جاؤں۔"

"یہ ہونے کا احساس کیا ہوتا ہے؟ تمہیں تمہارے فلسفے نے بے جان کر دیا ہے۔"

"مگر میں حیران ہوں تم ناراض کیوں ہو رہے ہو!"

"میں، میں اس لئے ناراض ہوں کہ تم اپنے ساتھ ہمیں بھی لے ڈوبو گے۔"

میرا جی چاہا کہ اسد کو اٹھا کر کھڑکی سے باہر پھینک دوں تاکہ وہ اس خارج میں ڈوب جائے جس میں ڈوبنے کو وہ زندگی کہتا ہے۔ میں محسوس کر رہا تھا جیسے اسد میرے سامنے کھڑا با

نہیں بدل رہا بلکہ میرے سر پر سوار ہے۔ دل کہہ رہا تھا یہ یہاں سے دفع کیوں نہیں ہو جاتا۔ یہ کیوں نہیں جانتا کہ قریب اگر وہ کس قدر ناقابل برداشت ہو جاتا ہے۔ میں اس تکلیف دہ بوجھ کو گرانے کے لئے اٹھا لیکن وہ بنیان اور نیکر پہن چکا تھا۔ پھر وہ ریکٹ اٹھا کر کمرے سے باہر چلا گیا اور میں سوچنے لگا کہ کیا میں واقعی غلطی پر ہوں!

دو تین دن ماحول میں کھچاؤ رہا پھر حالات معمول پر آ گئے۔ اسد کا غصہ ختم ہو گیا اور سونا کے چہرے اور شخصیت کا پرانا دلکش تاثر بھی لوٹ آیا۔ قریب سے وہ جتنی کرب انگیز تھی فاصلے سے اتنی ہی دلآویز معلوم ہوتی تھی۔ فاصلوں کو میری روح سے ربط خاص ہے۔ فاصلے کم ہوتے ہیں تو میرا دم گھٹنے لگتا ہے۔ قرب میں فنا ہے اور وصل میں موت۔ مجھے تو ایسے ہی لگتا ہے....

اس وقت بھی سونا کھڑکی سے صاف نظر آ رہی ہے۔ میں اسے دیکھنے پر مجبور ہوں۔ وہ کتنی دلکش ہے۔

اب میں کمرے کا دروازہ اندر سے بند رکھتا ہوں۔ دروازہ اب بھی بند ہے لیکن باہر کی دنیا پھر بھی دلکش ہے۔

گویا میں ڈرتا ہوں! کس سے ڈرتا ہوں؟ کیوں ڈرتا ہوں؟

کیا واقعی میں کوئی نفسیاتی مریض ہوں؟

(۲)

نیچے سڑک پر لوگ پولیس کا انتظار کر رہے تھے۔ آصف اوپر صادق کے کمرے کے دروازے سے لگا صادق کے ہاتھ کی یہ تحریر پڑھ رہا تھا۔ یہ اوراق اسے صادق کی قمیض کی جیب سے ملے تھے۔ صادق نے اپنے بارے میں سب کچھ ان اوراق میں لکھ دیا تھا۔ اس نے وہ مختصر سا خط بھی پڑھا، جو صادق نے کسی ماہر نفسیات کے لئے لکھا تھا اور ان اوراق سے منسلک تھا۔ اس خط میں اس ماہر نفسیات سے مشورے کی درخواست کی گئی تھی۔

ایک دن پہلے وہ کمرے کے اندر بہت دیر تک صادق کے پاس بیٹھا تھا۔ صادق اس روز کچھ اداس تھا، سونا بھی دو دن سے نظر نہیں آئی تھی۔

"تم اداس ہو......... سونا کی غیر حاضری سے پریشان ہو" آصف نے اپنے طور پر فیصلہ کر لیا تھا کہ صادق سونا سے عشق کرتا ہے اور ان کی شادی ہونا چاہیئے۔ آصف نے کبھی صادق سے اس مسئلے پر بات نہیں کی تھی کہ یہ چیزوں اور قرب اور فاصلوں کا فلسفہ کیا ہے اور کیسے چیزیں قریب آکر صادق کے لئے بے معنی اور باعث عذاب ہو جاتی ہیں۔

"ہاں یہ درست ہے .... آج تو میں واقعی تنہائی کے احساس سے پریشان ہو گیا ہوں"

"تم اداس کیوں ہو؟"

"جانتے ہو تو مجھ سے کیوں پوچھتے ہو"

"تو پھر مان جاؤ کہ تمہیں سونا سے عشق ہے۔ تم اسی کے لئے بے تاب ہو"

"یہ درست ہے کہ میں اسے دیکھنے کے لئے بے چین ہوں۔ لیکن مجھے اس سے عشق نہیں ہے"

"تم نہیں جانتے کہ تمہیں اس سے عشق ہے..... لیکن میں جانتا ہوں۔ تم اسے حاصل کرنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے؟"

سونا سمندر کی وہ لہر ہے جو مجھ ایسے کنارہ نشین کے سر سے گزر کر واپس چلی جائے گی اور میں ساحل پہ پڑا دم توڑ دوں گا۔ طوفان کی وہ بڑی بڑی لہریں جو فاصلے سے خوبصورت نظر آتی ہیں، قریب ہوں تو موت بن جاتی ہیں۔ ہر شے کو اپنے مقام پر رہنا چاہیئے مجھے زندگی عزیز ہے اور میں دنیا کو دیکھنا چاہتا ہوں تو میں کنارے پر لہروں سے اتنی دور ضرور رہوں گا جہاں تک یہ لہریں پہنچ نہ سکیں۔ سورج اپنی تابانی اور خوبصورتی کا تاثر فاصلے ہی کے ذریعے دیتا ہے۔ اس کے قرب میں موت ہے جہنم ہے۔ اور اپنی ذات میں ہر شخص کا

ہے۔ دوسروں کو خاکستر کر دینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ کیا تم چاہتے ہو کہ میں چیزوں کو دیکھنے کی بجائے، ان میں ڈوب جاؤں اور مر جاؤں یا پھر مستقل عذاب میں مبتلا ہو جاؤں اور ہونے کے احساس سے بھی محروم ہو جاؤں"

"تم نے ٹینی سن کی نظم لیڈی آف شیلاٹ پڑھی ہے؟"

"ہاں دسویں جماعت کے نصاب میں شامل تھی۔"

"تم اس عورت کے المیئے کو سمجھتے ہو؟"

"شاید!"

"خیر، مجھ سے سنو، اس کا المیہ یہ تھا کہ وہ حقیقت کی بجائے عکس اور شے کی بجائے شے کی تصویر کو اہمیت دیتی تھی اور جب اس کا تصادم حقیقت کی دنیا سے ہوا تو وہ اس کا مقابلہ نہ کر سکی"

"لیکن میری صورت حال اس سے مختلف ہے۔ میری قید میری آزادی ہے"

"تم قید بھی ہو اور تمہاری صورتحال اس کی صورتحال سے مختلف بھی نہیں ہے.... میں تمہارے انجام سے بھی ڈرتا ہوں۔ اس لئے چاہتا ہوں کہ تم آہستہ آہستہ حقیقت کی دنیا میں آجاؤ تاکہ ایسا نہ ہو کہ جس روز حقیقت سے اچانک تمہارا سامنا ہو اور تمہارے تصور کا وہ آئینہ چکنا چور ہو جائے جس میں تم زندگی کا عکس دیکھتے ہو تو تم اس صدمے کو برداشت نہ کر سکو.... اگر ایسا ہوا... تو کیا تم قائم رہ سکو گے؟...... پھر تم حواس سے محروم بھی ہو سکتے ہو...... لیڈی آف شیلاٹ بھی مر گئی تھی...... تم جیسے لوگ اکثر خودکشی کر لیتے ہیں...... لیکن تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیئے۔ تمہیں خود کو تھوڑا سا بدل لینا چاہیئے اور یہ سوچنا چاہیئے کہ اگر پانی بھی حلق میں پھنسنے لگے تو اسے نیچے کون سی چیز اتارے گی تمہیں ایک عام آدمی بن جانا چاہیئے اور خوف اور نفرت کو دماغ سے نکال کر اسے سب کی محبت سے معمور کر لینا چاہیئے"

"تم سمجھتے ہو میرے اندر نفرت بھری ہے۔ نہیں ایسا نہیں ہے میں دنیا کو فاصلے سے ضرور دیکھتا لیکن اس سے نفرت نہیں کرتا۔ میں اپنے انفرادی مزاج کے تابع ضرور ہوں اس لئے فاصلے سے چیزوں اور لوگوں کو چاہتا ہوں۔ قریب ہو کر سب کچھ گڈمڈ ہو جاتا ہے۔ پھر کوئی چیز الگ حیثیت کی مالک نہیں رہتی۔ مجھے اس صورت حال سے خوف آتا ہے جب میں اپنی انفرادیت کے ساتھ الگ پیدا ہوا اور اپنی الگ قبر میں جاؤں گا تو میں کیوں نہ زندگی میں بھی اپنی الگ حیثیت کو مکمل طور پر قائم رکھوں وہ قرب موت سے مختلف کیسے ہے جو فرد کی الگ حیثیت کو ختم کر دیتا ہے؟"

"اگر تمہیں تنہا کسی دوسرے ستارے پر بھیج دیا جائے یا اگر اس دنیا میں صرف تم اکیلے رہ جاؤ تو تم بہت خوش رہو گے!"

"نہیں ایسا ممکن نہیں ۔۔۔۔۔ میں خالی دنیا میں نہیں رہ سکتا۔ میں زندگی میں اس طرح نہیں ڈوب سکتا جیسے بعض لوگ ڈوب جاتے ہیں لیکن اس کا مطلب زندگی سے نفرت نہیں سمندر خوبصورت ہے اور اگر سمندر نہ ہو تو وہ کنارا یا ساحل کہاں سے آئے گا جس پر کھڑے ہو کر سمندر کو دیکھا اور اس میں ڈوبنے کی خواہش کا اظہار کیا جاتا ہے۔"

"تم جتنی سمجھ کی باتیں کرتے ہو عملی طور پر اتنی سمجھ کا ثبوت نہیں دیتے۔"

"میری کچھ مجبوریاں ہیں۔"

"ان پر قابو پانے کی کوشش کرو۔"

"یہ تو صرف ایک حد تک ہی ممکن ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ ہم نے اپنی مجبوری پر قابو پا لیا لیکن اس وقت ہم اسی یا کسی اور انجانی مجبوری کے تابع ہو کر عمل کر رہے ہوتے ہیں۔"

"آدمی مجبور محض نہیں ہے۔"

"لیکن فرد ایک خاص صورت حال کا اسیر ضرور ہوتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ اپنی کی صورت حال کو قبول کرنے ہی میں اپنی آزادی کو یقینی سمجھتا ہے۔ میری ماں گاؤں میں رہتی بھی وہ کسی پریشانی میں مبتلا ہوتی ہے اللہ کے نام پر صرف ایک پیسہ دینے کی منت مانتی

اور جب پریشانی رفع ہو جاتی ہے تو کبھی پانچ پیسے کبھی پانچ آنے اور کبھی پانچ روپے خیرات کرتی ہے۔ میں نے ایک بار اسے سمجھانا چاہا کہ یہ باتیں فضول ہیں لیکن وہ ڈر گئی اور سمجھی میں پاگل ہو گیا ہوں یا کافر۔ اس نے فوراً منت مانی کہ اگر بچے کا دماغ ٹھیک ہو جائے تو میں ایک پیسہ فقیر کو دوں گی۔" میں خود ماں کی حالت دیکھ کر پریشان ہو گیا اور میں نے طے کیا کہ آئندہ ایسی بات نہ کہوں گا۔ ماں سمجھتی ہے کہ اس کی منت نے مجھے بچا لیا۔ اس نے پانچ سو روپے فقیروں میں بانٹے اور شکرانے کے نفل پڑھے۔ اگر میں زبردستی اس کو اس صورتحال سے کھینچ نکالنے کی کوشش کرتا جس کی بظاہر وہ اسیر ہے لیکن جو اس کے لئے حوصلے اور زندگی کا ایک ذریعہ ہے تو وہ صدمہ برداشت نہ کر سکتی۔ جب سب کو مر جانا ہے اور اپنے اپنے راستے سے بالآخر جنت میں داخل ہو جانا ہے تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ کوئی کیا سوچتا ہے اور کیسے رہتا ہے۔ ۔۔۔۔ تو بات یہ ہے کہ مجھے سونا سے عشق نہیں ہے۔ آخر ہم پہاڑ کی چوٹی سے وادی کا نظارا بھی تو کرتے ہیں اور جہاز کے عرشے پر کھڑے ہو کر سمندر کی لہروں اور دھندلے آبی افق اور سمندری پرندوں کو دیکھنا بھی تو پسند کرتے ہیں ۔۔۔۔۔۔ بس اسی طرح میں سونا کو بھی دیکھتا ہوں۔"

آصف جب اپنے گھر کی طرف جا رہا تھا تو قدرے مطمئن تھا۔ اب اس کا خیال تھا کہ صادق کسی غلط راستہ پر نہیں ہے اور اسے روکنے کی ضرورت نہیں۔ اس نے یہ بھی طے کیا کہ وہ ان مسائل پر اکثر صادق سے گفتگو کیا کرے گا۔ اسے امید تھی کہ اس کا اچھا نتیجہ برآمد ہو گا۔

اگلے دن آصف دفتر میں تھا کہ دوپہر کے قریب صادق کے کمرے کے نیچے کی دکان کے مالک نے اسے بلوا بھیجا۔ "فوراً آیئے، زبردست حادثہ ہو گیا ہے۔"

آصف پریشانی کے عالم میں وہاں پہنچا۔ صادق کے کمرے کی کھلی کھڑکی کے نیچے کچھ لوگ جمع تھے جو آصف کو دیکھ کر ایک طرف ہو گئے۔

آصف آگے بڑھا اور کچھ دیر کے لئے پتھر کا بن گیا۔ اس کے کانوں میں شائیں شائیں کی آوازیں آنے لگیں اور اسے یوں لگا جیسے وہ کسی پرانی داستان کا ایک کردار ہے جو جادو سے

پتھر کا بن گیا ہے۔ لیکن زندہ ہے اور دیکھ سکتا ہے بس بول نہیں سکتا۔

لوگوں نے اسے بتایا کہ صادق کھڑکی سے گر کر مر گیا ہے وہ چونکہ گرتے ہی مر گیا تھا اس لئے اس کی لاش کو چھیڑا نہیں گیا تھا۔

حقیقت کی سحر شکن قوت نے آصف کو لاش پر جھکا دیا۔ اس نے محسوس کیا وہ پتھر کا نہیں ہے اور کسی داستان کا کردار نہیں ہے بلکہ زندہ ہے اور اپنے دوست صادق کی لاش پر جھکا ہوا ہے۔ اس نے صادق کی مٹھی میں کاغذ کا پرزہ دیکھا۔ اس نے اس پرزے کو اس کے ہاتھ کی گرفت سے نکالا اور پڑھنے لگا:

پیارے صادق!

تم سمجھو گے کہ میں نے تمہیں دھوکا دیا اور تمہارا حق چھینا۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔۔۔۔ دراصل تم اور سونا ایک دوسرے کی ضد ہو۔ سونا کو خیال پرست فلسفی یا شاعر کی ضرورت نہیں بلکہ ایک قوی مرد کی ضرورت تھی۔ وہ تمہارے صحت مند جسم سے دھوکا کھا گئی۔۔۔۔ اب وہ میرے پاس ہے یعنی حقدار کو حق مل گیا ہے۔ سونا کے بھائی برابر فساد پر آمادہ ہیں لیکن میں سب سے نبٹ لوں گا۔۔۔۔

میں نے لمبی چھٹی لے لی ہے۔ تم سے ملنے کو جی بہت چاہتا ہے۔ لیکن ابھی حالات اجازت نہیں دیتے کہ تمہارے پاس آؤں۔

تمہارا اپنا

اسد

آصف نے نظریں کھڑکی کی طرف اٹھائیں۔ اسے پچھلے روز کی ملاقات یاد آ گئی۔

"اُسے میں نے مارا ہے۔۔۔۔۔ میں ہی اس کا قاتل ہوں!" اس نے اپنے آپ سے کہا۔ "میں نے ہی اسے کہا تھا کہ تم جیسے لوگ اکثر خودکشی کر لیتے ہیں۔۔۔۔ میں نے یہ خوفناک خیال اس کے ذہن میں داخل کیا تھا۔۔۔۔۔ اوہ!"

وہ ایک بار پھر لاش پر جھکا۔ لاشعوری طور پر وہ سمجھ رہا تھا کہ لاش کی تلاشی ضرور لینی چاہیے لاش کی قمیض کی جیب سے اسے چند اوراق ملے۔ یہ صادق کی تحریر تھی۔ ان اوراق کو ہاتھ میں لے کر وہ عمارت کے عقبی حصے کی طرف چل دیا جہاں زینہ تھا۔ وہ زینہ پر چڑھ گیا اور صادق کے کمرے کے دروازے کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

اس نے دروازے کو دھکیلا دروازہ اندر سے بند تھا۔

"کھولو" اس نے بے قابو ہو کر کہا۔

"کھولو"۔ چاروں طرف سے آواز آئی۔

اس نے آنکھیں آسمان کی طرف اٹھائیں۔ وہ آسمان سے شکوہ کرنا چاہتا تھا لیکن اس کے اور آسمان کے درمیان ایک زندہ پیکر حائل تھا۔ یہ اسد تھا جو چھت سے ذرا اوپر فضا میں معلق تھا اور مسکرا رہا تھا۔ اس کی آستینیں چڑھی ہوئی تھیں اور وہ ہاتھ اپنے توانا بازوؤں کے مضبوط پٹھوں پر پھیر رہا تھا۔

"ظالم۔۔۔۔۔ ادھر آؤ۔۔۔۔۔ سنو۔۔۔۔۔ دیکھو تم نے کیا کیا ہے!" آصف نے روتے ہوئے کہا۔

اسد مسکراتا رہا۔

"آرام سے نیچے اتر آؤ ورنہ گر جاؤ گے۔۔۔۔۔ اتنی بلندی سے گر کر بچ نہ سکو گے دیکھو صادق تو کھڑکی سے گرتے ہی مر گیا ہے۔"

اسد مسکراتا رہا۔

آصف نے رومال سے اچھی طرح آنکھوں کو صاف کیا اور پھر غور سے دیکھا۔ اسد وہاں موجود نہیں تھا۔ صرف بادل کا ایک ٹکڑا ہوا میں معلق تھا۔

وہ دروازے کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور ان اوراق کو پڑھنے لگا جو اسے صادق کی جیب سے ملے تھے:——

دروازے سے کمرے میں داخل ہو کر جب میں دروازہ بند کرتا ہوں تو دل ہی دل میں کہتا ہوں:

"اے دروازے، میرے محسن، میں تیرا ممنون ہوں۔"

باہر کفن سے پاؤں



میرا باپ پہلی بار مرا تو سردی زوروں پر تھی اور سال ختم ہونے میں چند ہی دن باقی تھے ۔

میت کو غسل دینے کے لئے تختے پر لٹایا گیا تو میرے دادا جان میت کے پاؤں کی جانب کھڑے ہو گئے تاکہ رخصت ہونے والے بیٹے کے چہرے کو دیکھتے رہیں۔ لوگوں نے بہت چاہا کہ وہ وہاں سے ہٹ جائیں لیکن ان کی ضد لوگوں کے اصرار پر حاوی رہی۔

میت کو غسل دینے کے لئے خوب گرم پانی لایا گیا تھا ـــــــ خود اپنی موت سے پہلے میں یہی سمجھتا تھا کہ پانی کے گرم یا سرد ہونے سے میت کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ لیکن تجربے نے اس خیال کو غلط ثابت کر دیا اور پرانے لوگوں کے توہمات دانائی کی باتیں معلوم ہونے لگے۔

میرے باپ کے مردہ جسم پر گرم گرم پانی ڈالا گیا تو دادا جان نے محسوس کیا جیسے میت کے پاؤں کو ہلکی سی جنبش ہوئی ہے تب انہوں نے دیوانوں کی سی وہی حرکت کی جس کے خوف سے لوگ انہیں بیٹے کی لاش سے دور رکھنا چاہتے تھے۔ وہ گیلی اور ننگی لاش کو بازوؤں میں اٹھا کر کمرے کی طرف بھاگ کھڑے ہوئے۔ یہ سب کچھ اس تیزی کے ساتھ رونما ہو گیا کہ کسی کو ان کا راستہ روکنے کا ہوش ہی نہ آ سکا۔ سب یہی کہہ رہے تھے کہ بیٹے کی موت نے باپ کا دماغ

توازن بگاڑ دیا ہے۔ اور ہر طرف ایک شور سا پھیل گیا —— سب بول رہے تھے۔

"کیا ہوا؟"

"کیا ہوا؟"

"جمیل پاگل ہوگیا ہے!"

"جمیل الرحمٰن دیوانہ ہوگیا ہے!"

"بے چارہ!"

"بے چارہ جمیل الرحمٰن!"

چند لوگ داداجان کی طرف لپکے، لیکن داداجان نے انہیں یہ موقع ہی نہیں دیا کہ وہ ان تک پہنچ سکیں۔ انہوں نے کمرے میں داخل ہوتے ہی دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ لوگ دروازہ پیٹتے رہے۔ اسے توڑ دینے کی دھمکیاں دیتے رہے۔ جواب میں داداجان نے صرف ایک بار اپنی گرجدار آواز میں صرف اتنا کہا۔

"خاموش رہو —— شور مت کرو!"

کمرے میں انگیٹھی پہلے سے دہک رہی تھی۔ داداجان نے میرے باپ کی لاش کو بستر پر لٹا کر کپڑے سے رگڑ رگڑ کر خوب صاف کیا، پھر اس پر گرم لحاف ڈال کر جسم کو ہاتھوں سے ملنا شروع کر دیا اور جب کچھ دیر بعد دروازہ کھلا تو لوگ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ میرا باپ آہستہ آہستہ سکون کے ساتھ سانس لے رہا ہے اور داداجان کی آنکھوں میں آنسو ستاروں کی طرح چمک رہے ہیں۔

○

یہ واقعہ میری پیدائش سے پہلے کا ہے اس لئے میں اس کا عینی شاہد نہیں ہوں لیکن میری پیدائش کے پندرہ برس بعد جب میرا باپ دوسری بار مرا تو میں زندگی کو کسی حد تک سمجھنے کے قابل ہو چکا تھا۔ مجھے یہ واقعہ اچھی طرح یاد ہے۔ داداجان موجود نہیں تھے۔ اس لئے

یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ میرا باپ واقعی مر گیا تھا یا اسے زندہ ہی دفن کر دیا گیا تھا۔ مجھے یہ یقین ضرور ہے کہ غسل کے دوران اس کے پاؤں ہلے ہوں گے۔ لیکن دیکھنے والی آنکھ کو بند ہوئے چودہ برس ہو چکے تھے۔

پہلی موت کے چند برس بعد میرے باپ کی شادی کر دی گئی تھی اور یہیں سے میرے اس پرکشش عذاب کی داستان شروع ہوتی ہے جسے زندگی کہا گیا ہے۔

پھر میں بھی مر گیا۔

ہاں، میں بھی مر گیا۔ مجھے اپنے مرنے کا افسوس نہیں تھا، لیکن میں مرنا نہیں چاہتا تھا۔ پیدا ہونے اور زندہ رہنے کی میں نے کبھی کوئی خاص خوشی محسوس نہیں کی تھی، لیکن موت کی گود بھی مجھے پسند نہیں تھی۔ شاید یہ بات لوگوں کو عجیب معلوم ہو کہ دکھوں کے باوجود میں نے نہ تو کبھی مرنے کی خواہش کی اور نہ خودکشی کی کوشش —— ہاں اب میری ذہنی کیفیت دوسروں سے بہت مختلف ہے کیونکہ موت کا تجربہ جو میں حاصل کر چکا ہوں دوسرے سب لوگ اس سے محروم ہیں صرف میرا باپ اس تجربے سے گزرا تھا۔ لیکن اب وہ دنیا میں نہیں ہے۔

میری اور میرے باپ کی موت میں نمایاں فرق یہ تھا کہ میرے باپ کی پہلی موت پر اس کا اپنا باپ زندہ تھا جو اس کے پاؤں کی ذرا سی جنبش میں زندگی کی تڑپ کو پہچان سکتا تھا۔ لیکن خود میرا باپ میری ماں کی طرح میری موت سے کئی برس پہلے مر چکا تھا اور کوئی نہیں تھا جو دیکھتا کہ میں مرنا نہیں چاہتا تھا —— جو دیکھتا کہ میرے پاؤں میں جو جنبش ہو رہی تھی وہ غسال کے مضبوط ہاتھوں کی کرامت نہیں تھی بلکہ زندہ رہنے کی تڑپ تھی۔

واقعات اب اپنے اصل تسلسل کے ساتھ میرے ذہن میں نہیں ہیں۔ یقیناً میں وقفوں کے ساتھ کبھی اپنے اندر ڈوب جاتا تھا اور کبھی ابھر آتا تھا۔

میں لکڑی کے تختے پر پڑا تھا اور بہت سی باتیں میرے کانوں میں پڑ رہی تھیں جن میں سے کئی اب تک مجھے یاد ہیں۔

"تم نے دیکھا ہے چھپکلی کی دُم کٹ جائے تو جسم سے الگ ہو جانے کے باوجود وہ دیر تک تڑپتی رہتی ہے۔"

"ہاں ــــ دیکھا ہے ــــ کیوں؟"

"اس میت کے پاؤں دیکھو ــــ کیسے کپکپا رہے ہیں۔"

"جان آہستہ آہستہ نکلتی ہے تو ایسا ہی ہوتا ہے۔"

"بڑی عجیب بات ہے کہ آدمی مر بھی جائے اور پھر بھی اس کے پاؤں ہلتے رہیں۔"

"مگر ــــ چھپکلی کی دم تو جسم سے الگ ہو کر تڑپتی ہے نا ــــ اور اس میت کے ساتھ تو ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔"

پہلا شخص لاجواب ہو کر خاموش ہو گیا۔ ان کی خاموشی سے مجھے سخت صدمہ ہوا اور میں تیزی سے ناامیدی کی گہرائی میں ڈوبنے لگا۔ یہاں تک کہ میرے پاؤں مایوسی کی سخت اور سرد زمین پر آ کر رک گئے ــــ اور میں اٹھ کھڑا ہوا ــــ اب میں چل سکتا تھا۔

یہ ایک بیکراں صحرا تھا جس میں میں چلا جا رہا تھا۔ روشنی مدھم تھی، شاید شام کا وقت تھا یا شاید صبح کا۔ میں یقین سے نہیں جان سکا تھا۔ سورج نظر نہیں آ رہا تھا لیکن گرمی شدید تھی، میں تنہا نہیں تھا ہر جانب سے لوگ چلے آ رہے تھے۔ بے شمار لوگ میرے گرد جمع ہو گئے تھے۔ میرا دم گھٹنے لگا۔ میں نے چاہا کہ رک جاؤں، لیکن عقب سے ہجوم کا دباؤ شدید تھا۔ میں نے چاہا کسی اور جانب سے نکل جاؤں لیکن ہر جانب متحرک ٹانگوں کا جنگل دیوار تھا۔

سب چل رہے تھے۔ میں بھی چلتا رہا، چلنا نہیں چاہتا تھا لیکن چلتا رہا۔ میں پیاس سے بے حال ہو رہا تھا۔ دوسرے بھی پیاسے ہوں گے۔ لیکن مجھے کسی کا چہرہ دکھائی نہیں دے رہا تھا اور سب خاموش تھے۔ ہم سب لوگ کہاں جا رہے تھے؟ یقیناً کوئی نہیں جانتا تھا لیکن لگتا تھا کہ جہاں سب کو جانا تھا وہاں پہونچنے کی سب کو بہت جلدی تھی۔

اچانک روشنی بہت مدھم ہو گئی جس سے اندازہ ہوا کہ یہ شام کا وقت ہے۔ سورج معلوم نہیں کہاں تھا لیکن وہ جہاں بھی تھا اب غروب ہو چکا تھا۔

دور افق پر ایک ستارہ چمکا، ستارۂ شام۔ مجھے اس ستارے کو دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ میں نے اس کا ذکر کتابوں میں پڑھا تھا۔ ہم سب اس کی جانب تیزی سے بڑھنے لگے جیسے وہی ہماری غیر متعین، انجانی منزل ہو۔ ستارہ بھی جیسے ہمارے استقبال کے لئے ہماری طرف لپکا اور پھر میں نے دیکھا کہ سامنے ایک فلک بوس دیوار ہے جس میں ایک بہت کشادہ دروازہ ہے جو کھلا ہے اور دروازے کے دوسری جانب روشنی کا سیلاب ہے جو ہمیں کھینچ رہا ہے۔

میں نہیں جانتا تھا کہ یہ میری منزل ہے لیکن احساس ہو رہا تھا کہ منزل یہی ہے۔ مجھے لگا جیسے میں آزاد ہو گیا ہوں۔ میرے ہمسفر جو میرے گرد کھنچی ہوئی دیوار تھے اور جنہوں نے مجھ پر ہر جانب سے راہ فرار بند کر دی تھی نہ معلوم کہاں غائب ہو گئے تھے۔ خشک ہوا کے جھونکے جسم کو لگے تو جسم جیسے نیند سے جاگ اٹھا۔ میرے قدموں تلے نرم، خنک مخملی گھاس کا لمس تھا اور دائیں بائیں ایک ایک ندی بہہ رہی تھی۔

مجھے وہ دونوں لڑکیاں بری طرح یاد آئیں جو مجھے اتنی اچھی لگتی تھیں کہ میں ان سے محبت کرنے انہیں چھونے اور انہیں اپنانے کے خیال سے بھی ڈرتا تھا اس لئے سدا ان کی محبت تک سے محروم رہا تھا۔ عجیب طرح کی محبت تھی اور عجیب طرح کی محرومی۔ میں ہمیشہ ان سے دور رہا لیکن اب لگتا ہے کہ میں تو صرف انہی کے لئے زندہ تھا۔ ان کے نام کتنے دلکش تھے ــــ کوثر اور تسنیم ــــ یہ دونوں نام میرے لئے عجیب طرح کی خوشگوار بے چینی کا سرچشمہ تھے۔ اب جو میں نے انہیں اپنے ساتھ دائیں بائیں چلتے دیکھا تو لگا جیسے میں جنت میں داخل ہو گیا ہوں۔ میں پیاسا تھا میری زبان خشک ہو چکی تھی۔ حلق سوکھ گیا تھا۔ سارا بدن جل رہا تھا۔ پیاس کا احساس پورے بدن میں پھیل گیا تھا۔ ہاں۔ میرا پورا بدن پیاسا تھا۔ چلو بھر پانی سے یہ پیاس بجھنے والی نہیں تھی۔ میرا سارا بدن کسی خنک، تیز اور خوش گوار لمس کے لئے بے تاب تھا ــــ اور میں ایک ساتھ دونوں ندیوں میں کود گیا ــــ تب مجھے پتہ چلا کہ ندیاں جو بظاہر دو نظر آ رہی تھیں دو نہیں تھیں۔ ندی

تو صرف ایک ہی تھی۔

پانی سرد تھا۔ میں پانی میں گرا تو میں نے جلتے کوئلوں کے پانی میں بجھنے کی تیز آواز صاف صاف سنی۔ بجھنے کے بعد میں سطح پر تیرتا ہُوا کنارے کی جانب بڑھنے لگا ــــ آہستہ آہستہ مطمئن اور بے پروا!

کنارے پر اترا تو میں کانپ رہا تھا ــــ میں نے چاہا کہ جسم کو کسی چیز سے ڈھانپوں لیکن یوں لگا جیسے لکڑی کے سخت تختے نے مجھے جکڑا ہُوا ہے ــــ مجھے ٹھنڈے پانی سے نہلایا جا رہا تھا اور میرے پاؤں کانپ رہے تھے!

میں نے بہت چاہا کہ کوئی میری طرف متوجہ ہو۔ میرے پاؤں کی جنبش دیکھے۔ لیکن بے سُود ــــ اور میں پھر مایوسی کی سخت اور سرد زمین پر جیسے برف کے بوجھ تلے سو گیا۔

آنکھ کھلی تو اندازہ ہُوا نمازِ جنازہ پڑھی جا چکی ہے۔ میں نے سنا کوئی شخص نہایت بے اثر اور بے کیف آواز میں کہہ رہا ہے کہ جو لوگ جانا چاہیں انہیں اجازت ہے۔

میں نے اس اجازت کو غنیمت جانا اور بھاگ کھڑا ہُوا۔ میں سمجھ رہا تھا کہ میں پوری قوت سے بھاگ رہا ہوں۔ لیکن جہاں تھا وہیں رہا۔ میں نے پھر آنکھیں موند لیں اور مایوسی کی چادر تان لی۔ اچانک میں نے محسوس کیا جیسے مجھے جھولا جھلایا جا رہا ہے۔ مجھے اپنی ماں شدت سے یاد آئی جو مجھے چھوٹا سا چھوڑ کر مر گئی تھی۔ اس عجیب سفر کا یہ حصہ مجھے اچھا لگا۔ معلوم نہیں کیوں!

دھوپ کے زاویے اور کفن پر پڑنے والے درختوں کے سائے بتا رہے تھے کہ دن ڈھل رہا ہے اور ہم کدھر جا رہے ہیں۔ اچانک میرے سر کی جانب ایک طرف کا پایہ باقی تین پایوں سے ایک جھٹکے کے ساتھ کوئی فٹ بھر اوپر اٹھ گیا اور پھر آدھے آدھے منٹ کے وقفے کے ساتھ ہر پائے کے ساتھ یہی سلوک ہُوا۔ یقیناً یہ عمر دراز خان تھا جو میرا گہرا دوست تھا اور مجھے کندھا دینے آیا تھا۔ اس کا قد اتنا لمبا تھا کہ ہزاروں کے ہجوم میں بھی وہ دور سے نظر آ جائے ــــ

میں نے بڑے شدید جھٹکے محسوس کئے تھے اور لگ رہا تھا جیسے میرے کفن کے پاؤں والے بند

کھل گئے ہیں۔

جس درخت کے سائے میں مجھے لٹایا گیا میں اسے اچھی طرح جانتا تھا۔ اس کے تنے کے قریب ہی میرے باپ کی قبر تھی۔ دادا جان کی قبر کے بارے میں میں نے سن رکھا تھا کہ اسی درخت کے قریب کہیں تھی لیکن اس کا نشان مٹ چکا تھا۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ ایک بار میرے باپ کو کسی دوسرے شہر میں دو برس تک رکنا پڑ گیا تھا اور جب وہ واپس آیا تو میرے دادا جان کی قبر کا نشان مٹ چکا تھا۔ مجھے تو اس کا کوئی خاص افسوس نہیں تھا ــــ معلوم نہیں میرے باپ نے کیا محسوس کیا ہو گا!

کسی نے اعلان کیا کہ قبر کی صفائی ہو گئی ہے۔

میں جانتا تھا کہ یہ قبر میرے لئے کھودی گئی ہے۔ مجھے اس خیال سے شدید تکلیف ہو رہی تھی کہ لوگ مجھے اس قبر میں اتار کر چلے جائیں گے۔ اس دکھ نے مجھے خاصا بیدار کر دیا تھا ــــ ایسا نہ ہوتا تو میں دو آدمیوں کی وہ گفتگو کیسے سن سکتا جو میری لاش کے بالکل قریب ہو رہی تھی۔

"ارے یہ ہڈی تو دیکھو ــــ"

"ہوں ــــ دیکھ رہا ہوں ــــ کیا بات ہے؟"

"یہ پنڈلی کی ہڈی معلوم ہوتی ہے ــــ یہ ــــ یہ دیکھو، یہ گھٹنے والا رخ ہے اور یہ دوسرا ٹخنے والا۔"

"ہوں ــــ"

"لیکن درمیان سے اس کی صورت بہت عجیب سی ہے ــــ یہ دیکھو دو جگہ عجیب گٹھلیاں سی بن گئی ہیں۔"

"میرا خیال ہے یہ ہڈی ان دو جگہوں سے ٹوٹ کر جڑی ہو گی۔"

"درست کہتے ہو۔"

"مگر تم کیوں اسے اٹھائے پھر رہے ہو؟"

"ہاں ـــــ واقعی ـــــ میں کیوں اسے اٹھاتے پھر رہا ہوں؟ ـــــ معلوم نہیں کیوں! ـــــ بس ایسے ہی اٹھالی ـــــ ذرا عجیب سی لگی تھی شاید اس لئے ـــــ یہ ہڈی دراصل اسی جگہ سے نکلی ہے جہاں یہ قبر کھودی گئی ہے ـــــ"

"یہ قبرستان ہے بھائی، جہاں انگلی رکھوگے کوئی نہ کوئی ہڈی ہی نکلے گی"۔

"نہ جانے کس کی ہوگی یہ ہڈی؟"

"نہ جانے؟"

مجھے یوں لگا جیسے میں اس سوال کا جواب جانتا ہوں ـــــ میرے باپ نے مجھے بتایا تھا کہ میرے داداجان کو سیر و سفر اور شکار کا شوق جنون کی حد تک تھا اور خطرات کا مقابلہ کرنے میں انہیں بڑا لطف ملتا تھا۔ ایک حادثے میں ان کی دائیں پنڈلی کی ہڈی دو جگہ سے ٹوٹ گئی تھی جو جڑنے کے باوجود تکلیف دیتی رہی۔ موت سے چند ہفتے قبل ان کی بے احتیاطی کی وجہ سے اس پنڈلی میں نئی تکلیف پیدا ہوگئی تھی۔ خون کی روانی رک گئی تھی اور گوشت گلنے لگا تھا۔ ڈاکٹروں نے فیصلہ دیا کہ ٹانگ گھٹنے سے الگ کر دی جاتے۔ داداجان اس پر آمادہ نہیں تھے۔ میں نے بارہا خود کو ان کی صورتحال میں رکھ کر یہ جاننے کی کوشش کی ہے کہ کسی عضو کے جسم سے الگ ہونے کا کیا ردعمل ہو سکتا ہے اور میں سوائے خوف کی ایک جھرجھری کے کچھ محسوس نہیں کر سکا۔ داداجان مجبور ہو گئے۔ اپریشن سے پہلے انہوں نے جو کہا وہ وصیت ثابت ہؤا۔ انہوں نے کہا تھا کہ اگر اپریشن کے دوران یا بعد میں ان کی موت واقع ہو جاتے تو ٹانگ کا کٹا ہؤا حصہ ان کی لاش کے ساتھ ہی دفن کیا جائے ـــــ اور اگر وہ زندہ رہیں تو بھی اس حصے کو ادویات میں محفوظ کر لیا جائے اور جب بھی ان کا انتقال ہو اسے باقی جسم کے ساتھ دفن کیا جائے۔

اپریشن کے بعد ہوش میں آتے ہی داداجان نے اصرار کر کے اپنے جسم کے اس بیجان حصے کو دیکھا۔ اس پر اپنا دایاں ہاتھ پھیرا اور ایک ہچکی لے کر ہمیشہ کے لئے سو گئے ـــــ

اور اب پنڈلی کی یہ ہڈی جسے اپنے باقی جسم کے ساتھ رکھنے پر انہیں اصرار تھا باقی جسم سے

بالکل الگ تھی اور ایک اور شخص اسے ہاتھ میں لئے حیرانی سے دیکھ رہا تھا ـــــ اور مجھے وہ بیوہ عورت یاد آرہی تھی جس کا اکلوتا بچہ مرگیا تھا اور وہ اسے مضبوطی کے ساتھ بازوؤں میں دبا کر بیٹھ گئی تھی اور کہتی تھی کہ مر جاؤں گی لیکن بچے کو جدا نہیں ہونے دوں گی ـــــ وہ مر بھی گئی تھی اور بچہ بھی اس سے جدا کر دیا گیا تھا۔ حالانکہ اگر ان دونوں کو ایک ہی قبر میں دفنا دیا جاتا تو کچھ غلط نہ ہوتا۔ مگر وہ مرگئی تھی اور مرنے کے بعد آدمی اپنے ارادے سے بھی جدا ہو جاتا ہے۔

اب مجھے اس احساس سے عجیب طرح کی بے چینی ہونے لگی تھی کہ مجھے داداجان کی قبر میں اتارا جائے گا۔ زیادہ دکھ اس بات کا تھا کہ یہ قبر داداجان کی تھی لیکن ان کی مٹی کو ہڈیوں سمیت اس سے نکال کر باہر پھینک دیا گیا تھا۔ میں اس قبر میں کبھی نہیں اتر سکتا تھا۔ میں نے چلا کر کہا ـــــ

"یہ ممکن نہیں ہے ـــــ میں اس قبر میں نہیں اتروں گا ـــــ سن رہے ہو لوگو ـــــ میں اس قبر میں نہیں اتروں گا ـــــ میں داداجان کو ان کی آخری آرامگاہ سے محروم نہیں کر سکتا ـــــ یہاں مجھے کبھی نیند نہیں آسکے گی ـــــ میں یہ عذاب برداشت نہیں کر سکتا ـــــ میں مر جاؤں گا لیکن اس قبر میں نہیں اتروں گا!"

میں اپنی پوری قوت سے بول رہا تھا، لیکن لگ رہا تھا کہ میری آواز کسی کے کانوں تک نہیں پہنچ سکی تھی ـــــ اور میں نہ معلوم کتنی دیر تک خود سے سوال جواب کرتا رہا اور سمجھ میں نہ آنے والی اُس بے بسی کے بارے میں سوچتا رہا جس کا میں اسیر تھا۔

جس گھر میں میں رہتا تھا اس میں پہلے میرا باپ رہتا تھا اور اس سے پہلے میرے داداجان رہتے تھے۔ داداجان مرے تو انہیں اس گھر سے نکال دیا گیا۔ پھر یہی سلوک میرے باپ کے ساتھ بھی ہؤا اور ہم نے اسے ایک فطری عمل جانا۔ لیکن یہ صورت میرے لئے نہ معلوم کیوں عذاب کا باعث بن رہی تھی کہ داداجان کو قبر سے نکال کر میرے لئے جگہ بنائی جائے۔ پھر میں گھر اور قبر کی اس مماثلت اور فرق پر غور کرتا رہا اور مجھے کچھ اطمینان سا ہونے لگا۔ میں نے خود کو سمجھایا کہ قبرستانوں میں تو لوگ اسی طرح دفنائے جاتے ہیں پرانی نسلیں نئی نسلوں کے لئے جب تمام

جگہیں چھوڑ جاتی ہیں تو انہیں قبروں پر بھی کیوں قابض رہنے دیا جائے فطرت کا یہی اصول ہے ہر نسل اپنے گھر، میدان، کھیت، کھلیان، باغ، بازار سب کچھ نئی نسل کے لئے خالی کر جاتی ہے اسی طرح انہیں قبریں بھی خالی کرنا پڑتی ہیں۔ اسی لئے ایک ایک قبر میں کتنے ہی لوگ دفن ہوتے ہیں ——— ہاں ——— سنا ہے حشر کے دن ایک ایک قبر سے ایک ہی نام کے ستر ستر آدمی نکلیں گے۔

"ستر ستر! یہ تو محض ایک اشارہ ہے۔ ستر ستر ہزار نکلیں گے"۔

میرے دادا جان کا نام جمیل الرحمٰن تھا۔ وہ میری پیدائش سے چند ماہ پہلے ہی مر گئے تھے میرے باپ نے میرا نام بھی جمیل الرحمٰن رکھ دیا تھا۔ اگر میرا نام یہ نہ ہوتا تو شاید میری زندگی اور موت مختلف ہوتی اور شاید مجھے دادا جان کی قبر میں دفن کرنے کے لئے نہ لایا جاتا ——— شاید میں سکون سے قبر میں اتر سکتا۔

ہوا شاید کچھ تیز چلنے لگی تھی یا کچھ اور سبب تھا کہ میرے پاؤں دھوپ کی تپش کو زیادہ محسوس کرنے لگے تھے۔ لمبے آدمی نے جب میری میت کو کندھا دیا تھا تو میں نے جو شدید جھٹکے محسوس کئے تھے ان سے پاؤں والا بند کھل گیا تھا ——— لمبا آدمی اس کے بعد کہاں گیا ہوگا، مجھے کیا معلوم۔ کاش اسے معلوم ہو سکتا کہ اس نے میری میت کو کندھا دے کر کتنا بیدار کر دیا تھا ——— اب ہوا کے کسی تیز جھونکے سے میرے پاؤں ننگے ہو گئے تھے۔ پاؤں اب ہوا کا ہمدردانہ لمس محسوس کر رہے تھے۔

لگتا تھا پاؤں کی قوت احساس باقی تمام اعضا سے زیادہ ہے اور میرا ذہن بھی پاؤں میں منتقل ہو گیا ہے ——— پاؤں جو اب کفن سے باہر تھے اور باقی جسم سے جدا معلوم ہو رہے تھے! دادا جان کی پنڈلی کٹی تو ان کو کیسا لگا ہوگا، اب مجھے سمجھ آ رہا تھا۔ لگتا تھا کہ سوائے پاؤں کے باقی تمام بدن بے حس ہو گیا ہے عجیب پیچیدہ سا احساس تھا۔ میں نے کئی بار سوچا تھا کہ بچہ جو ماں کے بدن کا حصہ ہوتا ہے اس کے جسم سے الگ ہونا اس کے لئے زندگی کی ضمانت بنتا ہے۔ لیکن جب

جسم کا کوئی اور حصہ الگ ہو جائے تو وہ مر جاتا ہے۔ ماں کو اپنے بدن سے جدا ہونے والا حصہ ہر دوسری شئے یہاں تک کہ خود اپنے وجود سے بھی زیادہ عزیز ہو جاتا ہے۔ اسی طرح جسم کا کٹا ہوا حصہ ہمیشہ یاد رہتا ہے اور بعض اوقات اس کی یاد اتنی شدید، اتنی گہری ہوتی ہے کہ باقی سارا بدن فراموش ہو جاتا ہے ——— اور یہ حقیقت پس منظر میں چلی جاتی ہے کہ اگر یہ حصہ جسم سے الگ نہ کر دیا جاتا تو خود اس شخص کی زندگی خطرے میں پڑ جاتی۔ اب یقین سے کیسے کہا جائے کہ دادا جان کی موت پنڈلی کے زہریلے مواد سے ہوئی تھی یا پنڈلی سے جدائی کے صدمے سے؟

یہ درست ہے کہ مجھے دنیا سے کوئی خاص محبت نہیں تھی۔ لیکن لوگ مجھے میری رضا کے برعکس قبرستان لے آئے تھے۔ انہوں نے مجھے زندگی سے جدا کر دیا تھا۔ حالانکہ مجھے یہ علیحدگی منظور نہیں تھی۔ لیکن میں خود کو دادا جان کی کٹی ہوئی پنڈلی کی طرح بے بس پا رہا تھا۔ میں نے اپنے آپ کو بہت سمجھایا کہ ایک ایک کر کے پوری نسل آنے والوں کے لئے دنیا کو چھوڑ جاتی ہے اور یہی عمل زندگی کے تسلسل کی ضمانت ہے۔ لیکن میری بے چینی میں کوئی کمی واقع نہ ہو سکی۔

وہ لوگ جو مجھے قبرستان تک لائے تھے سب قبر کے آس پاس ادھر اُدھر بکھر گئے تھے صرف دو آدمی میری لاش کے قریب کھڑے تھے۔ اچانک ان میں سے ایک نے نہایت خوفزدہ آواز میں کہا ———

"اوہ ——— دیکھو ——— دیکھو ——— اس کے پاؤں ننگے ہو گئے ہیں!"

"ہیں ——— ہاں ——— بند کھل گیا ہوگا ——— لاؤ پھر سے باندھ دیتے ہیں"۔

میں محسوس کر رہا تھا کہ وہ میری لاش کے بالکل قریب آ گئے ہیں اور میں نے ایک ہاتھ کا لمس بھی اپنے ننگے پاؤں پر محسوس کیا۔ لیکن اگلے ہی لمحے میرے پاؤں کو چھونے والا آدمی پہلے سے بھی زیادہ ڈری ہوئی آواز میں بولا۔

"——— اس کے پاؤں تو گرم ہیں ——— اور ——— اور یہ ہل بھی رہے ہیں"۔

اور وہ دونوں تیزی سے بھاگ گئے۔ نہ معلوم کدھر!

میں نے اس موقع کو غنیمت جانا اور چپکے سے کفن سے باہر نکل کر درخت کے عقب میں واقع ایک ٹوٹی ہوئی قبر میں اتر گیا۔

چند لمحے پہلے دادا جان کی قبر میں اترنے کے خیال ہی سے خوفزدہ تھا لیکن اس قبر میں اترتے ہوئے ذرا بھی نہیں ڈرا۔ میں قبر کے ایک کونے میں یوں دبک گیا کہ کسی کو باہر سے نظر نہ آسکوں۔

کچھ دیر بعد شور سا ہوا۔ بھگدڑ سی مچی اور پھر مکمل خاموشی چھا گئی۔

معلوم نہیں میں وہاں کتنی دیر تک چھپا رہا —— جب مجھے اطمینان ہو گیا کہ رات خاصی گہری ہو گئی ہے تو میں اس قبر سے باہر نکل آیا جو میری پناہ گاہ تھی اور میری زندگی کی ضامن بنی تھی۔ اس قبر نے مجھے ایک اور قبر میں اترنے سے بچا لیا تھا۔

آسمان پر ستارے پوری آب و تاب سے دمک رہے تھے۔ فضا خاموش تھی۔ صرف پتوں کی ہلکی ہلکی سرسراہٹ سنائی دیتی تھی یا جھینگروں کا نغمہ یا کبھی کبھی کسی جانور کے ادھر اُدھر بھاگنے کی آواز —— میں نے ستاروں کی مدھم روشنی میں ماحول پر ایک نظر ڈالی اور سوچا کہ رخصت ہونے سے پہلے ایک نظر اپنے باپ کی قبر کو بھی دیکھ لوں —— اور میں یہ دیکھ کر چند لمحوں کے لئے دم بخود رہ گیا کہ وہ ٹوٹی ہوئی قبر جس نے مجھے پناہ دی تھی وہی میرے باپ کی قبر تھی —— اور اب مجھے معلوم ہو گیا کہ میں اس قبر میں بے کھٹکے اور بلا تامل کیوں اتر گیا تھا۔

میں نے آس پاس سے پتھر جمع کئے اور اس وقت جس حد تک ممکن تھا اس قبر کو درست کیا اور گھر جانے کے لئے اٹھا۔ لیکن جانے سے پہلے میں اس جگہ گیا جہاں مجھے دفنایا جانا تھا میں یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ وہاں ایک تازہ قبر بنی ہے۔ میں نے ادھر اُدھر دیکھا اور دائیں ہاتھ کی شہادت کی انگلی سے قبر کے سرہانے اپنا نام لکھ دیا اور پاؤں کی جانب نرم مٹی پر اپنے پاؤں کے گہرے نشان بنا دیئے۔

میں نے دادا جان کی پنڈلی کی وہ ہڈی تلاش کرنا چاہی جو ان کے جسم سے الگ کر دی گئی تھی۔ لیکن وہ مجھے نہیں ملی۔ ہو سکتا ہے مٹی کے ساتھ وہ ہڈی پھر قبر میں ڈال دی گئی ہو۔ ہو سکتا ہے وہ وہیں کہیں پڑی ہو اور مجھے اس لئے نظر نہ آسکی ہو کہ میں پریشان تھا اور جلد اس جگہ سے نکل جانا چاہتا تھا۔

میں قبرستان کی سرحد پر پہنچا تو اچانک مجھے اپنی عریانی کا احساس ہوا اور بے بسی کا بھی۔ لیکن تاریکی کا لباس میرا سہارا تھا۔ گویا کافی سہارا تھا۔

میں نہیں جانتا میں کس طرح چھپتا چھپاتا اپنے گھر پہنچا اور کیسے اندر داخل ہوا۔ میں نے اندر روشنی نہیں کی اور تاریکی ہی میں لباس تلاش کر کے پہنا اور جو رقم گھر میں موجود تھی وہ جیب میں ڈالی اور گھڑی اور ٹارچ لے کر گھر سے نکل کھڑا ہوا —— میں آج بھی اس خیال سے کانپ جاتا ہوں کہ اس رات اگر کوئی مجھے دیکھ لیتا تو کیا ہوتا۔

(۲)

اب میں اس براعظم میں نہیں رہ سکتا تھا جس نے مجھے مردہ قرار دے دیا تھا —— اور اب مجھے زندگی بھی بے حد عزیز ہو گئی تھی میں اسٹیشن کی طرف بھاگ کھڑا ہوا —— مجھے اس براعظم سے خوف آرہا تھا جس میں میں مر چکا تھا۔

پھر میں وہاں سے بہت دور نکل گیا اور ایک اور براعظم میں پیدا ہوا۔ یہاں میں اب بھی زندہ ہوں۔ یہاں میں کبھی نہیں مروں گا —— یہاں میرے بچے ہیں اور پوتے پوتیاں ہیں —— یہاں میں زندہ رہوں گا —— ہمیشہ —— ہمیشہ!

لیکن میں اپنی موت والی واردات کبھی نہیں بھول سکتا اور یہ بات میں آج تک نہیں سمجھ سکا کہ اگر میں اس براعظم میں زندہ ہوں تو اس شام جس شخص کو اس دوسرے براعظم میں لوگوں نے میرے دادا جان کی قبر میں اتارا تھا، کون تھا؟

عرش صدیقی کی افسانہ نگاری

اے، بی اشرف

عرش صدیقی کا شمار اُردو کے ان چند نامور ادیبوں میں ہوتا جن کا فن کئی پہلوؤں سے امتیازی اہمیت رکھتا ہے۔ وہ شاعر بھی ہیں، نقاد بھی اور افسانہ نگار بھی۔ ادیب اپنے مافی الضمیر کا اظہار کسی بھی پیرائے میں کرے اس کے بنیادی رجحانات اور نظریات ہر شکل اور ہر پیرائے میں منعکس ہوں گے۔ یہ درست ہے کہ وہ کسی خاص تحریک کے رکن کبھی نہیں رہے لیکن ان کے نظریات ایک وسیع پس منظر میں اور وسیع تر معانی کے ساتھ ہر پہلو سے صحت مندانہ ہیں۔ شاعری ہو یا افسانہ نگاری، عام گفتگو ہو یا سنجیدہ تنقید وہ جہاں انفرادی اور اجتماعی زندگی کے مصائب و آلام اور مسائل و مشکلات کا واضح شعور رکھتے ہیں وہاں ایک جاندار عزم کے ساتھ دشواریوں پر قابو پانے، مسائل کو حل کرنے اور زندگی کو رومان کی مصنوعی اور عارضی روشنی سے نکال کر حقیقت کی تلخ لیکن حیات افروز دھوپ میں لا کھڑا کرنے کا گُر جانتے ہیں۔ ان کے اس اندازِ فکر اور اسلوب کے نہایت کامیاب نمونے ہم ان کی تازہ نظموں میں دیکھ چکے ہیں۔ تنقید میں ان کے رجحانات کا مطالعہ نہایت آسانی کے ساتھ فیض احمد فیض اور عارف عبدالمتین پر لکھے ہوئے مضامین میں

کیا جا سکتا ہے۔ انہی وسیع تر معانی میں ان کے انسان دوستی کے صحت مند نظریات کا مطالعہ ان کے افسانوں کے ذریعے بھی ہو سکتا ہے۔ اس وقت ان کی علمی اور ادبی حیثیت کا یہ تیسرا پہلو میرے پیش نظر ہے۔

یہ بات کہنے کی ضرورت تو نہیں اور خود عرش صدیقی اپنے لئے بات کے اس انداز کو پسند بھی نہیں کرتے لیکن میں آغاز میں یہ کہنا ضروری سمجھتا ہوں کہ عرش صدیقی اُردو کے بالعموم اور اس کے دور کے بالخصوص اہم ترین افسانہ نگاروں میں سے ایک ہیں۔ یہ کہنے کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ انہوں نے جس تواتر کے ساتھ شاعری کی ہے اس تواتر کے ساتھ افسانہ نگاری نہیں کی۔ اور ان کی افسانہ نگاری کے قاری شاعری کے قارئین سے اسی لئے مقابلتہً کم ہیں۔ سرسری قسم کے سالانہ جائزوں میں جو فہرستیں آئے دن نظر آتی ہیں ان میں سے اکثر میں ان کے نام کی غیر حاضری کا سبب یہی ہے۔ (گو ان کے ذاتی محکمہ تعلقات عامہ کی کمزوری بھی ایک بڑی وجہ ہے)۔ یوں تو ان کی افسانہ نگاری کا آغاز بہت پہلے ہو چکا تھا لیکن ان کا پہلا بڑا اور اہم افسانہ "کتے" ۱۹۶۱ء میں "نقوش" میں شائع ہوا تھا۔ یہ افسانہ دراصل ۱۹۶۰ء کی تخلیق ہے لیکن اس کی اشاعت ۱۹۶۱ء میں ہوئی۔ ان کا دوسرا اہم افسانہ "فرشتہ" بھی کوئی دو برس بعد "نقوش" ہی میں چھپا تھا۔ ان کے افسانوں کے پہلے مجموعے "باہر کفن سے پاؤں" میں صرف نو افسانے شامل ہیں اور یہ مجموعہ اس سال یعنی ۱۹۷۸ء میں چھپا ہے اور "باہر کفن سے پاؤں" کے بعد انہوں نے ابھی تک اور کوئی افسانہ تخلیق نہیں کیا۔ یعنی کئی کئی برس بعد ہمیں ان کا افسانہ پڑھنے کو ملتا ہے۔ اٹھارہ سال کے عرصہ اور ۵۰ برس کی عمر میں انہوں نے ہمیں کل نو افسانے دیئے ہیں۔ تعداد کے لحاظ سے یہ صورت حال حوصلہ افزا نہیں۔ خود انہیں اس کا نقصان یہ ہوتا رہا ہے کہ جب تک ان کا نیا افسانہ چھپے لوگ پرانے افسانوں کو بڑی حد تک بھول چکے ہوتے ہیں۔ شہرت کے لیے عام حالات میں متواتر اور تسلسل کے ساتھ لوگوں کے سامنے آتے رہنا ضروری ہے لیکن عرش صدیقی

اس پہلو کو اہمیت نہیں دیتے اور میں اسے ان کی غلطی قرار دیتا ہوں۔

عرش صدیقی نے ہمیں تعداد میں بہت کم افسانے دیئے ہیں لیکن خوشی اس بات کی ہے کہ یہ تمام افسانے اُردو ادب کے اعلیٰ ترین افسانوں میں شمار کئے جانے کے قابل ہیں۔ جب ۱۹۶۱ء میں "کتے" شائع ہوا تھا تو اس کی پذیرائی کھلے دل سے کی گئی تھی۔ جابر علی سید کی اس رائے سے آج بھی اختلاف نہیں کیا جا سکتا کہ یہ افسانہ اُردو ادب کے بہترین افسانوں کے ہر انتخاب میں جگہ پانے کے لائق ہے۔ عرش صدیقی نے جو معیار "کتے" میں قائم کیا تھا نہ صرف یہ کہ انہوں نے اسے قائم رکھا بلکہ وہ اس سے بھی آگے بڑھتے رہے اور اسلوب اور تکنیک کے ایسے تجربے بھی کرتے رہے جن سے ایک طرف خود ان کے ہاں تنوع پیدا ہوا اور دوسری طرف اُردو افسانہ نگاری پر لگائے ہوئے "باسی پن"، "بانجھ پن" اور "جمود" ایسے الزامات بے معنی نظر آنے لگے۔ چنانچہ یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ تعداد میں کم سہی لیکن قدر و قیمت کے اعتبار سے یہ افسانے جدید افسانوی ادب کا قابل قدر سرمایہ ہیں۔ بالکل اس طرح جس طرح حسن عسکری کے افسانے تعداد میں کم ہیں لیکن ان کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔

عرش صدیقی کے افسانوں پر لکھے جانے والے مضامین کی تعداد کی کمی کے لیے بھی یہی جواز پیش کیا جا سکتا ہے تاہم ڈاکٹر وحید قریشی، افتخار جالب اور نذیر احمد کے مضامین (مطبوعہ اوراق، مساوات اور نئی قدریں) ان کے افسانوں کی قدر و قیمت کی واضح طور پر نشاندہی کرتے نظر آتے ہیں۔

عرش صدیقی کے افسانوں کے مزاج کا تعین کرتے وقت ان کی شخصیت کے خلوص، طبعی شرافت، اور حوصلے کو اس لئے پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ یہ سب ان کے فن کا بھی ناگزیر حصہ ہیں۔ ان عناصر کے طفیل ہی ان کے ہاں موضوع، فن اور اسلوب میں ایک ایسے توانا رویے کی تخلیق ہوتی ہے جو لامرکزیت اور عدم تحفظ کے اس ماحول میں اعتماد اور تحفظ حیات

کی فضا کو جنم دیتا ہے۔

(۲)

عرش صدیقی کو مختصر افسانے کی ایک وسیع روایت ملی ہے۔

پریم چند سے لے کر عرش صدیقی تک مختصر افسانے کے سفر کی کہانی دراصل اس فن کے ارتقائی منازل اور ادوار کی کہانی ہے۔ حقیقت نگاری سے علامت نگاری تک کہانی کے فن نے جو مسافتیں اور منزلیں طے کی ہیں اس کی داستان دلچسپ بھی ہے اور عرش صدیقی کی افسانہ نگاری کے مطالعے کے ضمن میں اہم بھی۔ اس لئے کہ عرش صدیقی کا فن افسانہ نگاری جہاں قدیم و جدید کا ایک حسین امتزاج پیش کرتا ہے وہاں تکنیک کے نئے راستے بھی تلاش کرتا ہے۔ ان کے یہاں صحت مند روایات کا رچاؤ بھی موجود ہے اور جدید ترین تحریکوں کے اثرات بھی ان کے فن میں بھرپور انداز میں پائے جاتے ہیں۔ جہاں ایک طرف ان کی کہانیوں میں حقیقت پسندی اور واقعیت نگاری کے عناصر ملتے ہیں وہاں دوسری طرف ان میں وجودیت اور علامتیت کی تحریکوں کے اثرات بھی نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔ جہاں ایک طرف ان کے یہاں قدیم معاشرت سے ابھرنے والے کردار اپنے مکمل تہذیبی تناظر کے ساتھ چلتے پھرتے دکھائی دیتے ہیں۔ وہاں دوسری طرف ذات کے آشوب اور کرب کا شکار جدید انسان بھی اپنے زمانے کے پس منظر سے ابھرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ معاشرتِ قدیم کے تیکھے نقوش جہاں ایک طرف ان کی کہانیوں میں نمایاں ہوتے اور مانوس فضا اور ماحول کو اجاگر کرتے دکھائی دیتے ہیں وہاں دوسری طرف جدید دور کی بے یقینی کی فضا دھواں چھوڑتی اور ماحول کو دھندلاتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔

پریم چند سیدھی سادی کہانی لکھنے والے افسانہ نگار تھے۔ انہوں نے اپنے دور کے نظام کی ناہمواریوں کو اپنی کہانیوں کا موضوع بنایا لیکن ان کی ایک کہانی "کفن" ان

سے فن کا ایک ایسا موڑ ثابت ہوئی جہاں سے افسانہ نگاری کی ایک پوری روایت نے جنم لیا۔ "انگارے" اور "شعلے" کی کہانیوں پر "کفن" کے اثرات واضح طور پر موجود ہیں۔ اسی دور میں حقیقت پسندی کی اس روایت کے متوازی سجاد حیدر یلدرم، نیاز فتح پوری، قاضی عبدالغفار، حجاب اور کئی دوسرے افسانہ نگاروں نے رومانوی تحریک کے اثرات قبول کئے اور ایسی کہانیاں تخلیق کیں جن میں زمین کی بُو باس سے زیادہ اَن جانی دنیاؤں کے مناظر تھے۔ خالص ادب کے نقطہ نظر سے اس دور کے افسانہ نگاروں کی نگارشات وقیع ہوں تو ہوں لیکن ان کے دیرپا اثرات مرتب نہ ہو سکے۔ البتہ پریم چند کی قائم کردہ حقیقت پسندی کی روایت آگے بڑھی پھلی پھولی اور ترقی پسند تحریک کی پیش رو بن گئی۔ ترقی پسند تحریک کے زیر اثر مختصر افسانے نے بہت زیادہ اہمیت پائی اور اس میں شک نہیں کہ ترقی پسند افسانہ اردو کی دیگر تمام اصناف کو پیچھے چھوڑ گیا اس دور کے افسانہ نگاروں نے سماج اور اس کے پیداداری رشتوں کو زیادہ اہمیت دی اور ان کی کہانیوں میں سامنے کی زندگی کے مسائل کو موضوع بنایا گیا۔ بعض افسانہ نگاروں نے فنی نزاکتوں کو نظر انداز کر کے انتہا پسندی کا ثبوت دیا لیکن بحیثیت مجموعی اس دور کا افسانہ معیاری ہے۔

پھر جدید دور اپنے تمام تر کمپلکسز، پیچ در پیچ ذہنی رویے اور الجھاؤ لے کر ابھرا۔ تمام دُنیا میں مشینی نظام کی طاقت، لامحدود صنعتی ترقی، مختلف سیاسی نظاموں کی آمرانہ روش، ایک محدود طبقے کے ہاتھوں اکثریت کا استحصال، گوناگوں اقتصادی، عمرانی اور سیاسی مسائل نے سماج کی ہیئت بدل کر رکھ دی، سرمایہ دارانہ صنعتی نظام نے قسطائیت کے عذاب کو جنم دیا۔ تو آزاد اور پسماندہ ممالک کو اقتصادی غلامی کا پابند بنایا گیا۔ قومی و نسلی امتیاز، طبقاتی کشمکش، اقتصادی لوٹ کھسوٹ، آزادانہ مسابقت کی وحشیانہ دوڑ، خود غرضی، زرپرستی سیاسی اقتدار کی ہوس اور ذخیرہ اندوزی اس نظام کی دین ہے۔

استحصال اور تخریب کی اس بے پناہ یلغار نے انسانی ذہن کو ایک ایسے وسیع بحران کا شکار کر دیا کہ زندگی کی ساری مروجہ اقدار پر سے اس کا ایمان اٹھنے لگا۔ وہ خود کو اس بھری پُری دنیا میں تنہا محسوس کرنے لگا۔ خارجی ماحول بھیانک بن گیا۔ اب ترقی پسندوں کے خارجی رویوں کے برعکس داخلیت کی رَو اُبھری اور ادیب اندر کی دنیا میں سفر کرنے لگے۔ سیدھے سادے بیانیہ افسانے کی جگہ علامتی اور تجریدی افسانے نے لے لی۔ نظام کی تبدیلی کے علاوہ علامتی تحریک کی اور بھی کچھ وجوہات ہیں۔ سب سے پہلے تو یہ ترقی پسند تحریک کے ردعمل کے طور پر ظاہر ہوئی۔ ترقی پسند تحریک نے ہر صنف ادب میں واضح اور غیر مبہم اسلوب اختیار کیا تھا، کیونکہ اس نے فن کو فن کے لیے نہیں بلکہ مقصد کے حصول کا ذریعہ بنایا تھا، اور یہ مقصد انقلابی نظریات کی تبلیغ تھا۔ لیکن جب ترقی پسند تحریک پر کڑا پہرہ لگایا گیا اور ادھر اردو ادب میں اس کا ردعمل شروع ہوا تو اچانک یہ وضاحتی اور غیر مبہم انداز ترک کر دیا گیا۔ اور اس کی جگہ علامتی طرز انداز کو اپنایا گیا۔

پھر ہمارے ملک میں بار بار ایسی حکومتیں آتی رہیں جن کے آمرانہ نظام کی بدولت تحریر و تقریر پر ناروا پابندیاں عائد ہوتی رہیں۔ اظہار و ابلاغ کے ذرائع محدود ہوئے تو علامتیت کی تحریک نے زور پکڑا۔ یورپ کی علامتی تحریک اگرچہ بہت پہلے شروع ہوئی تھی لیکن اس کے اثرات یہاں بہت دیر سے پہنچے اور اس لیے اردو علامتی افسانے کی عمر بیس پچیس سال سے زیادہ نہیں ہے۔

ادھر فرائڈ، ینگ، اور اڈلر وغیرہ کے نظریات نے جس شعور کو عام کیا اس سے افسانے نے بھی استفادہ کیا۔ پریم چند کو افسانے کے فن کا بہت محدود کینوس ملا البتہ انہوں نے موضوعات کے تنوع سے اس کینوس کو وسیع کیا لیکن آج کے افسانہ نگار کو نہ صرف کمپلیکس زندگی موضوع کے طور پر ملی ہے بلکہ اسے فنی تجربات کی وسیع و عریض دنیا بھی ورثے میں ملی ہے اس لیے آج کے افسانہ نگار کی نظر زیادہ وسیع اور تجربہ زیادہ عمیق ہے۔ عرش صدیقی

کے یہاں نہ صرف موضوع کا تنوع اور رنگارنگی ہے بلکہ تکنیک کے تجربے بھی ہیں۔ ذات کی شکست و ریخت کا مسئلہ، معاشرے کی بدلتی ہوئی اقدار کی کہانی، سماجی اور سیاسی ہیئت کی تبدیلی، گھریلو زندگی کی بدلتی ہوئی حالت، خارجی زندگی کی بے سکونی، جنسی جبر کے بے لگام نتائج اور سب سے بڑھ کر اجتماعی لاشعور کے اثرات افراد کے رویوں پر —— یہ سب کچھ ان کے افسانوں کا موضوع ہے۔ پھر انہوں نے مختلف افسانوں میں مختلف تکنیک استعمال کی ہے۔ "چوتھا مجوسی"، "باہر کفن سے پاؤں"، "بھیڑیں"، "نور کے پاؤں"، "ہم نشینی کا عذاب" اور "کتے" وغیرہ علامتی افسانے ہیں۔ "ظل الٰہی" اور "کتے" میں واقعات FLASH-BACK کی طرح چمکتے اور تاریکیوں میں ڈوبتے ابھرتے دکھائی دیتے ہیں۔ یہ افسانے فینٹسی کی خصوصیت لیے ہوئے ہیں۔ تکمیل کا زخم ڈرامائی عناصر سے بھرپور ہے۔ جس کا کلائمکس آخر میں آتا ہے —— "فرشتہ" طویل مختصر افسانہ ہے ایک ناول کا سا کینوس رکھنے والا —— دلچسپی سے بھرپور۔ خواب و خیال میں واقعات کے رونما ہونے کی تکنیک "کتے" اور "ظل الٰہی" میں ملتی ہے اور "ہم نشینی کا عذاب" اور "کتے" نفسیاتی ٹریٹ منٹ کے افسانے ہیں۔ نفسیات کا حوالہ عرش صدیقی کے رویے اور اسلوب کا مستقل حصہ ہے لیکن ان دو افسانوں میں یہ حوالہ خصوصی اہمیت رکھتا ہے۔ عرش صدیقی کے اسلوب میں محض نفسیات یا محض جدلیات یا محض واقعہ نگاری یا محض حقیقت نگاری کا انداز نہیں۔ ان کا اسلوب مرکب ہے اور ان کے افسانوں کی مکمل تفہیم کے لیے کئی زاویوں سے ان کا مطالعہ کرنا ضروری ہے۔ ایک مستحسن بات یہ ہے کہ مرکب نظریات کے حامل ہونے کے باوجود ان افسانوں کے تفہیم میں خاص دشواری پیش نہیں آتی اور نہ ہی ان کا افسانوی حسن مجروح ہوتا ہے بلکہ ان کی ہر کہانی میں فن کی تازگی کا احساس پہلے سے زیادہ نمایاں ہوتا نظر آتا ہے۔

جیسا کہ ابھی کہا گیا ہے عرش صدیقی کے افسانوں میں نہ صرف موضوعات کا تنوع

ملتا ہے بلکہ ٹیکنیک کے تجربے اور رنگا رنگی بھی پائی جاتی ہے ان میں وسعت اور گہرائی ہے یہ افسانے موضوع سے خلوص، معاشرت اور سماجی رویوں سے بھرپور واقفیت نفسیاتِ انسانی سے مکمل شناسائی، فنی شعور کی پختگی، زبان و بیان کے تہذیبی رچاؤ اور جدید تحریکوں کے مطالعے سے ابھرنے والے تجربات کا نمونہ ہیں۔ عرش صدیقی کے یہاں سائنسی دور میں بدلتے ہوئے انسانی روابط اور معاشرتی رویوں کا شعور بہت گہرا ہے وہ ان تبدیلیوں پر جھنجلاتے نہیں۔ یہ تبدیلیاں یا ماضی کی ٹوٹتی ہوئی اقدار ان کے اعصاب پر اس طرح سوار نہیں ہوتیں جیسے انتظار حسین کے دل و دماغ کا حصہ بن کر ان کی کہانیوں میں اعصابیت اور گریاں ماضی پرستی کی کیفیت پیدا کر دیتی ہیں۔ عرش کے یہاں ٹوٹنے کا نوحہ نہیں جوڑنے کی سعی ملتی ہے۔ اور اس عمل کا مرکز ماضی نہیں حال ہے یا حال کے حوالے سے مستقبل۔

(۳)

"بھیڑیں" کا موضوع معاشرتی زوال ہے اس کا باعث کتنی ہی چیزیں ہیں ناہموار معاشی اقدار، اخلاقی پستی، عدم تحفظ کا احساس، بے یقینی کی فضا، زندگی کی بے مقصدی اور بے وقعتی ——— !! یہ افسانہ جمیل کی بے حسی اور زوال آمادگی کا مسئلہ نہیں۔ پوری سوسائٹی کی بے حسی اور زوال آمادگی کا مسئلہ ہے۔ قصور شکیلہ کا ہے نہ کلیم طوری کا اور نہ شکوہ کی خودغرض اور استحصال پسند شخصیت کا یہ استحصال ہر وہ شخص روا رکھتا ہے، جو استحصال کرنے کا حوصلہ پیدا کر سکتا ہے۔ شکیلہ، شکوہ، کلیم اور جمیل سب میں یہ حوصلہ پیدا ہوتا ہے، کیونکہ یہ حوصلہ معاشرہ ہر فرد کو مہیا کرتا ہے کسی کو جلد کسی کو دیر سے۔ وہ ایسے حالات پیدا کرتا ہے جو خود بخود اس حوصلے کو جنم دیتے ہیں۔ پھر شکوہ اور جمیل میں کوئی فرق نہیں رہتا:

"اس شام نے تمام امتیازات ختم کر دیئے ہیں۔ شکوہ، شکیلہ، کلیم اور ——— ان کا مالک مکان جمیل ——— ان میں اب کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ سب ایک ہی راستے پر رواں ہیں۔ ان کے سفر کی نوعیت ایک ہی ہے ——— وہ سب ایک سے ہیں صرف نام مختلف ہیں !!"[۱] (بھیڑیں)

افتخار جالب نے عرش صدیقی کے اس افسانے پر بحث کرتے ہوئے غلط نہیں کہا کہ مسابقت کے معاشرے میں انڈسٹریل کمپلکس اور ڈیپارٹمنٹل سٹور کے امیج پر استوار ہونے والا تصور خودغرضی، اخلاق باختگی اور عدم وابستگی کو پیدا کرتا ہے[۱]۔

"اس معاشرے میں ہم سب بھیڑیں ہیں۔ وجود کے شوروم میں معصوم چہرے سجائے اپنی اپنی قیمت لگوانے کی فکر میں ——— بدن کی لمبی لمبی سفید ملائم اُون کا سودا کرنا چاہتے ہیں، لیکن اچھے گاہک کی تلاش ہے۔ ہم سب کی ایک قیمت ہے۔ آگے پیچھے سب بک جاتے ہیں۔ ہم ساری اُون منڈوا لینا چاہتے ہیں۔ ننگا ہونے کو عار نہیں سمجھتے۔ ہم سب ایک گلے کی بھیڑیں ہیں:

اب میں بھیڑوں کے ایک بڑے سے گلے میں ایک بھیڑ تھا۔ گلے کے آگے کی بھیڑیں جدھر جائیں گی دوسری بھیڑیں ادھر جانے پر مجبور ہوتی ہیں ——— میں اب ہجوم کی قوت ارادی کا اسیر تھا۔ سارا ہجوم منہ اٹھائے اسٹیج کی طرف بڑھ رہا تھا۔ میں بھی ساتھ تھا۔" (بھیڑیں)

یہ دراصل آج کے انسان کی ذات کی ٹوٹ پھوٹ کا مسئلہ ہے۔ تشخص کے گم ہو جانے کا کرب ہے۔ ذات کا شیرازہ بکھر چکا ہے۔ ہجوم میں مل کر اس کا حلیہ بدل چکا ہے۔ اس کی پہچان نہیں رہی۔ سب ہم رنگ چہرے ہیں۔ آگے والے جو کرتے ہیں، ہم ان کے پیچھے پیچھے سر جھکائے چلے جاتے ہیں۔ پھر صنعتی اور مشینی دور نے یکسانیت کا جو زہر گھولا ہے اس سے ہم سب کے حلق تر ہیں۔

بات یہ ہے کہ دو جنگوں کے بعد پوری دنیا کا انسان عدم تحفظ کا شکار رہا۔ مہلک

[۱] ادبی مسائل ——— مساوات لاہور، ۲۷ ستمبر ۱۹۷۰ء

ہتھیاروں اور خطرناک بموں کی ایجاد نے حیاتِ انسانی کی ارزانی کا تصور عام کیا۔ میکانکی نوعیت کی تعقل پسندی، افراد اور اقوام کی کریز بن گئی۔ جذبے اور تخلیق کے سوتے اگر خشک نہیں ہوتے تو ان کا رُخ بدل گیا۔ زندگی کے جذباتی رویوں کو سائنٹیفک سوچ کی بھینٹ چڑھایا جانے لگا۔ پھر جنگوں نے ساری دنیا میں اقتصادی بحران پیدا کیا۔ طبقات کی باہمی آویزش ابھر کر سامنے آئی۔ مراعات یافتہ طبقے نے اکثریت کی زندگانی کی رہی سہی اُمید بھی ان سے چھین لی۔ اجتماعیت کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ خارج کی دُنیا اتنی بھیانک اور پُر دہشت نظر آنے لگی کہ انسان نے ذات کے متلاطم سمندر میں چھلانگ لگادی۔ یہی صورت حال منگولوں کی تباہ کاریوں کے وقت پیش آئی تھی تو تصوّف نے زور پکڑا تھا۔ ادیبوں نے داخل کی دُنیا کا سفر شروع کیا تھا۔ یہی صورت حال جدید دور میں عالمگیر سطح پر نمایاں ہوئی تو وجوّدیت کے نظریے نے مقبولیت حاصل کی۔ وجوّدیت کے نظریے نے یہ باور کرادیا کہ ذات کا داخلی رویہ خارجی اشیاء کی ماہیئت تک کو بدل سکتا ہے:

"... مگر یہ کیوں ہے کہ اپنے کمرے میں آکر مجھے اپنا رشتہ باہر کی دنیا سے استوار معلوم ہوتا ہے مجھے تو اس رشتے کا احساس ہی کمرے میں داخل ہونے کے بعد ہوتا ہے میں باہر کی دُنیا کو صرف اسی وقت دیکھ سکتا ہوں جب میں اپنے کمرے میں ہوتا ہوں"۔ ——— (ہم نشینی کا عذاب)

گویا ذات کے حوالے سے کائنات کے امکانات کا انکشاف کیا جاسکتا ہے عرفان کی اہمیت کا یہ تصور کیرک گارڈ، نطشے، ڈیکارٹ، دوستوفسکی، کافکا اور سب سے بڑھ کر سارتر کے یہاں دکھائی دیتا ہے۔ اقبال کا نظریہ خودی وجودیت کی بہترین مثال ہے کیونکہ عرفان ذات کا تصور وجودیت کا بنیادی تصور ہے۔

اس قدیم نظریے نے، جس کو جرمن اور فرانسیسی وجودیوں نے نیا آہنگ عطا

کیا۔ جدید دنیا پر اپنے اثرات مرتب کیے۔ ادیبوں نے ذات کی اہمیت اور انانیّت کے تصور کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا۔ عرش صدیقی کے یہاں بھی وجودیت کا واضح تصور ملتا ہے۔ "بھیڑیں" "ہم نشینی کا عذاب" "کتے" "چوتھا مجوسی" وغیرہ اس کی مثالیں پیش کرتے ہیں۔

(وجودیت پر عرش صدیقی کا مضمون مطبوعہ اوراق ملاحظہ کیجیے۔)

یہ بات کسی تبصرے کے بغیر واضح ہے کہ جب پرومیتھس نے آسمان سے آگ چرائی تو گویا اس نے اپنے وجود کی آزادی حاصل کرلی۔ اپنی تقدیر کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اس دنیا میں تمدّن کی بنیاد ڈال کر اپنی زندگی اور موت پر سے دیوتاؤں کا اقتدار ختم کردیا۔ اس وقت دنیا میں وجودیت کا آغاز ہوا —— گویا وجودیت انسانی اقتدار کی کہانی ہے۔ ذات کے اندر چھپے ہوئے امکانات کی کہانی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ وجودیت کے فلسفے نے جہاں ایک طرف انسانی عظمت کو اجاگر کیا۔ انسان کو عدم تحفظ کے احساس سے نجات دلاکر خود اعتمادی کے ساتھ آگے بڑھنے کا حوصلہ عطا کیا یہاں تک کہ فرد کو کائنات کا درجہ دیا وہاں دوسری طرف اس نظریے نے انسان کی اجتماعی حیثیت کو بھی متاثر کیا۔ سماجی روابط کو منقطع کیا فرد تنہا ہوگیا۔ اجتماعی تقاضوں سے خوفزدہ —— بھیڑ میں گم ہونے کا اندیشہ، سمندر میں ضم ہونے کا خوف۔ اس رجحان کی تفصیل "بھیڑیں" اور "ہم نشینی کا عذاب" میں ملاحظہ کی جا سکتی ہے:

"میں بڑے اعتماد سے اپنی نشست کی جانب بڑھا۔ لیکن میرا یہ اعتماد اس خوف کا غماز تھا جو میں اس ہجوم سے محسوس کر رہا تھا۔ مجھے اکثر یوں لگتا ہے کہ ہجوم مجھے کھا جائے گا۔ میں ہجوم کی طرف بڑھتا ہوں تو محسوس کرتا ہوں جیسے قطرہ سمندر میں دفن ہونے جا رہا ہے۔ زندہ دفن ہونے کا خوف —— یہ بڑا سخت خوف ہے"! (بھیڑیں)

دراصل یہ خوف ذات کے ہجوم میں گم ہو جانے کا خوف ہے۔ تشخص کے مٹنے کا خوف ہے۔ اور خود اعتمادی کے فقدان کا خوف ہے۔ بقول افتخار جالب:

"۔۔۔۔ عرش صدیقی کے لیے خود اعتمادی ایک مسئلے کے طور پر ابھرتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہجوم اور بھیڑ میں گم ہو جانے کا وسوسہ بھی پیدا ہوتا ہے اگر نفی اور تردید کا شعور بھی پیداواری ذرائع کے میدان میں پیدا ہوتا اور اس کی ساخت وہی ہوتی جو ذرائع پیداوار کی اجارہ داری ختم کرنے والی قوتوں کی ہے تو زندہ دفن ہونے کا احساس، ہجوم میں گمشدگی کا خطرہ، بھیڑوں کے گلے کی مشابہت ایسے تصورات وجود میں ہی نہ آتے۔ کیونکہ اجارہ داریوں سے جنگ کرنے والی قوتوں کی ہیئت اجتماعی ہے۔ اجتماعی ہیئت کا شعور اس امر کا ضامن ہے کہ ذات یکتائی نہیں اکثریت ہے۔"[1]

لیکن یہاں صورت حال مختلف ہے۔ یہاں آزاد مسابقت کا معاشرہ ہے جہاں ذرائع پیداوار پر اجارہ داری ہے۔ طبقاتی معاشرے میں ہیئت اجتماعی کا تصور ہی پیدا نہیں ہوتا اس لیے فرد تنہا ہے اسے اجتماع میں نہیں ذات کے محشرستان میں روشنی ملتی ہے۔ خارج کی دنیا اتنی تلخ، بھیانک اور الجھی ہوئی ہے کہ آنکھیں باہر کی طرف دیکھنے کی متحمل نہیں ہو سکتیں۔ اس زہر کو پلکوں سے چننا ممکن نہیں ہے۔ اب آنکھیں بند کر لینے ہی میں نجات ہے۔

"آنکھیں بند ہوئیں تو مجھے روشنی مل گئی۔ یہ بڑی عجیب بات ہے کہ بہت سی چیزیں ہم کھلی آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتے ہیں یہ چیزیں آنکھیں بند کرنے پر ہی نظر آتی ہیں۔ روشنی کا کام دکھانا ہے۔ لیکن بعض چیزیں صرف تاریکی ہی میں دکھائی دیتی ہیں۔" (بھیڑیں)

۱۔ ادبی مسائل —— از افتخار جالب۔ مساوات لاہور، ۲۰ ستمبر ۱۹۷۰ء

غالب نے کہا تھا۔

اپنی ہستی ہی سے ہو جو کچھ ہو
آگہی گر نہیں غفلت ہی سہی

دراصل عرش صدیقی کا مسئلہ بھی یہی ہے کہ فرد کی ذات ہی روشنیوں کا جزیرہ ہے اور معاشرے کو اس جزیرے سے روشنی کی ترسیل ہو سکتی ہے۔ اس جزیرے تک رسائی کے لئے نفس کی انڈر گراؤنڈ ٹیوبز میں سفر کرنا پڑتا ہے اندر کا سفر دراصل ٹیوبز کا سفر ہے جس میں انسان کھلے آسمان کے لئے ترس جاتا ہے اور پھر پلاسٹک کے سفری مکان لے کر ساحل پر دن رات پڑا رہتا ہے۔ اپنے آپ کو جوڑنے کی کوشش میں —— ! عرش کے یہاں یہ کوشش ذات کے حوالے سے دکھائی دیتی ہے۔ کیونکہ انسان اپنی ذات کے حوالے ہی سے خارج پر نگاہ ڈالتا ہے۔ ذات اور خارج کا ربط داخلی رویوں کا مرہون منت ہوتا ہے۔ خارج سے روابط کی نوعیت کا تعین ہماری ذات کے رویوں سے ہوتا ہے۔ یہ تصور وجودیت کا پیدا کردہ ہے۔ عرش صدیقی کے یہاں یہ رویہ موجود ہے۔ 'بھیڑیں' کے علاوہ 'ہم نشینی کا عذاب' میں اس کی مثال ملتی ہے!

"دروازہ عرف عام میں باب آزادی کہلاتا ہے لیکن میں دروازے سے ڈرتا ہوں اور باہر کی دنیا سے بھاگ کر اپنے کمرے میں آجاتا ہوں۔ تو کیا میں آزادی سے ڈرتا ہوں؟ میں تو مسلسل آزادی کی تلاش ہی میں سرگرداں رہتا ہوں اور باہر سے اندر کی طرف آزادی کی تلاش ہی میں رجوع کرتا ہوں۔ جب میں اپنے ارد گرد گھٹن محسوس کرتا ہوں تو اپنے اندر چھپ کر بیٹھ جاتا ہوں اور خود کو آزاد محسوس کرنے لگتا ہوں۔"

اس کا سبب خود عرش صدیقی کے قلم سے سنیئے:

"—— میرے لیے باہر کی دنیا کے ضابطے اور پابندیوں کے جال اور

افراتفری کا عالم وجہ آزار ہیں۔ میں تو بالکل آزاد رہنا چاہتا ہوں۔ اور اسی لیے عشق تک کا قائل نہیں ہوں کیونکہ جیسا کہ کسی نے کہا ہے عشق اپنی بقاء کے لئے متعلقہ فرد کی آزادی کو اپنی خوراک بنالیتا ہے اور زندہ رہتا ہے۔" (ہم نشینی کا عذاب)

دراصل موجودہ دور کی ناراض نسل آزادی چاہتی ہے۔ پابندیوں اور ناروا ضابطوں میں وہ خود کو کھو چکی ہے۔ وہ اپنے آپ کو تلاش کرتی ہے، اور نہیں پاسکتی۔ اپنے آپ کو پہچاننا چاہتی ہے پہچان نہیں سکتی۔ شناخت ختم ہو چکی ہے:

"آنکھوں والو! میں گم ہو گیا ہوں۔ کیا تم نے مجھے کہیں دیکھا ہے؟ میں اپنی تلاش میں نکلا ہوں میری مدد کرو" (ہم نشینی کا عذاب)

لیکن گمشدگی کا یہ احساس اس وقت ہوتا ہے جب فرد ذات کے رنگ محل سے باہر ہو۔ اسی وقت اس کا دریافت ہونا مشکل ہو جاتا ہے لیکن

"..... کمرے میں بیٹھے ہوئے تو یوں محسوس کرتا ہوں کہ میں نے خود کو ہی نہیں ساری دنیا کو پالیا ہے۔ یہ کمرہ جیسے کسی روح کا ہاتھ ہے جو مجھے اشیا کے ڈھیر سے جس میں میں گم ہو جاتا ہوں، ڈھونڈ نکالتا ہے۔"

(ہم نشینی کا عذاب)

سبب یہ ہے کہ

"زندگی کے سمندر کے سامنے میں ایک قطرہ ہوں اور اگر دنیا صحرا ہے تو میں ایک ذرۂ ریگ ہوں۔ میں قطرے کو سمندر سے اور ذرے کو ریگستان سے الگ رکھنا چاہتا ہوں۔ کیونکہ جب تک قطرہ سمندر سے اور ذرہ ریگستان سے الگ ہے اس کی اپنی ہستی کا طلسمات قائم ہے۔ سمندر قطرے کو کھا جاتا ہے اور صحرا ذرے کو ——————— یہ صورت حال احساس کے لئے عذاب کی صورتحال ہے اس لئے میں اس

صورتِ حال سے ڈرتا ہوں"۔[1]

"ہم نشینی کا عذاب" علامتی افسانہ ہے جس میں وجودیت کے عناصر بھرپور انداز میں موجود ہیں۔ تین دوست ایک ہی لڑکی کی طرف مائل ہیں لیکن تینوں کا رویہ اس کے بارے میں مختلف ہے۔ صادق آئیڈیل محبت کا قائل ہے جس میں جنس اور قربت کو دخل نہیں۔ صادق جنس کو بدصورتی تصور کرتا ہے۔ سوناجب خود سپردگی کے عالم میں اس کے پاس کمرے میں ہے تو وہ اسے حسین دکھائی نہیں دیتی حالانکہ اسے فاصلے سے اتنی ہی دلآویز دکھائی دیتی تھی۔ دراصل چیزیں قریب آکر صادق کے لئے بے معنی اور باعث عذاب ہو جاتی ہیں۔ یہ جمالیاتی مسئلہ ہے۔ معروض فاصلے ہی سے زیادہ حسین دکھائی دیتا ہے۔ کشش طلب ہی میں ہے نہ کہ وصل میں۔ قرب طلسم کو توڑ دیتا ہے۔ فاصلوں سے چیزوں کو دیکھنے والا صادق کبھی کبھی محسوس کرتا ہے کہ

"کیا واقعی میں کوئی نفسیاتی مریض ہوں"۔[2] (ہم نشینی کا عذاب)

خارج سے رابطے کے دو تصور عرش صدیقی کے یہاں نظر آتے ہیں۔ ایک رویہ تو ذات کے حوالے سے خارج پر نظر ڈالنے کا ہے جس کا ذکر تفصیل سے آچکا ہے۔ دوسرا رویہ فاصلے سے چیزوں کو دیکھنے کا ہے۔ "ہم نشینی کا عذاب" میں کھڑکی سے دیکھنے کا تصور فاصلے سے چیزوں کو دیکھنے اور خوشی محسوس کرنے کا عمل ہے۔ کیونکہ دور سے خارجی ہیئت زیادہ خوش نما اور خوش رنگ دکھائی دیتی ہے۔ لیکن قریب آکر بدوضعی کا احساس شدید ہونے لگتا ہے:

"باہر کی دنیا کی وسعتیں، ہنگامے اور تبدیلیاں، جو گھر سے باہر میرے لئے باعث عذاب ہیں، کھڑکی سے بڑی دلکش معلوم ہوتی ہیں۔ اور باہر کی دنیا بڑی متنوع نظر آتی ہے۔ کھڑکی میں ہر وقت کوئی نہ کوئی دلکش تصویر آویزاں دکھائی دیتی ہے

[1] اگر یک قطرہ کم گردد ز انگیزِ وجودِ من — بہ ایں قیمت نمی گیرم حیاتِ جاودانی را (اقبال)
[2] قطرہ ہوں میں دریا میں، مجھے کچھ نہیں معلوم — ہمراہ مرے کون ہے، میں کس سے جدا ہوں (عرش)

یہ کھڑکی آزادی اور مسرت کی دنیا کا صدر دروازہ ہے۔"

عرش کے یہاں زندگی میں ڈوب جانے کا عمل نہیں ملتا۔ زندگی فاصلے پر رہ کر برتنے کی چیز ہے اس طرح وہ زیادہ دلکش دکھائی دیتی ہے۔ زندگی میں کود جانے والا کھو جاتا ہے۔ ڈوب جاتا ہے اور عرش صدیقی کو یہ ڈوبنا اور کھو جانا پسند نہیں:

"۔۔۔۔ وہ کہتا ہے میں زندگی میں ڈوبنے کا حوصلہ نہیں رکھتا اور زندگی کو محسوس کرنے اور جاننے کے لئے اس میں ڈوبنا ضروری ہے۔ وہ کہتا ہے میں زندگی کو نظر انداز کر کے زندگی کا عکس دیکھتا ہوں۔ مجھے شے نہیں شے کا تصور عزیز ہے لیکن سمندر یا دریا کا نظارہ اس میں ڈوب کر تو نہیں ہو سکتا۔" (ہم نشیں کا عذاب)

صادق کا رویہ خیال پرست فلسفی یا شاعر کا سا ہے اور ظاہر ہے اس کا تصور سونا اس کا ساتھ نہیں دے سکتی، کیونکہ وہ زندگی میں ڈوبنا چاہتی ہے۔ جو تجربہ صادق کے لئے گھناؤنا ہے، اس کے لئے حسین ترین ہے اور اس تجربے کے لئے وہ بڑے سے بڑا خطرہ مول لینے کے لئے تیار ہے۔ اسے ایک قوی مرد کی ضرورت ہے جو اسے اسد کی صورت میں ملا۔ حقیقت کی سحر شکن قوت کے سامنے صادق جینے کا حوصلہ ہار بیٹھا۔ کھڑکی سے کود کر خود کشی کر لی۔ آصف کے دل میں خوف کی پھانس ہے۔ وہ سونا کے بھائیوں سے ڈرتا ہے۔ ذہنی خوف جنسی عمل کی تکمیل میں سخت حارج ہوتا ہے کیونکہ صحت مند جنس کا تصور جسم اور ذہن کے رابطے کی تیاری کا نام ہے۔ البتہ اسد کو یہ رابطہ میسر ہے۔ وہ کوئی خیال پرست فلسفی اور شاعر نہیں۔ وہ عام انسانوں جیسا ہے جسم کے تقاضوں کو سمجھنے اور پورا کرنے والا، زندگی کو سطحی نظر سے دیکھنے اور برتنے والا۔ حقیقت پسند لیکن غیر جذباتی رویوں کا حامل ——— اس کے لئے جنس

کسی ترفع کا احساس نہیں، حسن نہیں، شاعری نہیں، محض جسم کی پکار ہے ——— بے روح ——— خشک لیکن پانی اور ہوا کی طرح ضروری ——— سونا اور اسد میں اس لحاظ سے مطابقت موجود تھی اور اسی لئے دونوں نے ایک دوسرے کو چن لیا۔

"مور کے پاؤں" نئی صورتحال کا افسانہ ہے۔ یہ تہذیبی سفر کی کہانی ہے تہذیبی سفر ——— جو صدیوں سے جاری ہے اور لامحدود فاصلے طے کر کے بھی ختم نہیں ہوا۔ یہ مسلسل جاری رہے گا۔ اپنی مٹی سے محبت، اپنے تہذیبی اور روحانی ورثے سے الفت اس افسانے کا بنیادی تھیم ہے:

"۔۔۔۔ وہ کہتا تھا کہ ساری دنیا ہمارا گھر ہے اور دنیا نہایت وسیع ہے ——— لیکن میں اسے یہ بھی نہیں بتا سکا کہ اس وسیع دُنیا میں یہ وادی ہماری وادی جس کی مٹی سے میں بنا ہوں اور جس کے دیئے ہوئے رزق سے میں زندہ ہوں اور جو ہمارے بزرگوں کی لاتعداد نسلوں کی پناہ گاہ رہی ہے یہ وادی تو ساری دنیا میں صرف ایک ہے۔" (مور کے پاؤں)

اس افسانے میں اقتصادی مسائل کی وجہ سے اپنی سرزمین سے ہجرت اور ان دیکھی سرزمینوں میں جا کر زندگی کے بلند معیاروں کو چھونے کا تجربہ بھی ملتا ہے لیکن ان ہجرت کرنے والوں کی لاشیں پھر بھی اسی سرزمین کے قبرستانوں میں دفن ہوئیں کیونکہ یہ مرنے والوں کی وصیت تھی۔ گویا اپنی مٹی سے وابستگی کا احساس کبھی نہیں مرتا۔ اس ہجرت کی وجہ سے ہماری فیملی لائف بھی متاثر ہوتی ہے۔ اس کے واضح اشارے بھی اس افسانے میں ملتے ہیں۔

افسانہ "مور کے پاؤں" ۱۹۷۲ء میں لکھا گیا تھا اور اوائل ۱۹۷۳ء میں "اوراق" نے اسے شائع کیا تھا اس افسانے کو یوں تو عمومی طور سے بھی پسند کیا گیا لیکن،

اس کے ٹیکنیکی حسن کی بطورِ خاص تعریف ہوئی۔ اوراق ہی کے اگلے شمارے میں محمد صفدر ڈار نے اسے ایک "بہت اچھا افسانہ" قرار دیا۔ محمد اشرف عباسی نے کہا کہ "عرش صدیقی کا افسانہ "مور کے پاؤں" ٹیکنیک کا ایک نیا رُخ پیش کرتا ہے رب نواز مائل نے رائے دی کہ یہ افسانہ "ہمیں بھی ایک اور دُنیا میں لئے چلتا ہے۔ میرا مطلب علامتوں کی اس اشاراتی دنیا سے ہے جہاں لفظ لفظ سے ملکر دھندلکے بھی پیدا کرتا اور روشن دھوپ لانے کا بھی موجب بنتا ہے —— "مور کے پاؤں" خواہشوں کا سفر ہے لیکن زادِ راہ کی کمی سے ایک بسیط احساس کے ساتھ چلنے والا پستی سے بلندی اور بلندی سے پستی کی طرف مراجعت ہی میں پوری عمر گزار دیتا ہے آج کا انسان اس لحاظ سے اپنی آرزوؤں کا طلسم دیکھتے ہوئے بے حد خوش ہے۔ لیکن اس کے ساتھ بندھی ہوئی ایک ٹھاہ سے مضمحل شکست خوردہ یہاں تک کہ مردہ بھی۔"

یہ افسانہ نئی صورت حال کو طبقاتی شعور کی روشنی میں دیکھتا ہے اور طبقاتی استحصال کو ایک عجیب اور نقش ہو جانے والے اسلوب میں ابھارتا ہے۔ ٹھنڈے اور میٹھے پانی کے چشمے نیچے وادی میں ہیں چوٹی پر کوئی چشمہ نہیں لیکن وادی ہی کے لوگ اس پانی کو مشکوں میں بھر بھر کر اُوپر چوٹی پر رہنے والوں تک پہنچاتے ہیں کہ یہ ان کا مقدر بنا دیا گیا ہے۔ چوٹی پر پہنچنے والے لوگ زندگی کی تمام آسائشیں وادی ہی سے حاصل کرتے ہیں گویا اونچی فضاؤں میں اڑنے والے ارضی رشتوں کا احساس تو ضرور رکھتے ہیں لیکن ان کے شعوری ادراک سے یا تو خوفزدہ رہتے ہیں یا جان بوجھ کر ادھر متوجہ نہیں ہوتے۔ یہ افسانہ پیچیدہ انسانی صورت حال کا افسانہ ہے جو معاشرے کے اہم ترین معاشرتی مسائل کا احاطہ کرتا ہے ایسے ادق موضوعات پر اتنے شگفتہ اور تازہ افسانے زیادہ تعداد میں نہیں ملتے۔

"فرشتہ" بیانیہ رنگ کی کہانی ہے جس میں عرش صدیقی نے حقیقت نگار کے قلم سے معاشرے کی ناہمواریوں کو بے نقاب کیا ہے مسائل کو جذباتی انداز سے نہیں دیکھا بلکہ تلخ حقیقتوں کا ادراک کیا ہے —— اور پھر پوری دیانت داری اور جرأت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ سوچنے اور فکر کرنے کے لئے کتنے راستے سامنے کر دیئے ہیں۔ عرش کی نظر معاشرے میں تہہ در تہہ چھپی ہوئی نزاکتوں پر پڑتی ہے۔ یہ نزاکت ذہن کی پیداوار نہیں معاشرے کی غلط اقدار کی پیدا کردہ ہے۔ معاشرے کے منافقانہ طرزِ عمل اور پُرپیچ رویوں کی پیداوار ہے جناب ڈاکٹر وحید قریشی کا کہنا ہے کہ "سمجھوتے بازی عرش صدیقی کے افسانوں کا بنیادی رجحان ہے"[1] —— یہ بات نذیر احمد نے بھی اُردو افسانے پر اپنے ایک مضمون میں کہی تھی نذیر احمد نے منجملہ دوسری باتوں کے یہ بات بھی کہی تھی کہ عرش صدیقی اور انتظار حسین دونوں کے ہاں سمجھوتے یا مفاہمت کا رجحان ملتا ہے ساتھ ہی انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ انتظار حسین کے ہاں یہ عمل شعوری ہے جب کہ عرش صدیقی کے یہاں لاشعوری۔ اس رائے سے ہرگز اتفاق نہیں کیا جا سکتا میں یہ نہیں کہنا چاہتا کہ انتظار کے ہاں یہ عمل محض لاشعوری ہے لیکن یہ بات پورے یقین کے ساتھ کہنا چاہتا ہوں کہ عرش صدیقی کے ہاں مفاہمت کے عمل کو لاشعوری کہنا درست نہیں یہ الزام انتظار حسین کے شروع کے افسانوں پر تو شائد لگایا جا سکے۔ لیکن عرش صدیقی کی کسی بھی تحریر پر نہیں لگایا جا سکتا۔ بلکہ خود عرش صدیقی کو اصرار ہے کہ وہ تو شاعری کی تخلیق بھی ایک خاص شعوری سطح پر کرتے ہیں۔ اور افسانے تو ان کے لئے زندگی کی مختلف صورتوں کے شعوری مطالعہ کا نتیجہ ہیں۔

اصل سمجھوتہ اور مفاہمت اس حقیقت کی ترجمانی ہے جس سے ہمارا معاشرہ

[1] "عرش صدیقی کی افسانہ نگاری" —— ڈاکٹر وحید قریشی اوراق دسمبر ۶۹ء جنوری ۷۰ء

دوچار ہے یہ مسئلہ حالات کے سامنے سپر ڈال لینے کا نہیں بلکہ حقیقتوں کی ٹھوس نوعیت کو تسلیم کر لینے کا ہے۔ ایسے مواقع پر عرش رومانی نہیں بنتے، مثالیت پسندی سے کام نہیں لیتے بلکہ حقیقت پسند بننے کو ترجیح دیتے ہیں۔ انسان کو اس معاشرے میں قدم قدم پر حالات سے سمجھوتہ کرنا پڑتا ہے۔ ذہن کا دوزخ جل اٹھتا ہے، خون کی حدت بڑھ جاتی ہے۔ کرب کا لاوا پھوٹ پڑتا ہے، اعصاب میں تشنج پیدا ہوتا ہے لیکن پھر انسان کچھ نہیں کر پاتا۔ سوائے سمجھوتے اور مفاہمت کے، آج کا انسان حالات سے سمجھوتہ کرنا جانتا ہے لڑتا نہیں ——— یہی سامنے کی زندگی کا غالب رجحان ہے۔ سب سے پہلے احتجاج کے باوجود حالات سے مراد نے سمجھوتہ کیا۔ پھر گل رخ نے سمجھوتہ کیا۔ پھر نور احمد نے سمجھوتہ کیا۔ بے جا پابندیوں، نام نہاد اخلاقی ضابطوں اور غلط اقتصادی اور معاشرتی اقدار کی موجودگی میں سمجھوتہ تو آج کے انسان کی آخری پناہ ہے۔ اس لئے عرش صدیقی کو اس رجحان کی وجہ سے معتوب قرار دینا میرے خیال میں مناسب نہیں زندگی جیسی ہے اس کو پیش کر دینا ادبی دیانتداری کا تقاضا ہے عرش نے اس تقاضے کو پورا کیا۔ وہ ہمیشہ صاف صاف دیکھتے ہیں نہ تو کچھ چھوڑتے ہیں اور نہ کسی چیز کو مسخ کرتے ہیں بلکہ صرف اس چیز کو جھلکاتے ہیں جو بالکل حقیقت ہے انہوں نے معاشرے کی ناہمواریوں کو ہمدردانہ شعور کے ساتھ دیکھا اور پیش کیا۔ گل رخ کا کردار ہماری ہمدردی کا متقاضی بن جاتا ہے۔ صرف اس لئے کہ معاشرے میں گناہ ہوتا ہے تو اس کا جواز بھی کہیں نہ کہیں موجود ہوتا ہے۔ علت اور معلول کا یہ سلسلہ اٹل ہے۔ جرم و تعزیر کے قوانین اپنی جگہ درست سہی لیکن ان کا انطباق اس وقت جائز ہے جب معاشرے میں جرم کی گنجائش نہ ہو ورنہ جس نظام کے تحت ہم جی رہے ہیں وہاں تعزیر عائد کرنا کہاں تک جائز ہے۔ عرش صدیقی نے اس بارے میں سوچا ہے اور

صحیح فیصلہ دیا ہے:

"پابندیاں لگائی جائیں۔ ضابطے بنائے جائیں لیکن جرم کو عام زندگی اور مجرم کے حالات سے کاٹ کر دیکھنا کہاں کا انصاف ہے اور پھر جنس کا جذبہ کون نہیں جانتا کتنا ظالم ہے۔ جہاں اسے ضبط میں رکھنا ضروری ہے وہاں بعض رعائتیں دینا بھی ضروری ہے بالخصوص اس وقت جب حالات بھی خاص ہوں پھر فرد کے سلسلے میں تم معاشرتی کمزوریوں اور ظلم کو کیوں بھول جاتے ہو۔ یہ بھی خوب انصاف ہے کہ اخلاق کے نام کا لٹھ اٹھایا اور آنکھیں بند کر کے دے مارا۔ کسی کا سر ٹوٹا کسی کا ہاتھ اور جناب کو اطمینان ہو گیا کہ گناہ گاروں نے اپنے کئے کی سزا پائی اور لطف کی بات یہ ہے کہ سزا تجویز کرنے پر سب آمادہ ملیں گے۔ لیکن حالات کو ٹھیک کرنے کا عزم کسی کے پاس نہیں" (فرشتہ)

فرشتہ اس مجموعہ کا سب سے طویل افسانہ ہے جو بہت آسانی سے ایک ناول کا موضع بن سکتا تھا۔ عرش صدیقی نے ایک اچھے افسانہ نگار کی طرح اس کو دلچسپ انداز میں پیش کیا ہے۔ دلچسپی کا عنصر ایک ایک سطر میں ہے ایک لمحے کے لیے بھی پڑھنے والے کی توجہ اِدھر اُدھر نہیں ہوتی پورا افسانہ قاری کو پوری طرح جذب کر لیتا ہے۔ افسانے میں نفسی کیفیات اور ذہنی مد و جزر کو فن کاری کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ ذہن پر گزرنے والی کیفیتوں کی تصویریں فطری انداز میں سامنے آتی ہیں اور بھرپور تاثر چھوڑتی ہیں:

"...... اس نے یہ بھی محسوس کیا کہ خاموشی بہت بڑی حقیقت ہے اور کہ خاموشی ہی زندگی کا سرچشمہ ہے۔ زندگی کا دریا خاموشی کے سمندر ہی میں جا گرتا ہے اور درمیان کا یہ مختصر سا وقفہ ——— مختصر سا یہ سفر چھوٹی چھوٹی خوشیوں بڑے بڑے حادثوں، احمقانہ خواہشوں اور لا علاج پریشانیوں سے اٹا

پڑا ہے۔"

وہ رُوپ جس کے لئے موت ہے ——————— وہ کب کا مر چکا ——————— میں اپنے اصلی روپ میں تمہارے سامنے موجود ہوں ——————— کوئی ہے جو اس روپ کو اصل تسلیم کرنے سے انکار کرنے کی جرأت رکھتا ہے۔ مجھے کوئی نہیں مار سکتا۔ میں اس وقت بھی زندہ تھی، جب تم نہ تھے۔ میں اس وقت بھی زندہ رہوں گی۔ جب میں نہ ہوں گی مجھے کون مار سکتا ہے کیا تم مجھے نہیں پہچانتے ؟ دیکھو میں کون ہوں —— میں بیگم مراد —— بیگم دلن —— بیگم الشیور سنگھ —— بیگم مرلی دھر —— میں یہ سب ہوں —— میں جنس ہوں —— کوئی مجھ سے میرا حق چھین سکتا ہے ؟ اخلاقی ضابطے اور معاشرتی پابندیاں میرے لئے بے معنی ہیں۔" (فرشتہ)

"تکمیل کا زخم" ایک ہرجائی مرد فیروز کی کہانی ہے جو حسن پرست ہے۔ خوبصورت عورتوں کو کھلونے سمجھ کر ان سے کھیلتا ہے۔ فیروز شوق میں ان کھلونوں کی طرف لپکتا ہے اور دوسرے لمحے جھنجھلا کر ان کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیتا ہے —— وہ ایک کھلنڈرا بچہ ہے —— لمحاتی خوشیوں کا طالب —— خوشیاں سمیٹنے اور مسرتیں بانٹنے والا —— لیکن اس کی بانٹی ہوئی لمحاتی مسرت نیلم کے لئے ساری زندگی کا روگ بن جاتی ہے۔ کیونکہ وہ ان لڑکیوں میں سے نہیں ہے جو خوشیاں سمیٹتی اور مسرتیں بانٹتی پھرتی ہیں —— فیروز کے لئے وہ دوسری لڑکیوں سے اس لئے بھی ممتاز ہے کہ اس کی آنکھیں بے حد نیلی ہیں اور پیاری بھی۔ اور جو بہت دلکش شخصیت کی مالک ہے اور دوسری بہت سی لڑکیوں سے اس لئے بھی مختلف ہے کہ جسم کے ساتھ ساتھ اس کا ذہن بھی زندہ ہے لیکن فیروز ان نیلی آنکھوں کا زخم اپنے دل پر لگانا نہیں چاہتا —— وہ اپنی ذات

کی توڑ پھوڑ کرنا نہیں چاہتا۔ وہ عشق کر کے اپنی آزادی کو اس کی خوراک بنانا نہیں چاہتا اس کی ذات کی تکمیل دوسروں کی توڑ پھوڑ کرنے میں ہے۔ اس لئے جب نیلم کی ایک آنکھ فیروز کی غلطی سے ایک حادثہ میں ضائع ہو جاتی ہے اور کھلونا ٹوٹ جاتا ہے تو وہ اسے آسانی سے چھوڑ جاتا ہے۔ اسے کوئی دکھ نہیں ہوتا۔

نیلم بھی اپنے آپ کو دھوکا دے سکتی تھی۔ تصویر میں اس کی دونوں آنکھیں نمایاں کی گئی تھیں لیکن نہیں —— وہ حقیقت پسند ہے جو زخم وہ کھا چکی ہے۔ اس کا اعتراف کرنا ضروری سمجھتی ہے —— اس کا زخم تکمیل ہی اس وقت پا سکتا تھا جب وہ تصویر کی آنکھ پھوڑ ڈالے۔ دراصل آج زندگی کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ انسان جبر کا اسیر ہے جو چاہتا ہے وہ کر نہیں سکتا۔ جو کرتا ہے وہ کرنا نہیں چاہتا نظر آنے والی چیزیں دکھائی نہ دیں اور جو دکھائی نہیں دیتیں ان کا وجود پریشان رکھے یہ دراصل حال سے ناآسودگی کا احساس ہے کیونکہ اس بے یقینی اور عدم تحفظ کے دور میں کوئی بھی آسودہ اور مطمئن نہیں۔ جو ہے وہ کافی نہیں جو نہیں ہے اس کی خواہش ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لمحے عذاب بن گئے ہیں:

"یہ ایک دائرہ ہے حلقہ در حلقہ —— ایک زنجیر ہے جسے میں نہ توڑ سکتا ہوں نہ شاید توڑنا چاہتا ہوں۔ میں کیا چاہتا ہوں —— میں کیا نہیں چاہتا۔ سب گڈمڈ ہے صبح کے بلند ہوتے ہوئے سورج کی تیز روشنی میں بھی جسے چیزیں صاف صاف دکھائی نہ دیں اور جسے دکھائی نہ دینے والی چیزوں کے وجود کا احساس ہمیشہ پریشان رکھے اس کے لئے وہ زندگی کا کون سا لمحہ ہو گا۔ جو عذاب سے کم نہیں ہو گا۔" (تکمیل کا زخم)

• جوتھا مجوسی" تلمیحات اور امیجز کے ذریعے لکھا گیا افسانہ ہے جس میں ایک نئے آدرش کی تلاش کا جذبہ ملتا ہے۔ تین مجوسی ستارے کی رہبری میں حضرت مریم

ماضی سے وہ کٹ چکا ہے۔ آگے کا پتہ نہیں۔ کس طرف سے آیا تھا اور کس طرف کو جارہا ہے۔ کچھ نہیں جانتا:

"میں اٹھا اور واپس جانے کے لئے پلٹا لیکن وہاں کوئی راستہ نہیں تھا میرے پاؤں کے نشانات بھی چند قدم آگے جاکر مٹ گئے تھے۔ واپسی کے راستے کے یقین کے لئے میں اِدھر اُدھر بھاگنے لگا۔ ریت پر چاروں طرف ایک چھوٹے سے دائرے میں میرے قدموں کے نشانات بکھر گئے جن میں سمت کا احساس بالکل معدوم ہوگیا لیکن سورج سر پر تھا۔ میں کس جانب سے آیا تھا اور کس طرف جارہا تھا —— سب کچھ گڈمڈ ہوگیا تھا۔ واپسی کی سب راہیں مسدود ہوگئی تھیں۔" (چوتھا مجوسی)

لیکن عرش صدیقی ان مسدود راہوں اور گھپ اندھیروں میں روشنیوں کی تلاش کرنے کا حوصلہ نہیں ہارتے۔ کرب اور جبر کے اس دور میں بھی اُمید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے۔ وہ نئی دنیا کی تلاش جاری رکھتے ہیں —— چوتھے مجوسی کا کردار ادا کرتے ہیں اور آخر میں ایک نئے نظام کی نشاندہی کرتے ہیں۔ یہ نظام ایک بچے کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ یہ بچہ یوسف کا اپنا ہے:

"چاروں طرف اندھیرا تھا لیکن میں آگے بڑھتا چلا گیا۔ کچھ دیر بعد ایک جانب سے روشنی ابلتی ہوئے نظر آئی میں روشنی کے منبع کے قریب پہنچ گیا یہ ایک غار کا تنگ دروازہ تھا۔ روشنی اس میں سے سیلاب کی طرح باہر آرہی تھی، غار کا دروازہ بہت تنگ تھا لیکن میں اس میں اترنے کے لئے بے تاب تھا۔ میں نے سوچا غار میں جانے کا کوئی راستہ ہوگا اس راستے کی تلاش سے پہلے یہ جاننے کے لئے کہ اندر کیا ہے میں نے ذرا جھک کر غار کے کنارے پر دونوں ہاتھ رکھ دیئے۔

دروازہ فوراً کشادہ ہوگیا۔ غار کے اندر روشنی ہی روشنی تھی۔ سامنے چھت سے لٹکا ہوا میرا راہ نما ستارہ چمک رہا تھا۔ سفید چادر میں لپٹی ہوئی ایک عورت سر جھکائے پتھر کے ایک تخت پر مغموم اور خاموش تھی۔ اس کا صرف چہرہ کھلا تھا اس کی گود میں چھوٹا سا ایک بچہ تھا۔ بچہ ہنس رہا تھا مجھے دیکھ کر بچے نے بازو میری طرف بڑھا دیئے، بچے کے بازو میری طرف پھیلے ہوئے تھے۔ پھیلے ہوئے ان ننھے منے بازوؤں کا مقابلہ میرے بس کی بات نہیں تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر بچے کو اٹھا لیا۔ بچہ میرے سینے سے لپٹ گیا —— بچے کو گود میں لئے ہوئے میں اس کے قریب ہوگیا اور ڈرتے ڈرتے اپنا منہ اس کے دائیں کان کے قریب لے جاکر میں نے کہا

"مریم —— میں آگیا ہوں"

اور جب ہم تینوں غار سے باہر آئے تو باہر تیز بارش ہورہی تھی۔"

(چوتھا مجوسی)

"گویا چوتھا مجوسی ذات کی ٹوٹ پھوٹ، اور ذہنی خلفشار کے اس دور میں ایک نئے آرڈر کی تلاش کا افسانہ ہے۔ عرش صدیقی کے یہاں آشوب ذات خارجی انتشار اور ذہنی خلفشار کا مسئلہ بڑے تواتر اور تسلسل کے ساتھ ملتا ہے لیکن کسی فن کار کی عظمت اور کامیابی کا راز یہ ہوتا ہے کہ اس میں موجود زندگی اور اس کے مسائل سے نئی دنیا تخلیق کرنے کی کتنی صلاحیت ہے۔ عرش صدیقی حقیقی زندگی کے بطن سے ایک نئی دنیا تخلیق کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں —— وہ اس نئے آرڈر کو نئی صداقتوں کے تناظر میں پیش کرنے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔

"ظلِ الٰہی" کا موضوع جنسی احتیاج ہے —— جنس جس کا چہرہ نہیں ہوتا۔

آنکھیں نہیں ہوتیں، شکل و صورت نہیں ہوتی صرف جسم ہوتا ہے۔ جسم کی پکار ہوتی ہے۔ وہ رشتوں کی پہچان نہیں رکھتی — اس کا کوئی مذہب نہیں — کوئی عقیدہ نہیں — وہ اندھی ہے — وہ پیاس بجھانا جانتی ہے — پانی چشمے کا ہو یا جوہڑ کا کیونکہ یہ پیاس فطری ہے۔ اس کا بجھایا جانا ضروری ہے:

"سامنے بستر پر پڑا جسم اسے اپنی جانب کھینچ رہا تھا۔ وہ بالکل نہیں جانتا تھا کہ اس عورت کا نام کیا ہے۔ اسے صرف اتنا احساس تھا کہ ایک جوان جسم پڑا ہے۔ اور وہ صدیوں سے بھوکا ہے۔ اسے احساس ہوا کہ اس جسم کا سر نہیں ہے لیکن اس نے اس بات کی پرواہ نہ کی۔ کیونکہ جسم کے لیے سر کی ضرورت ہے نہ اہمیت — جسم جاگتا ہے تو سر سو جاتا ہے۔" (ظلِ الٰہی)

اور کبھی کبھی یہ جسم اتنی اہمیت حاصل کر جاتا ہے کہ باقی سب چیزیں سایہ دکھائی دینے لگتی ہیں اور یہ آخری حقیقت بن جاتا ہے۔ یہاں تک کہ زندگی جسم کا دوسرا نام بن جاتا ہے۔ دراصل عرش صدیقی زندگی کے جسمانی اور مادی تقاضوں کو نظر انداز نہیں کرتے کیونکہ ان تقاضوں کی تکمیل ذات کی تکمیل کے لئے ناگزیر ہے۔

عرش صدیقی جنسی رویوں کی بے راہ روی اور (PERVERSION) کو راہ دکھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ ان رویوں کی منہ زوری سے گھبراتے نہیں۔ پریشان نہیں ہوتے، فتوے عائد نہیں کرتے بلکہ ان کو فطری تصور کرتے ہوئے ان کی تسکین کو ضروری سمجھتے ہیں، آشوبِ ذات کے مسئلہ کو حل کرنے کے لئے جذبوں کا کتھارسس لازمی ہے — یہ افسانہ FLASHBACK کی ٹیکنیک پر لکھا گیا ہے فینٹسی کا تصور بھی ابھرتا ہے۔ خواب کی سی حالت — جس میں مختلف واقعات فلم کے ٹریلر کی طرح سامنے آتے ہیں۔ گذر جاتے ہیں — ذہنی کیفیت کے

مطابق کبھی ماضی کا واقعہ سامنے آتا ہے تو کبھی حال قطعیت کا رنگ پیدا کرتا ہے اس طرح افسانے میں ڈرامائی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔

"کتے" نفسیاتی ٹریٹ منٹ کا افسانہ ہے۔ پروین ماں کی محبت سے بچپن میں محروم ہو جاتی ہے۔ اور زیادہ تر کھلونوں اور تصویروں سے دل بہلاتی ہے۔ یہ کھلونے اور تصویریں اس کی زندگی کے ساتھی اور تفریح کا واحد ذریعہ بن جاتے ہیں۔ پاپا کی موت پر قریبی عزیزوں کا اس کے گھر کو لوٹنا اسے انسانوں سے اور بھی دور کر دیتا ہے۔ اس کی آنکھیں، کان اور تمام دوسری حسیات مردہ ہو جاتی ہیں۔ چچا کے گھر آ کر اسے یہ احساس ہو جاتا ہے کہ جہاں اور عزیز اس کے گھر کے ساز و سامان کے درپے ہیں وہاں چچازاد بھائی خود اس کو لوٹنے کی فکر میں ہیں اور مالِ غنیمت سمجھ کر اڑا لینا چاہتے ہیں شروع سے اس کی تنہا زندگی نے اسے خیالوں کی دنیا میں رہنا سکھا دیا۔ وہ خیال پرست بن گئی۔ بے جان چیزوں سے لگاؤ نے اسے ٹھوس حقیقتوں کی تلخیوں سے بیزار کر دیا۔ بقول ڈاکٹر وحید قریشی" پروین — احساسِ تنہائی کی ڈسی ہوئی ہے اس کا ماحول بے جان چیزوں میں زندگی ڈھونڈتا ہے۔ کتے، بلیوں اور انسانی سیرت کے درمیان بعض رابطوں کو تلاش کرتے کرتے یہ گڑیا ڈر اور خوف کی دنیا میں اپنے آپ کو محصور کرتی ہے"[1]

سب سے پہلا واقعہ جس نے اسے خوفزدہ کیا طوطے کا پُسی کے دانتوں میں دم توڑنا تھا۔ خوف کی یہ گانٹھ اس کے ذہن میں ایسی پڑی کہ کھل نہ سکی۔ پُسی کو جلاوطن کر دیا گیا۔ لیکن پھر بھی اس کا خوف دور نہ ہوا۔ یہاں تک کہ اس نے چینی کی بلی کو خوف سے گودام میں ڈال دیا۔ کھلونوں سے کھیلنے کے دن پیچھے رہ گئے تو پاپا اس کے لئے ایک چھوٹا سا پیارا پلا لائے جو رفتہ رفتہ بڑا ہو کر بڑی پیاری کتیا بن گیا۔ یہ ڈولی تھی۔ جو پروین کو بے حد عزیز تھی۔ انسانوں کی کمی کو اس نے ڈولی کے وجود میں پورا کیا۔

۱ عرش صدیقی کی افسانہ نگاری — اوراق — افسانہ نمبر دسمبر ۱۹۷۹ء و جنوری ۱۹۸۰ء

چچا کے گھر آ کر جب اسے اپنے چچازاد بھائیوں سے واسطہ پڑا تو ان نے انہیں بھی تصویروں اور کھلونوں کی صورت میں دیکھا اور پسند کیا کیونکہ

"اس کی یہ عادت ہو گئی تھی کہ جو چیز یا بالخصوص جو شخص اسے پسند آتا وہ اس کا مقابلہ اپنے بچپن کے کسی کھلونے سے ضرور کرتی تھی۔" (سکتے)

اس نے مجیب کو تصویر میں دیکھا اور پسند کرنے لگی کیونکہ وہ جیتا جاگتا اس کے سامنے نہ تھا، اس لئے اچھا لگا۔ سید خضر کو بچپن کا گڈا تصور کیا۔ امجد کو بھی ایک تصویر میں دیکھا اور پسند کیا۔ لیکن جب یہی سب، جن سے ملنے کا اسے بے حد اشتیاق تھا، زندہ اور مشہود صورت میں اس کے سامنے آئے تو وہ ان سب سے ڈر گئی۔ سب سے پہلے سید خضر سے خوف زدہ ہوئی۔ جب اس نے اپنی محبت کا اظہار اس سے کیا اور اس کا آگے بڑھا ہوا ہاتھ اس کے سینے پر آ کر رکا تو اسے یوں محسوس ہونے لگا جیسے وہ کوئی چوہیا ہے اور خضر بلی، حالانکہ یہی خضر پروین کو بھلا لگتا تھا۔ مگر صرف ایک کھلونے کی طرح جسے اٹھا کر طاق میں یا آتشدان پر رکھ کر دور سے دیکھا جا سکے۔ ابھی یہ واقعہ تازہ ہی تھا کہ اچانک اسد آ پہنچا اور اسے بیوی بنانے کی فرمائش ماں سے کر بیٹھا۔ پروین نے اس کی بات سن لی اور نفرت کا بیج اس کے دل میں پڑ گیا۔ امجد نے اسے پہاڑ پر لے جانے کی پیش کش کی۔ اس میں بھی اسے خضر کی روح حلول کرتی دکھائی دی اب وہ ہر وقت ہر ایک سے خوفزدہ رہنے لگی:

"وہ محسوس کرتی تھی کہ ان بھائیوں میں سے ہی کوئی نہ کوئی، کبھی نہ کبھی اسے یوں دبوچ بھاگے گا۔ جیسے اس کی پُسی نے اس کے طوطے کو لقمہ بنایا تھا۔" (سکتے)

کپتان مجیب اپنے کتوں سمیت گھر آیا تو وہ اور پریشان ہو گئی کیونکہ جہاں

اس کے السیشن کتے اس کی ڈولی کے پیچھے پڑ گئے وہاں وہ خود مجو سے ڈرنے لگی جیسے وہ ڈولی ہو اور مجیب بُل ڈاگ۔

پروین بے معنی خوف (PHOBIA) اور اعصابی وہم حاوی OBSESSIONAL NEUROSIS کا شکار ہو گئی یہ خوف ایک پھانس بن کر پروین کے حلق میں اٹک کر رہ گیا۔ اور اُس پر اس قدر محیط ہوا کہ پروین کی اپنی صورت بھی بدل گئی وہ خود کو ڈولی محسوس کرنے لگی اور اسد، خضر، امجد اور مجیب وغیرہ سب کتے نظر آنے لگے۔ جب سیکس کا مخصوص رویہ بھی خوف کے ساتھ مل جاتے تو صورت حال اس سے مختلف نہیں ہوتی جیسی اس افسانے میں پیش کی گئی ہے۔

افسانہ نگار نے خواب و خیال اور وہم و حقیقت کو ترتیب دے کر نیکی اور گناہ خوف و استکراہ اور جرم و تعزیر کے ہیولے تیار کئے ہیں۔

"باہر کفن سے پاؤں" اپنی علامتی ٹیکنیک، تخلیقی توانائی، غیر معمولی تجربے اور اچھوتے تھیم کے اعتبار سے اردو کے افسانوی ادب میں ایک شاہکار کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس افسانے میں ماورائیت، دہشت اور تنہائی کے منطقے بار بار اُبھرتے ہیں۔ نامعلوم کا سفر، مستقبل کی بے یقینی، موجودہ دور کی لامرکزیت اور تہذیبی تناظر کے مسخ ہونے کا استعارہ ہے۔ احساساتی سطح پر دہشت اور خوف کا پھیلاؤ، دہشت میں تنہائی کا سفر، نامعلوم کرب کی کیفیت موجودہ تہذیبی خلا اور GENERATION GAP کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ دورِ جدید کی بے سمتی، اور لامرکزیت نے فرد کو ذہنی خلفشار کا شکار کیا ہے۔ اس خلفشار کو امیجز کے تسلسل اور تاثراور روحانی اور تہذیبی تناظر کو FLASHBACK کے طور پر استعمال کر کے اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

دراصل زندگی نام ہے دو متحارب اور مخالف قوتوں کا۔ لیکن زندگی کی یہ دونوں بظاہر متضاد قوتیں ایک برتر اتحاد اور ہم آہنگی کے لئے ایک دوسرے میں مدغم ہونے کے لیے ہمیشہ کوشاں رہتی ہیں۔ یہ اتحاد، ذہنی کرب مسلسل کش مکش اور پیہم سفر کے بعد وجود میں آتا ہے۔

افسانے میں یہ کرب اور کش مکش جمیل الرحمان کے سفر میں دکھائی دیتے ہیں، جو صدیوں سے برتر اقدار اور حیات ابدی کی تلاش میں جاری ہے۔ جمیل الرحمن کی موت بھی اس ارتقائی عمل کا ایک حصہ ہے جو ازل سے نظام کائنات کے طور پر جاری وساری ہے۔ یہ نفی کا وہ تصوّر ہے جو اثبات کا پیش خیمہ ہے یہ وہ شام ہے جس کے جلو میں نئی صبح کی نمود ہے۔ یہ وہ موت ہے جو اپنے اندر زندگی کے لازوال امکانات رکھتی ہے:

"—— پھر میں وہاں سے بہت دور نکل گیا اور ایک اور براعظم میں پیدا ہوا۔ یہاں میں اب بھی زندہ ہوں —— یہاں میں کبھی نہ مرونگا —— یہاں میرے بچے ہیں اور پوتے پوتیاں ہیں —— یہاں میں زندہ رہوں گا —— ہمیشہ ہمیشہ ——"

(باہر کفن سے پاؤں)

گویا آدم کا یہ مسلسل ارتقائی تجربہ آخر ایک ایسی منزل پر منتج ہوگا جو حیات ابدی کی تفسیر پیش کرے گی —— عارف عبدالمتین نے اس افسانے کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار اس طرح کیا ہے کہ

"افسانہ 'باہر کفن سے پاؤں' خوبصورت، نئے اور اچھوتے انداز میں انسانی تاریخ کا نسل در نسل جائزہ پیش کرتا ہے۔ اور قاری کو شدید احساساتی سطح پر اس عمرانی حقیقت کا شعور بخشتا ہے کہ پرانی نسل نئی نسل کو وجود میں ہی نہیں لاتی بلکہ اس کے تحفظ کا اہتمام بھی کرتی ہے۔ اور یوں بقائے حیات کے ساتھ ساتھ ارتقائے حیات کی تگ و تاز میں ایک مثبت کردار ادا کرنے کی سعی کرتا ہے۔ افسانہ فطرت کی حیات آفرینی کی گرہ کشائی بھی نہایت قابلِ قبول انداز میں کرتا ہے اور ارضی روابط میں انقلابی تبدیلی (جس کا دوسرا نام ہجرت بھی ہے) کے حوالے سے نسلی احیائ کے مسئلہ کے حل کی طرف بھی بلیغ اشارہ کرتا ہے۔

"افسانے کو ایک اور زاویہ سے دیکھا جائے تو یہ روایت اور جدّت کی فن کارانہ توضیح اور زندگی کے تقاضوں کی عہد بہ عہد تکمیل کے سلسلے میں ان کی اثباتی حیثیت کی نقاب کشائی کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ اور اس نقاب کشائی کے دوران میں اجتماعی لاشعور کی اس ناقابل تردید اہمیت کی عکاسی بھی کرتا جو اسے انسانی فکر و عمل کے ضمن میں حاصل ہے۔"[1]

"یہ افسانہ زندگی سے ایسے پیار کا مظہر ہے جو موت کی کوکھ سے جنم لیتا ہے۔ افسانے کی پراسرار فضا نے اسے انتہائی مؤثر بنانے میں بڑا نمایاں کردار انجام دیا ہے اور زبان کی پُرکار سادگی اور تکنیک کی دلفریب ندرت افسانے کی دو اور جاذب توجہ خصوصیات ہیں"[1]

جابر علی سید، فیض عابد عمیق اور عبدالرشید نے اس افسانے کے بارے ان خیالات کا اظہار کیا۔

"'باہر کفن سے پاؤں'، اپنے نئے تھیم، سٹیگ، ہیئت اور تکنیک میں ایک انوکھا اور بالکل نیا تخلیقی تجربہ ہے اور غیر معمولی حد تک کامیاب"[2]

"'باہر کفن سے پاؤں' اردو کے عظیم ترین افسانوں کے گروپ میں شامل ہو کر اپنی انفرادیت کو برقرار رکھتا ہے۔ عظمت کے اعتبار سے اس کا

[1] عارف کا ایک خط — تحویل ڈاکٹر غلام حسین اظہر [2] جابر علی سید — عنفیس — امروز ملتان

مقابلہ "موزیل" اور "ٹوبہ ٹیک سنگھ" جیسے افسانوں سے کیا جاسکتا ہے لیکن
ٹکنیک میں یہ افسانہ اپنی مثال آپ ہے"![1]
"رامیج کے تسلسل میں لکھا گیا یہ افسانہ موضوع، تاثر اور ٹیکنیک کا ایک
بالکل انوکھا تجربہ ہے"![2]

(۵)

عرش صدیقی کے یہاں جنس کا رویہ بڑا صحت مندانہ اور حقیقت پسندانہ ہے
جنسی تکمیل کا عمل ایک فطری جذبے کی تسکین ہے۔ عرش صدیقی کے یہاں جنسی جذبے
کی تسکین بے حد ضروری ہے کیونکہ عدم تکمیل کی صورت میں نہ صرف PERVERSION
کا خطرہ ہے بلکہ جرم اور گناہ کے لامتناہی سلسلے چھڑ جانے کا احتمال بھی ہے۔ "فرشتہ"
کی بیگم مراد کی گمراہی کا اصل سبب یہی ہے۔ اس لئے اس جذبے کو سیدھی راہ
دکھانے کے لئے اس کا کتھارسس ضروری ہے ——— "ظلِ الٰہی"
کے نادر کے لاشعور میں نفسیاتی خواہشات اپنی توانا، وحشیانہ اور بے لگام فطرت
کے مطابق ایک طوفان برپا کردیتی ہیں۔ وہ فوری تسکین کی طلب گار ہیں۔ لیکن اسی
کمرے میں اس کی بہن ہے جس سے تسکین کی اجازت نہ مذہب دیتا ہے اور
نہ اخلاق اور تہذیبی اقدار۔ چنانچہ اس کرائسس (CRISIS) میں اس کے اس
طوفانی جذبے کو سکون پہنچا کر اسے ایک بڑے گناہ سے باز رکھنے والی طوائف
"ظلِ الٰہی" ہے۔ اسی طرح بیگم مراد کے اس جذبے کی تسکین کرنے والا اس کا
داماد اس کے لئے فرشتہ ہے۔ اور اپنا فرشتہ سیرت خاوند قابل نفرت:

"..... بیگم مراد کی آواز ایک دم طنزیہ ہوگئی اور اس نے ایک نفرت بھرا مختصر سا
قہقہہ لگایا "ہاں،، کہتے تو ٹھیک ہو ——— جو شخص مرد ہو کر کبھی مردوں والا کام نہ کرے
وہ فرشتہ ہی ہو سکتا ہے۔ تم نے ان کو باہر سے دیکھا ہے اور میں ان کو اندر

[1] منیف عابد بمیق [2] عبدالرشید ۔ مخلیں امروز ملتان

سے جانتی ہوں ——— آدمی کا وقار آدمی بننے میں ہے نہ کہ فرشتہ بننے میں ———
تمہاری طرح فرشتہ بننا اور بات ہے۔ تم نے تو گویا غیبی سہارا دیا ہے"۔ (فرشتہ)
"ہم نشینی کا عذاب" کی سونا کو خیال پرست فلسفی یا شاعر کی ضرورت نہیں بلکہ ایک
قوی مرد کی ضرورت ہے جو اس کے جنسی جذبے کی تسکین کا باعث بن سکے۔ اور
اس کے لئے اس نے اسد کو چنا۔ "بھیڑیں" کی شکیلہ اپنے مریل اور بدشکل خاوند
کے ساتھ اس لئے مطمئن زندگی گزار رہی ہے کہ وہ اسے دوسرے مردوں سے
ملنے سے منع نہیں کرتا۔ اور افسانے کے آخر میں جنسی تجربہ ایک نئی زندگی کا نقیب
بن جاتا ہے:

"..... میں نے یہ سوچتے ہوئے آنکھیں کھولیں کہ یہ ایک نیا خواب تھا
لیکن یہ خواب نہیں تھا میرے کمرے کے فرش پر بچھا ہوا قالین نئی زندگی
کی بشارت دے رہا تھا" (بھیڑیں)

"باہر کفن سے پاؤں" میں ندیوں میں کودنے کا عمل دراصل جنسی تجربے
کا استعارہ ہے۔ زبان کا خشک ہونا، حلق کا سوکھنا، بدن کا جلنا اور پیاس کا
محسوس ہونا جنسی جذبے کی شدت ہے اور جلتے کوئلوں کے پانی میں بجھنے
کی تیز آواز اطمینان اور بے پروائی اس کی تسکین کی علامت ہے۔

غرض عرش کے یہاں جنس کا صحت مند اور بے باک تصور موجود ہے۔ ایسا بیباک
تصور جو کسی قسم کے کمپلکس کا شکار نہیں۔ عرش صدیقی غیر زمینی اور مثالی عشق کے
قائل نہیں ——— وہ عورت اور مرد کے تعلق کو جنس سے الگ کرکے نہیں دیکھتے۔

دور جدید کے علامتی افسانہ نگاروں کے یہاں سب سے بڑا نقص یہ نظر آتا ہے
کہ وہ تکنیکی تجربے اور طرز اظہار کی جدّت پسندی کے شوق میں نہ صرف افسانے
میں قصہ پن کو نظرانداز کردیتے ہیں بلکہ افسانویت کے بنیادی تقاضوں کو بھی خاطر

میں نہیں لاتے۔ محض تحیّر انگیز اختراع سے کام لینے کی کوشش کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانے عام لوگوں کی فہم سے بالا ہیں۔ اس کی ایک بہت نمایاں مثال انور سجاد کے یہاں ملتی ہے۔ ان کے بیشتر افسانے ابہام کی پیداوار دکھائی دینے لگتے ہیں۔ اس لئے معنویت کی تلاش ناکام ٹھہرتی ہے۔ استعارہ، موضوع اور خیال کی وضاحت اور ترسیل کے لئے استعمال ہوتا ہے نہ کہ اس کی راہ میں حائل ہونے کے لیے۔ عرش صدیقی کے ہاں علامت یا استعارہ خیال کی ترسیل میں معاون بنتا ہے اور انور سجاد کے ہاں رکاوٹ پیدا کرتا ہے عرش صدیقی کے یہاں تکنیکی تجربے، موضوع اور طرز اظہار کی جدّت کے باوجود افسانے کی بنیادی خوبی دلچسپی اور قصہ پن کے عناصر بھرپور انداز میں ملتے ہیں "دکھ سے 'باہر کفن سے پاؤں' تک جتنا فنی سفر دکھائی دیتا ہے اس میں نہ صرف تکنیک کا ارتقاء نمایاں نظر آتا ہے بلکہ امیجز (IMAGES) کے استعمال اور تلازمۂ خیال میں گہرائی کا احساس بتدریج بڑھتا گیا ہے اور بعد کے افسانوں کی تکنیک میں تمثال آفرینی اور تلازمۂ خیال کو خاص طور پر دخل حاصل ہے۔

مجھ سے بعض احباب یہ سوال کرتے رہے ہیں کہ عرش صدیقی کے افسانوں کا اسلوب کیا ہے اور انہوں نے کونسی تکنیک استعمال کی ہے اس سلسلے میں کچھ شروع میں بھی کہا جا چکا ہے اور مختلف افسانوں پر بحث کرتے ہوئے بھی بعض اشارے کئے جا چکے ہیں لیکن خاص طور پر اس پہلو کا مطالعہ بھی ضروری ہے۔

فن کار کا اسلوب میرے نزدیک اس کی پوری شخصیت کا عکس ہوتا ہے اس کے نظریات، احساسات اور رویے مل کر اس کے اسلوب کی تعمیر کرتے ہیں۔ اور انہی قوتوں کے زیر اثر وہ خاص طرح کی زبان استعمال کرتا ہے اور خاص طرح

کے استعاروں سے ترسیل معانی کرتا ہے۔ عرش صدیقی زبان کے استعمال میں ہمیشہ یہ احتیاط برتتے ہیں کہ کہیں بھی تصنع کا رنگ پیدا نہ ہو۔ وہ افسانوں کے لئے خاص طرح کے ذخیرہ الفاظ کو استعمال میں نہیں لاتے جب تک انہیں یہ یقین نہ ہو جائے کہ اس کی تازگی بحال ہو گئی ہے۔ ان کے لئے لفظ، استعارہ یا علامت مقصود بالذات نہیں۔ یہ ایک ذریعہ ہے ترسیل معانی کا۔ استعارہ ہو یا علامت، یہ بظاہر ایک پردہ ہے لیکن حقیقت میں معانی کی ترسیل کا معاون اشارہ ہے۔ اگر یہ مقصد پورا نہیں ہو رہا اور علامت ایک پہیلی بن کر رہ گئی ہے اور استعارے کو کھولنے کے لئے برس ہا برس کی مشقت درکار ہے تو عرش صدیقی کے نزدیک علامت اور استعارہ دونوں اپنے مقصد میں ناکام رہے ہیں۔

عرش صدیقی اپنے کرداروں کی نفسیات اور واقعات کے معاشرتی پس منظر کو ایک لمحے کے لئے نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیتے۔ ساتھ ہی وہ ایک واضح ذہن رکھتے ہیں اور زندگی کو بامقصد بنانے اور اسے قابل برداشت بنانے کی خواہش رکھتے ہیں یہ تمام رویے ان کے اسلوب کا تعین کرتے ہیں ترسیل معانی کے لئے علامت ان کے لیے بے حد اہمیت رکھتی ہے لیکن ان کی تمام علامتیں معانی کی ترسیل میں معاونت کا فریضہ انجام دیتی ہیں۔ کرداروں کی نفسیات اور واقعات کے معاشرتی پس منظر کا مطالعہ تو ان کے تمام افسانوں کی ایک اہم اور واضح قدر مشترک ہے۔ مجموعی طور سے دیکھا جائے تو صرف ایک افسانہ "فرشتہ" بیانیہ انداز میں لکھا گیا ہے۔ صرف یہ ایک افسانہ ایسا ہے جس میں فن کار نے علامتوں سے ترسیل معانی کا کام نہیں لیا۔ شروع میں افسانہ "کتے" بھی بیانیہ معلوم ہوتا ہے لیکن چند صفحات کے مطالعہ سے ہی واضح ہو جاتا ہے کہ یہ افسانہ کئی علامتوں اور استعاروں کے ذریعے آگے بڑھتا ہے۔ علامتوں اور

استعاروں کے اس استعمال کے باوجود عرش صدیقی کا اسلوب انور سجاد کے اسلوب سے مختلف ہے کیونکہ عرش صدیقی کے ہاں استعارہ ایک واضح ذریعہ ہے ترسیل معانی کا جب کہ انور سجاد کے ہاں استعارہ مقصود بالذات ہو کر رہ گیا ہے استعارے کے استعمال میں عرش صدیقی کا مقابلہ انتظار حسین سے ہو سکتا ہے کیونکہ ان دونو کے ہاں استعارہ پورے افسانے میں پھیل کر معانی کی وضاحت کرتا ہے۔ اور پورے نفسیاتی اور معاشرتی پس منظر کو ساتھ لے کر چلتا ہے۔

اسلوب کس طرح فن کار کی مکمل شخصیت کا آئینہ دار ہوتا ہے اس کی ایک عمدہ مثال یہ افسانے پیش کرتے ہیں۔ بقول اصغر ندیم سید "عرش صدیقی کے افسانوں میں فکری اور تہذیبی تحریکوں کے حوالے سے انسانی زندگی کو لاحق خطرات کا خوف بھی ہے اور کائنات کی تخلیقی قوت کا یقین بھی"[1] اور یہ شخصیت اپنے افسانوں میں اصغر ندیم ہی کے الفاظ میں "بامعنی علامت کے ذریعے پوری انسانی تاریخ کو ایک لمحے کی صداقت سے منکشف کرتی ہے"[2]

مختصر یہ کہ عرش صدیقی، لامرکزیت، اقدار کی شکست و ریخت، ذات کی گمشدگی عقائد کی پامالی، مستقبل کے بے یقینی، اور تہذیبی خلا کے اس دور میں وجود کے جواز اور زندگی کی نئی معنویت کو تلاش کرنے کی سعی کرتے ہیں اور ان کی یہ سعی ارتقائے حیات میں ادیب اور فن کار کے نہایت اہم رول کی نشاندہی کرتی ہے۔

[1،2] روزنامہ امروز (ملتان) (مغلیں) از اصغر ندیم سیّد۔

ملاقات

منظر امکانی

پروفیسر عرش صدیقی کے بارے میں یہ فیصلہ کرنا مشکل ترین کام ہے کہ وہ اپنی شخصیت کے کس حصے میں زیادہ قدآور اور توانا دکھائی دیتے ہیں۔ اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ انہوں نے کسی بھی شعبۂ زندگی میں محدود ہو کر نہیں سوچا بلکہ جہاں بھی گئے اور جو کچھ بھی کیا اس میں دیانتداری اور صداقت کو معیار بنایا۔ اسی کی بدولت ان کی شخصیت کا ہر حصہ روشن ہے۔ آپ اس سلسلے میں ابتدا نفیٔ ذات سے بھی کریں تو انہیں مصنوعی نفی سے کوسوں دور پائیں گے۔ نفی ذات بہت بڑی بات ہے۔ خاص طور پر ایک ایسے شخص کے لئے جو اپنی ذات میں دبستان کی حیثیت رکھتا ہو اور اس سے دوستی کے لئے بیک وقت چاروں جانب مضبوط ہاتھ ہر لمحے بڑھتے رہیں اور وہ قطعی لاتعلق رہے۔ یہ لاتعلقی اس تناظر میں ایک خاص معنویت رکھتی ہے۔ جب کہ لوگ اپنی مقبولیت کے لیے دبستان چلانے میں ذاتی سرمایہ خرچ کر رہے ہوں۔ اس نفیٔ ذات سے قنوطیت بھی نہیں ابھری۔ بلکہ جب ہم اس ہمہ گیر شخصیت کو ایک خاندان کے سربراہ کی حیثیت سے دیکھتے ہیں تو وہ اپنے اہل خانہ کی ضروریات کو پورا کرنے میں مصروف دکھائی دیتا ہے۔ ضروریات مادی سطح تک نہیں بلکہ اس میں بھرپور محبت شامل ملتی ہے۔ اسی لئے بیٹی کی اچانک موت پر باپ کی والہانہ محبت اتنی بلند نظر آتی ہے کہ لوگ ایسے باپ کے زیر سایہ

پرورش پانے کیلئے بیتاب ہوجاتے ہیں۔ باپ کی محبت جب شاعری میں ڈھلتی ہے تو شاعری کا وقار مجروح نہیں ہوتا۔ بس انتساب ننھی منزہ کے لئے محبت کا نتیجہ قرار پایا۔ اور "دُعائے نیم شبی" میں یہ محبت ایک دوسرے جذبے کے سامنے آئی تو صورتِ حال بدل گئی۔

اس کی شفقت اور محبت سے طلبا روشنی پاتے ہیں۔ لیکن کلاس روم کے باہر اس کا رُوپ بدل جاتا ہے۔ وُہ اپنے طلبا کے مسائل کو حل کرنے کی جدوجہد کرتا ہے ان کی حوصلہ افزائی کرتا ہے اور ان کی کامیابی پر اپنا انعام لینے کے لئے نہیں جاتا، اور کبھی بھی صاحبِ ظرف لوگوں کے درمیان اپنی علمیت کے جھنڈے سے کرانہیں مجروح نہیں کرتا۔ دوستوں سے اس کی محبت میں ذرہ برابر بھی لالچ اور خود غرضی نہیں ہوتی۔ وُہ اپنے ملک کا ایسا وفادار شہری ہے جو قانون کے احترام میں کبھی غفلت نہیں برتتا۔ وہ ادبی نشستوں کی روحِ رواں ہے لیکن اس سہارے سے اپنی شہرت نہیں کماتا۔

اس کا مقصد ادب کی بے لوث خدمت ہے۔ وُہ تنقید لکھتا ہے تو اسے معتبر ناقد قرار دیا جاتا ہے۔ اور جب وہ شاعری کی طرف آتا ہے تو صاحبِ اسلوب کہلاتا ہے اسی طرح اس کے افسانوں میں اس کی اپنی سوچ اور تفکر سے بات بلندی تک جاتی ہے اس کی عظمتوں سے پریشان ہو کر جب باقاعدہ مہم چلائی جاتی ہے تو وہ دیانت داری اور صداقت کو قربان نہیں ہونے دیتا۔ بلکہ اسی جوانمردی سے مقابلہ کرتا ہے۔ یہی اس کی کامیابی اور عظمت کا راز ہے اور اسی میں پروفیسر عرش کی شخصیت بند ہے۔ جسے کسی ایک زاویئے سے بہت بڑا ثابت کرنا ممکن نہیں۔ عرش صدیقی ان معنوں میں ہمارے عہد اور ادب کی آبرو ہیں۔ یہ دوسری بات کہ انہیں اپنی دیانت داری اور صداقت کی بدولت اتنا روشن محسوس نہیں کیا جاتا۔ عرش صدیقی اس بات سے واقف ہیں لیکن وہ اس طرف متوجہ نہیں ہوتے۔ دراصل وہ ادب اور زندگی میں بلندی کا چرچا پس منظر میں رہ کر خود چلانے کے حق میں نہیں۔ اس کا سبب

یہ ہے کہ وُہ ادب اور زندگی کی حقیقی معنویت پریقین رکھتے ہیں، جس کے نتیجے میں انسان کو حقیقی بلندی ملتی ہے۔ آج ہمارے ادب اور زندگی میں مصنوعی طریقہ کار پر اس لیے سوچا جاتا ہے کہ اس کا فوری نتیجہ بھی سامنے آجاتا ہے مگر باخبر لوگ جانتے ہیں کہ یہ کیفیت دیرپا نہیں ہوتی۔ سچائی اپنے آپ کو منوانے کے لئے ایسے راستوں سے اُبھر آتی ہے کہ اسے روکنے والے اس کا تصور بھی نہیں کرپاتے عرش صدیقی کے سلسلے میں بھی یہ عمل جاری ہے انہیں عملی زندگی میں بھی کامیابی حاصل ہورہی ہے اور ادب کے حوالے سے بھی معتبر شہرت بدستور مل رہی ہے اس سلسلے میں تازہ ترین مثال ان کے افسانوں کا مجموعہ "باہر کفن سے پاؤں" ہے جسے حال ہی میں آدم جی کا ادبی انعام ملا جبکہ ان افسانوں سے انہیں معتبر ترین افسانہ نگاروں میں تسلیم کیا جارہا ہے۔ محمد حسن عسکری مرحوم کے بعد شاید عرش صدیقی پہلے ادیب ہیں جن کے اس قدر مختصر افسانوں نے انہیں اتنی شہرت عطا کی ہے کہ لوگ برسوں کی مسلسل جدوجہد کے بعد بھی نہیں پا سکے۔

پروفیسر عرش صدیقی کے حوالے سے مزید گفتگو کرنے سے قبل ضروری ہوگا کہ نفیٔ ذات کا مفہوم بیان کر دیا جائے تاکہ بات پوری طرح واضح ہو جائے۔ دراصل نفیٔ ذات سے میری مراد اپنی نفی اور فرار نہیں یہ جذبہ تو ان لوگوں میں ہوتا ہے جو زندگی سے نبرد آزما ہونے کی ہمت نہ رکھتے ہوں۔ یا پھر انہیں اپنے بارے میں غلط فہمی ہو۔ نفیٔ ذات کا حقیقی مفہوم خود آگاہی ہے۔ آدمی جب اپنے آپ کو سمجھ لیتا ہے تو اپنے آپ کو منوانے کے چکر نہیں چلاتا۔ اس کی آسان مثال یوں سمجھ لیجئے کہ ایک مسافر جب یہ جانتا ہے کہ اس کی منزلِ مقصود کون سی ہے اور اس سفر کے لئے وہ ٹکٹ وغیرہ بھی پاس رکھتا ہے تو اسے پریشانی نہیں ہوتی۔ وہ ہر نئے مسافر کو خوف اور پریشانی سے نہیں دیکھتا۔ عرش صدیقی اپنے آپ سے باخبر ہیں۔

پروفیسر عرش صدیقی میں اس نفیٔ ذات کا عمل ایک طرف تو انہیں مصنوعی ذرائع

سے الگ کئے ہوئے ہے دوسری طرف وہ اپنی کامیابی سے سرشار ہو کر اس نظریۂ حیات کو نہیں توڑتے۔ انانیت، محرومی اور سرشاری دونوں سے پیدا ہوتی۔ لہٰذا اسی کا نتیجہ ہے کہ عرش صدیقی کامیابی کے بعد بھی اس قدر پرسکون رہتے ہیں۔ البتہ یہ بات کسی حد تک تشویش ناک ہے کہ عرش صدیقی کو جس قدر لکھنا چاہیئے اس قدر نہیں لکھتے۔ اس کم لکھنے میں بھی احتیاط اور اعتبار کو باقی رکھنے والی بات ملتی ہے۔ لیکن جو لوگ انہیں قریب سے جانتے ہیں انہیں معلوم ہے کہ عرش صدیقی کس قدر پڑھے لکھے شخص ہیں اور ان معنوں میں ان کا کم لکھنا ایک سوال بن جاتا ہے مگر اس پر انہیں مجبور اس لئے بھی نہیں کیا جا سکتا ہے کہ دُنیا میں اس کی بیشتر مثالیں مل جاتی ہیں۔ خود ہمارے یہاں ایک معتبر گواہی پروفیسر کرّار حسین کی دی جا سکتی ہے جنہوں نے اپنے علم کو محفوظ کرنے کے بارے میں کبھی نہیں سوچا۔

پروفیسر عرش صدیقی اس معاملے میں اتنے دور نہیں گئے وہ کسی قدر باقاعدگی سے مصروفِ عمل ہیں۔ انہوں نے اپنے کتابی سلسلے کی ابتدا "میرزا ادیب کے افسانے" سے کی۔ اس کے بعد ان کی ذاتی تخلیق شعری مجموعے "دیدہ یعقوب" کی شکل میں آئی۔ اس کے بعد ان کے افسانوں کا مجموعہ "باہر کفن سے پاؤں" شائع ہوا۔ جو مختلف رسائل میں بکھرے ہوئے افسانوں کی کتابی شکل ہے۔ عرش صدیقی نے "دیدہ یعقوب" سے "باہر کفن سے پاؤں" تک کا فاصلہ تقریباً ۱۲ سال میں طے کیا۔ لہٰذا اس حوالے سے ان کی آئندہ کتاب کا آنا بہت جلد ممکن نہیں۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ محمد عمر خان جیسا مخلص شخص اس دوران کوشش کرے تو بات بن جائے گی۔ ورنہ عرش صدیقی کا خود کوشش کرنا تو بہت مشکل ہے۔

پروفیسر عرش صدیقی انگریزی ادب کے استاد ہیں۔ لیکن مشرقی علوم کے دشمن نہیں بلکہ جو لوگ انہیں انگریزی لباس میں دیکھ کر فیصلہ کر لیتے ہیں کہ ان سے مشرقی علوم کا کوئی

تعلق نہیں۔ ان کا فیصلہ یقیناً یک طرفہ ہوگا۔ چوں کہ عرش صدیقی اس حد تک مشرقی ہیں جس قدر مشرقیت آسیب نہیں بنتی۔ اس کا بنیادی پہلو یہ ہے کہ ہمارے یہاں واضح طور پر دوریوں کو اختیار کیا جاتا ہے یعنی کسی کو مشرقیت عزیز ہے تو وہ مغربیت سے کوئی واسطہ نہیں رکھے گا۔ اور جنہیں مغربیت میں سارے خدائی اوصاف دکھائی دیتے ہیں۔ وہ مشرقیت کو آسیب سمجھتے ہیں۔ عرش صدیقی نے کسی جانب ہو کر نہیں سوچا۔ وہ مشرقیت سے مغربیت کی طرف آئے۔ (یہاں یہ سفر علم حاصل کرنے کے مفہوم میں کیا گیا ہے) اور اب مغربیت سے اس جانب گامزن ہیں جو انسانیت کہلاتا ہے۔ لہٰذا وہ مغربی لباس میں رہ کر بھی مغربی نہیں۔

یہاں اگر تصوّف کے اس سلسلے کا ذکر کیا جائے جس میں صاحبِ نظر صوفی دوسروں سے الگ رہنے کے لئے کچھ جداگانہ صورتیں اختیار کرتا ہے۔ تو بے جا نہ ہوگا عرش صدیقی نے اس جداگانہ صورت کو اختیار کرنے میں نفیٔ ذات کو شعار بنایا ہے۔ اسی لئے انہوں نے اصنافِ ادب میں کسی ایک جانب ہو کر کام نہیں کیا۔ وہ غزل، نظم اور افسانے میں اس نفیٔ ذات کا درس دیتے ہیں۔

آہنگ کراچی۔ ۷ راگست ۱۹۸۰ء

عرش صدیقی کے افسانے

ڈاکٹر انور سدید

عرش صدیقی کا ریاض فن تخلیق و تنقید کے تین اہم مراحل سے گزر کر تکمیل کو پہنچا ہے وہ اولاً ایک جدید شاعر کے روپ میں سامنے آئے اور انہوں نے زندگی کو ایک نیم روشن پہاڑی سے دیکھ کر وہ سحر انگیز کیفیت پیدا کی جسے صرف ایک باشعور اور خردمند جدید انسان ہی پیدا کر سکتا ہے۔ تخلیق سے تنقید کی طرف مراجعت عرش صدیقی کی فنی جست نہیں بلکہ یہ ان کی فکری ضرورت نظر آتی ہے اگر وہ تخلیق مکرر کی کوشش کرتے اور صرف اپنے پر ہی نظر ڈالتے تو میں سمجھتا کہ عرش صدیقی اب اپنی مدافعت کر رہے ہیں اور کم نظر نقاد کو اپنی جانب متوجہ نہ پا کر خود یہ فریضہ سرانجام دینے کی سوچ رہے ہیں اس کے برعکس تنقید میں عرش صدیقی کی عطا یہ ہے کہ انہوں نے بالعموم فن کی نظریاتی بحث کو فوقیت دی۔ ادب کے جدید نظریات تراشے اور عملی تنقید میں ان نظریات کی روشنی میں معاصر ادب پرکھنے کی سعی کی ہے۔ مختلف نظریاتی مباحث کی ذیل میں یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ عرش صدیقی کا تصادم اپنے معاصر ادبا سے بھی ہوا لیکن انہوں نے قردلی نکالنے اور چڑھ دوڑنے کے بجائے احترام ادب کا سلیقہ پیدا کیا اور گفتگو

گو آگے بڑھانے کے لیے حدِ ادب قائم رکھی اور ذاتی تعلقات کو ٹوٹنے نہ دیا۔ عرش صدیقی کے فن کا تیسرا مرحلہ ان کی افسانہ نگاری ہے بلاشبہ وہ اس مرحلے پر سب سے آخر میں پہنچے ہیں تاہم اس سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ ان کی غزل کی عمومیت اور نظم کا شخصی زاویہ ان کے پورے تخلیقی پیکر کو منعکس کرنے سے قاصر تھا چنانچہ وہ ان کے جذبے کو کہانی میں سمونے پر متوجہ ہوئے تو انہوں نے ”باہر کفن سے پاؤں“، ”دکھ“، ”چوتھا مجوسی“، ”مور کے پاؤں“ اور ”فرشتہ“، جیسے افسانے لکھے۔ جنہیں ڈاکٹر وحید قریشی جیسے ناقد اور اصغر ندیم، اور انوار احمد جیسے نئے افسانہ نگاروں نے بھی سراہا ہے دلچسپ بات یہ ہے کہ عرش صدیقی نے فن کے متذکرہ تین مراحل ضروری وقفوں سے طے نہیں کئے۔ نیز یہ ان کی ادبی شخصیت کے تین مختلف النوع زاویئے نہیں بلکہ یہ تینوں ان کے بطون میں بیک وقت پرورش پا رہے تھے اور ان سب میں صرف ایک مرکزی حیثیت کا اظہار ہوتا ہے۔ اور وہ عرش صدیقی کی شخصیت ہے۔

عرش صدیقی کی شاعری میں فضا قدرے نیم روشن ہے ڈاکٹر وزیر آغا نے روشنی اور تاریکی کے اس سنگم کی توضیح یوں کی ہے کہ یہ سنگم عرش صدیقی کو منظر کے دونوں رخ دکھاتا ہے اس کے برعکس اپنے افسانوں میں عرش صدیقی پہاڑی سے اتر کر کھلے میدان میں آ گئے ہیں اور اب وہ منظر کا حسن کشیدہ کرنے کی بجائے اپنے عہد کے لوگوں سے مخاطب ہیں چنانچہ انہوں نے جس گھمسان کا سامنا کیا ہے اس سے بے شمار حقیقی واقعات نے جنم لیا ہے ان واقعات کو زندگی کی حرکت و حرارت ان کرداروں نے عطا کی ہے جو اس گھمسان میں عرش صدیقی کے قریب آ گئے ہیں اور جو واقعے کی معنویت کو ابھارنے کے لیے عرش صدیقی کو اپنی طرف بے اختیار متوجہ کر رہے ہیں میں ذہن پر تھوڑا سا زور ڈالوں تو ”فرشتے“ کا مراد علی آڑے ترچھے خطوط“ کی ہیر دین زیب، ”دکھ“ کی ہیروئن اور ”ہم نشینی کا عذاب“ کا صادق اپنے مخصوص خدوخال کے

ساتھ لوح دماغ پر اُبھر آتے ہیں— اور ان جذباتی کیفیتوں سے گزرنے کا موقع دیتے ہیں جنہیں عرش صدیقی نے ان کرداروں کے باطن سے کھوجا اور پھر انہیں اپنے افسانوں میں پیش کر کے زندگیِ دوام دے دی۔ اہم بات یہ ہے کہ عرش صدیقی کے افسانوں میں خیر اور شر کا تصادم ایک واضح حقیقت کے طور پر ابھرتا ہے تاہم انہوں نے اس تصادم کو نیم روشن فضا میں اُبھارنے کی سعی نہیں کی۔

عرش صدیقی نے ہر علامت نگاری کو خوبصورتی سے آزمایا ہے۔ (مثلاً چوتھا مجوسی) انہوں نے تفصیل کو تجرید میں سمونے کا تجربہ بھی کیا (مثلاً باہر کفن سے پاؤں)، انہوں نے وجودیت کو فنی استعارہ بنانے کی کاوش بھی کی ہے (مثلاً ہم نشینی کا عذاب)، تاہم حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے افسانے کا تخلیقی عمل نسبتاً کھلی فضا میں طے کیا ہے اور یہ فضا بے حد روشن ہے چنانچہ اس میں سائے آنکھ مچولی نہیں کھیلتے بلکہ اس نشیب و فراز کو نمایاں کرتے ہیں جنہیں زندگی کی حقیقت سے الگ نہیں کیا جا سکتا اس زاویے سے دیکھئے تو عرش صدیقی نے اپنے افسانوں میں زندگی کی صرف ایک قاش پیش نہیں کی بلکہ زندگی کے پورے کل کو محیط کرنے کی سعی کی ہے انکے افسانے "فرشتہ" اور "بھیڑیں" اس کی عمدہ مثالیں ہیں۔ ان افسانوں میں فرد اور معاشرہ واقعات کی بنت میں شامل ہی نظر نہیں آتے بلکہ ان سے ایک اجتماعی تجربہ بھی نمو پاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب ان افسانوں کا اختتام ہوتا ہے تو قاری کا ذہنی کیتھارسس کلیتہً ہو جاتا ہے۔

اُردو ادب میں عرش صدیقی صرف نو افسانوں کا خالق ہے انہوں نے حقیقت کو علامتی، وجودی، نفسیاتی اور جنسی زاویے سے دیکھا ہے اور ایک ہمیشہ قائم رہنے والا تاثر پیدا کیا ہے ان کے ہاں زندگی کے عمل پر ردعمل کی شدت بھی نمودار ہوئی ہے۔ لیکن وہ زندگی کو ریزہ ریزہ نہیں کرتے بلکہ اسے کسی مقام موعود پر لے آتے ہیں اور فرد کے علاوہ معاشرے کے جذباتی تشنج کو بھی مائل بہ اعتدال کر دیتے ہیں

یہی وجہ ہے کہ ان کے ہر افسانے کی اشاعت پر اہل ادب نے ان کی طرف چونک کر دیکھا اور پھر ان کی پذیرائی کے لئے گردن جھکا دی بہت کم لکھنے والوں میں سے یہ رفعت صرف عرش صدیقی کو حاصل ہوئی ہے کہ انہیں اُردو افسانے میں اب ایک اہم مقام حاصل ہے اور لاہور جیسے شہرت پسند شہر سے دوری بھی ان کے فن کے راستے میں حائل نہیں ہوئی عارف عبدالمتین نے درست لکھا ہے کہ عرش صدیقی کی افسانہ نگاری جدید اُردو افسانے کی اس آبرو کے تحفظ کی بشارت قرار پائی ہے جس کو آج اپنے لٹنے کا شدید خطرہ درپیش ہے

امروز لاہور ۲۰ جون ۱۹۸۰ء

عرش صدیقی کی افسانہ نگاری

ڈاکٹر انور سدید

سب سے پہلے تو مجھے اس بات کا اعتراف کرنا ہے کہ میں نے عرش صدیقی کے افسانوں کا مطالعہ چھوٹی چھوٹی قاشوں کی صورت میں کیا۔ یہ قاشیں زندگی کی صورت میں بکھری ہوئی تھیں اور میرا ان سے سامنا حیاتِ مستعار کے مختلف مقامات پر ہوا۔ مجھے اس اعتراف میں بھی تامل نہیں کہ زمانی فاصلے کے باوجود ان قاشوں کو مدغم کر کے قوسِ قزح کی طرح کے امتزاجِ رنگ کو جنم دینے میں بھی مجھے کامیابی حاصل ہوئی چنانچہ مجھے ہمیشہ ان رنگوں سے زیادہ دلچسپی رہی جو دو قاشوں کے نقطۂ انضمام پر پیدا ہوتے اور اپنی انفرادیت منوانے کے لیے گردوپیش کے شوخ رنگوں سے ہر دم متصادم رہتے تھے مجھے یہ بھی عرض کرنا ہے کہ ان کا نیا افسانہ منظرِ عام پر آنے سے قبل ان کے سابقہ افسانے کا تاثر میرے نہاں خانۂ دل میں اکثر گم ہو جاتا لیکن وہ دودھیا اُجالا جو اُن رنگوں کے امتزاج سے مرتب ہوتا تھا میرے بطون میں روشنی بکھیرتا رہتا اور پھر لمبے عرصہ تک جب عرش صدیقی مجھے مقبول و معروف افسانہ نگاروں کی کھیپ میں کہیں نظر نہ آتے تو مجھے مایوسی ہوتی اور میں انہیں تلاش کرنے کی کوشش بھی کرتا اور جب طویل عرصے کے بعد ان کا کوئی نیا افسانہ چھپ کر سامنے آتا تو فکر و فن کا وُہ

جگنو جو اندھیرے کے کسی محفوظ مقام پر اپنے پر سمیٹے دُبکا پڑا ہوتا اچانک ذہن کی سطح پر چمکنے لگتا اور عرش صدیقی سے سابقہ ملاقات ایک نئی اور طویل ملاقات کا پیش خیمہ بن جاتی اور عرصے تک اپنے نقوش تازہ رکھتی۔

یوں ایک حقیقت یہ بھی ہے کہ عرش صدیقی کسی دور میں بھی ادب کے اجنبی شمار نہیں ہوئے۔ بلاشبہ وہ کم لکھتے ہیں، تاہم میں ان کی اس کم نگاری کو ان کی کوتاہ قلمی شمار نہیں کرتا ان کے اظہار کے تین زاویے یعنی شاعری، افسانہ اور تنقید — مختلف سمتوں سے پھوٹے ہیں اور ان کی تخلیقی شخصیت میں یوں مدغم ہو گئے ہیں کہ عرش صدیقی کی پوری شخصیت ان سب کے بیک وقت مطالعہ کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ میں انہیں محمد حسن عسکری کی طرح صرف آٹھ دس افسانوں کے بل بوتے پر زندۂ جاوید ہو جانے والا افسانہ نگار شمار نہیں کرتا محمد حسن عسکری نے زندگی کے مختلف ادوار میں اظہار کی نئی نئی اصناف کو آزمایا اور سابقہ صنف کو مطلقہ بیوی کی طرح نظر انداز کر دیا۔ چنانچہ ہر صنفِ ادب عسکری کی ادبی شخصیت کے الگ الگ گوشوں سے متعارف کراتی ہے اور ان کے درمیان واضح حدِ امتیاز موجود ہے۔ عرش صدیقی کے ہاں مجھے یہ حدِ فاصل نظر نہیں آتی۔ ان کی شاعری، تنقید اور افسانہ میں جو قدرِ مشترک نمایاں ہے وہ عرش صدیقی نہیں بلکہ وہ فکری عنصر ہے جسے عامۃ الناس تک پہنچانے کے لیے عرش صدیقی نے اظہار کے مختلف اسالیب اور مختلف اصناف کا سہارا لیا ہے۔ چنانچہ اگر آپ یہ معلوم کرنا چاہیں کہ عرش صدیقی بطور افسانہ نگار کامیاب ہیں یا بطور شاعر —— اور افسانہ نگاری میں ان کا مرتبہ بلند ہے یا تنقید میں تو شاید کسی خاطر خواہ نتیجے پر نہ پہنچ سکیں۔ وجہ یہ کہ عرش صدیقی نے اپنی تخلیقی شخصیت کو غیر ضروری تجربوں میں الجھانے اور لخت لخت ہونے سے بچایا ہے۔ انہوں نے ہجوم میں گم ہو جانے کے بجائے اپنے تخلیقی وجود اور اس کی وحدت کو انفرادی امتیاز سے قائم رکھا۔ چنانچہ اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا کہ وہ کب افسانہ لکھتے ہیں یا شاعری کی دیوی ان پر کب مہربان ہوتی ہے یا تخلیقِ مکرر سے گزرنے کے لیے وہ معاصر تخلیقات

کی بازیافت کس انداز میں کرتے ہیں۔ عرش صدیقی ان فنکاروں سے مختلف نظر آتے ہیں جو اپنی مقبولیت کے گراف کو ہر وقت پیش نظر رکھتے ہیں اور اس کے ارتقا کو قائم رکھنے کے لئے کبھی ایک صنف ادب کو جولانگاہ بناتے ہیں اور کبھی دوسری صنف اظہار کے ساتھ رزم آرا ہو جاتے ہیں۔ لیکن جب عمر بھر کے ادبی اثاثے کو جمع کر کے اس پر ایک مجموعی نظر ڈالنے کی کوشش کی جاتی ہے تو حیرت ہوتی ہے کہ اتنی قدآور شخصیت اپنی شہرت کے ملبے تلے دبی پڑی ہے۔ اور ایک عرصہ سے کراہ رہی ہے۔ میں ایک ادبی قاری کی حیثیت میں اس صدمے سے کئی مرتبہ دوچار ہوا ہوں۔ عرش صدیقی نے ان تینوں اصناف ادب سے اپنی ادبی شخصیت کا ایک "مدون کل" مرتب کیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ جب ان کی شاعری، افسانہ نگاری اور تنقید کے بطون میں جھانکیں تو وہاں ہماری صرف ایک شخصیت سے ملاقات ہوتی ہے اور وہ مرکزی شخصیت عرش صدیقی ہے۔

اس اجمال کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ عرش صدیقی نے اپنے قاری اور زمانے کو نظرانداز کر دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب فن پارہ اظہار سے ابلاغ کی منزل تک پہنچ جاتا ہے تو اس میں قاری اور زمانے کی شرکت ناگزیر ہو جاتی ہے۔ عرش صدیقی کے ایک نقاد کا قول ہے کہ وہ شاعری کی تخلیق بھی ایک خاص شعوری سطح پر کرتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے زمانے کی کبھی تکذیب کی ہے اور نہ اسے نظرانداز کیا ہے۔ تاہم ان کا مخصوص زاویہ یہ ہے کہ انہوں نے اندھا دھند زمانے کا ساتھ دینے کے بجائے زمانہ کو تخلیق فن کا وسیلہ بنایا ہے اور دشمن جاں سیال لمحے کی غلامی کرنے کے بجائے اسے اپنی تخلیقی گرفت میں لینے کی کوشش کی ہے۔ عرش صدیقی نے بارہا ماضی کے اندھے کنوئیں میں جھانکا اور اس کے سینے اور اک کی قندیل روشن کی اور اس قندیل کی کرنوں سے آنے والے زمانے کی تصویریں اجاگر کیں۔ یہ تصویریں ان کی شاعری میں "ہاتھ میں پتھرے کر نکلو" "اے جادوگر"، "پابہ زنجیر" "اسے کہنا" وغیرہ نظموں کی صورت میں سامنے آئیں۔ اور یہ تصویریں "چوتھا مجوسی"، "مور کے پاؤں"

اور "ہم نشینی کا عذاب" وغیرہ افسانوں میں جلوہ نما ہوئیں۔ حقیقت کی تلاش کے لیے جس تنہائی اور یکسوئی کی ضرورت ہوتی ہے وہ عرش صدیقی کے ہاں "چاہ بیاباں"، "کوہ ندی" اور "نصف شب" کی صورت نظموں میں ابھری اور یہی کیفیت مجھے افسانہ "ہم نشینی کے عذاب" میں اس وقت نظر آئی جب افسانے کے مرکزی کردار کے کمرے میں سونا گھس آیا اور اس کی معطر تنہائی پر گندم کی سوندھی سوندھی خوشبو نے غالب آنے کی کوشش شروع کر دی۔

بالفاظ دیگر عرش صدیقی کی شاعری میں جو استعارہ "چاہ بیاباں" کی صورت میں نمایاں ہوا، اسی استعارے نے ان کے افسانوں میں غار، کمرہ اور گھر کا روپ اختیار کر لیا۔ اب دیکھئے کہ گھر، کمرہ اور غار افسانہ نگار کا حجرۂ تخلیق بھی ہے اور آغوش مادر بھی اور افسانہ نگار جب بھی اس سے الگ ہوتا ہے حوادث میں گھر جاتا ہے اور جب اس کوکھ میں پناہ حاصل کر لیتا ہے تو اس پر طمانیت کا ایک عجیب عالم گزر جاتا ہے اس کا وجود اس کے ہونے کی شہادت دینے لگتا ہے اور پھر پوری دنیا اسے رنگ و نور کی متنوع کائنات نظر آنے لگتی ہے۔ مثال کے طور پر "چوتھا مجوسی" کا واحد متکلم جب کہتا ہے کہ

"صحرا سے بچنے کی خاطر میں تیزی سے بھاگتا ہوا جنگل میں داخل ہو گیا چاروں طرف اندھیرا تھا۔ لیکن میں آگے بڑھتا چلا گیا۔ کچھ دیر بعد ایک جانب سے روشنی ابلتی ہوئی نظر آئی۔ میں روشنی کے منبع کے قریب پہنچ گیا۔ یہ ایک غار کا تنگ دروازہ تھا۔ روشنی اسی میں سے سیلاب کی طرح باہر آ رہی تھی۔ غار کا دروازہ بہت تنگ تھا لیکن میں اس میں اترنے کے لئے بے تاب تھا۔"

تو صاف نظر آتا ہے کہ یہ بے تابی اس اضطراب سے مملو ہے جو آغوش مادر سے جدا ہونے پر بچے کے دل میں بیدار ہوتی ہے۔ چنانچہ غار سے ابھرنے والی روشنی کا

سیلاب اِس پر اپنا در کشادہ کر دیتا ہے تو "ہم نشینی کا عذاب"، کا واحد متکلم بے اختیار ہو کر کہتا ہے۔

"ہاں۔ اب مجھے یہ معلوم ہو گیا ہے کہ کمرے میں آ کر میں یہ کیوں محسوس کرتا ہوں کہ بچہ ماں کی گود میں آ دبکا ہے یا چوزہ مرغی کے پروں میں"

دلچسپ بات یہ ہے کہ عرش صدیقی جو حقیقت کو اصل رنگوں میں دیکھنے کے آرزو مند ہیں۔ کمرے پر قبضہ کرنے کی نہیں سوچتے بلکہ یہ کمرہ ان کا گھر ہے یہ گھر ان کی دادی ہے اس دادی کی مٹی سے ان کا خمیر گوندھا گیا ہے اور اس کے دیئے ہوئے رزق سے نہ صرف وہ خود زندہ ہیں بلکہ یہی دادی ان کے بزرگوں کی لاتعداد نسلوں کی پناہ گاہ رہی ہے اور اس ایقان کا اساسی فلسفہ انہوں نے "مور کے پاؤں" میں یوں بیان کیا ہے کہ

"یہ گھر میری ملکیت نہیں ہے۔ میں اس کی ملکیت ہوں۔"

اور "جو تھا مجوسی"، میں جب وہ ستارے سے ہم کلام ہوتے ہیں تو کہتے ہیں کہ

"نہیں یہ ممکن نہیں۔ میں اپنا گھر چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گا۔ یہ گوشۂ عافیت ہے۔ میں اسے چھوڑ نہیں سکتا۔"

گھر سے یہ وابستگی درحقیقت اپنی مٹی اور اپنی جڑوں سے وابستگی ہے اور عرش صدیقی جس وجودی خوف سے دوچار ہیں اس کے پس پشت بھی ایک خطرہ نمایاں نظر آتا ہے کہ ان کا گھر شاید ان سے چھن رہا ہے اور اب انہیں کسی نئی دنیا میں ٹھکانا پڑے گا۔ تاہم ان کا افسانہ "جو تھا مجوسی"، پڑھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس تجربہ کو اپنے اوپر کبھی کا وارد کر چکے ہیں اور فرقت کی قیامت کا سامنا کر چکے ہیں۔ عرش صدیقی لکھتے ہیں

"ایک دفعہ پہلے میں اس گھر کو چھوڑ کر ادھر نکل گیا تھا۔ پھر مدتوں اپنے گھر کی تلاش کرتا رہا۔ برسوں پریشان پھرتا رہا۔ میں یہاں سے چلتے ہوئے بہت کم اشیاء ساتھ لے کر نکلا تھا اور بہت کچھ پیچھے چھوڑ گیا تھا۔ میرا خیال تھا

کہ جو کچھ یہاں چھوڑے جا رہا ہوں سب بیکار اشیاء ہیں۔ میں کبھی ان کی ضرورت محسوس نہیں کروں گا اور گھر بنالوں گا۔ میں اتنا عرصہ اس گھر سے دور رہ کر پھر یہ بھی ٹھیک سے یاد نہ رہا کہ میں یہاں کیا کچھ چھوڑ گیا تھا۔ بس یہ بے چینی ہر وقت ساتھ تھی کہ جو کچھ میں بیکار سمجھ کر چھوڑ آیا ہوں وہی کچھ اہم تھا۔ میں بہت مشکل سے اپنے گھر واپس آیا ہوں۔ اب میں کہیں نہیں جاؤں گا۔ چوکھٹ سے ادھر کچھ نہیں ہے۔ کچھ بھی نہیں ہے۔"

عرش صدیقی کے افسانوں میں گھر کی چوکھٹ عافیت کا نشان ہے، سکون کا مخزن ہے، اور امن کا ضامن ہے۔ چنانچہ انسان جب اس سے جدا ہوتا ہے تو وہ خوف کی زد میں آ جاتا ہے اس کا اپنا وجود اس سے بغاوت کر دیتا ہے۔ اس کا داخل شکستہ ہونے لگتا ہے اور حوادث و آلام اس پر جھپٹ پڑتے ہیں۔ مثال کے طور پر ان کے افسانے "درکتے"، کی پروین اپنی جنت سے نکالی ہوئی حوا ہے وہ گو اپنے پاپا کا گھر چھوڑ کر ایک نئی پناہ گاہ میں بظاہر ایک محفوظ مقام پر آ جاتی ہے، لیکن کیا نیا مقام اس کی نئی جنت بن سکا؟ یہ سوال اس افسانہ کا اساسی المیہ ابھارتا ہے اور پھر واضح ہو جاتا ہے کہ پروین کی ذات کا طلسمات ٹوٹ رہا ہے۔ وہ قطرے کو سمندر اور ذرّے کو صحرا سے الگ رکھنا چاہتی تھی اور کائنات کا اثبات اپنے وجود سے کرانے کی آرزومند تھی لیکن چوکھٹ سے ہٹ کر جب اس نے آنکھ کھولی تو ہزاروں خطرے اس کی چاروں طرف منڈلا رہے تھے۔ اس کا تعاقب کرنیوالوں میں ایک بل ڈاگ اور دو السیشن کتے بھی تھے۔ اور جب ان کتوں سے جان بچانے کے لئے وہ بھاگنے لگی تو اس کی صورت بدل گئی اور پروین نے محسوس کر لیا کہ یہ واقعی وہ خود تھی جو کسی گوشۂ عافیت کی تلاش میں سرگرداں تھی۔

عرش صدیقی نے افسانے کی بنیادی ضرورت کو بلاشبہ کبھی نظرانداز نہیں کیا اور ایک واضح خدوخال کی کہانی اپنے جذباتی دائرے سے بناتی ہوئی آگے بڑھتی اور قاری کو اپنی لپیٹ میں لیتی ہوئی نظر آتی ہے۔ "فرشتہ"، میں یہ کینوس بے حد وسیع ہے۔ "بابر کفن سے پاؤں"، میں یہ وسعت علامتوں میں سما گئی ہے۔ تاہم مجھے کچھ یوں محسوس ہوتا ہے کہ

عرش صدیقی کے افسانوں میں کہانی ان کی بنیادی ضرورت نہیں۔ کہانی کا منطقی تار و پود اور اس کی معنویتوں کو اُجاگر کرنے والے کردار تو وہ وسیلہ ہیں جن کے ذریعہ عرش صدیقی اپنے فکری زاویوں کو قاری تک پہنچانے کی آرزو رکھتے ہیں۔ وہ اپنے افسانوں میں اس الاؤ کو روشن کرنا چاہتے ہیں جو دلِ انسان میں سلگ رہا ہے۔ وہ ان عبارتوں کو تلاش کرتے ہیں جن کا مفہوم گم ہو چکا ہے۔ چنانچہ انہوں نے مختلف علامتوں سے کا سہارا لے کر ان مفاہیم کو ڈھونڈا ہے جن سے نفس شکستہ کو زندہ رہنے کا حوصلہ ملتا ہے۔ انہوں نے باہر کی دنیا کو کھلی آنکھوں سے دیکھا تو کائنات نے اپنے جملہ اسرار و رموز ان پر آشکار کر دیئے لیکن وہ اس حقیقت کو نظر انداز نہ کر سکے کہ ''جن آنکھوں سے تم ہمیں دیکھتے ہو وہ یہ آنکھیں نہیں۔ وہ آنکھیں تو تمہارے اندر ہیں اور ہمیشہ کھلی رہتی ہیں،، (ظلِ الٰہی) چنانچہ عرش صدیقی کے ہاں داخل کی روشنی کو اور اندر کی آنکھ کو نسبتاً زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ بند آنکھوں میں اندر کی روشنی کا ایک اور رُوپ انہوں نے ''دبھیڑیں،، میں یوں پیش کیا ہے۔

''آنکھیں بند ہوئیں تو مجھے روشنی مل گئی یہ بڑی عجیب بات ہے کہ بہت سی چیزیں ہم کھلی آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتے۔ یہ چیزیں آنکھیں بند کرنے پر ہی نظر آتی ہیں۔،،

حقیقت یہ ہے کہ عرش صدیقی نے اپنے افسانوں میں ہمیں اسی وسیع اور بسیط کائنات سے متعارف کرایا ہے جو ہمارے اندر آباد ہے۔ اور جسے دیکھنے کے لیے کیمیائی روشنی کے بجائے دیدۂ بینا کی ضرورت ہوتی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ عرش صدیقی کی شاعری اور ان کے افسانوں میں دھوپ کا چلچلاتا ہوا اُجالا کہیں نظر نہیں آتا۔ وہ وسیع منظر پہ قریب سے نظر ڈالنے کے بجائے اپنی ذات اور منظر کے درمیان فاصلہ قائم رکھتے ہیں۔ زمین کے ساتھ چمٹنے کے بجائے بلندی کی طرف اٹھتے ہیں۔ غور سے دیکھئے تو یہ کسی نئے برِاعظم کو دریافت کرنے کا عمل ہے۔ اسی برِاعظم کی دریافت کے لئے عرش صدیقی کبھی اپنے اندر غوطہ لگاتے ہیں اور کبھی اپنے کرے کے غار میں گم ہو جاتے ہیں۔ ایک اور بات یہ ہے کہ عرش صدیقی کے ہاں وہ تمام جذبے جو بے لگام اور منہ زور ہوتے ہیں مثبت اور تہذیب یافتہ صورت اختیار کر جاتے ہیں مناظر کا فاصلہ ان میں جادوئی کیفیت پیدا کر دیتا ہے اور نرم اُجالا دودھیا چاندنی کی طرح سحر طراز ہو جاتا ہے۔ خیر اور شر کے درمیان ایک واضح تصادم ان کے ہاں بھی موجود ہے۔ اور وہ وجودِ ذات کو نہ صرف اہمیت دیتے ہیں بلکہ اسے قائم رکھنے کے لئے زمانے کے ساتھ متصادم بھی ہوتے ہیں اور ان کے بعض کردار نہ صرف مفاہمت آشنا ہیں بلکہ بعض اوقات حالات کے آگے سپر بھی ڈال دیتے ہیں۔ تاہم میں سمجھتا ہوں کہ یہ سب زندگی کی حقیقی قاشیں ہیں اور انہیں اپنے قدرتی رنگوں میں پیش کرنے کے لئے ہی عرش صدیقی نے افسانہ لکھنے کا فریضہ اختیار کیا ہے۔ وہ یہ فریضہ اپنی شاعری اور تنقید کے ذریعہ بھی بڑی خوبی سے سرانجام دے رہے تھے لیکن اب جب کہ ان کی زندگی کا فلسفہ کرداروں کی زبان میں اور زندگی کے واقعات کی اساس پر سامنے آیا ہے تو اس کی معنویت باندازِ دیگر آشکار ہوئی ہے اور ان کی معنویت کی بہت سی نئی پرتیں سامنے آگئی ہیں۔ میں نے ان پرتوں کے ذریعہ ہی اپنے اندر جھانکا ہے اور ایک نئی کائنات کا مشاہدہ کیا ہے۔

سیپ کراچی ۱۹۸۰ء